دنیا کی بہترین کہانیوں کا انتخاب

سب رنگ ڈائجسٹ

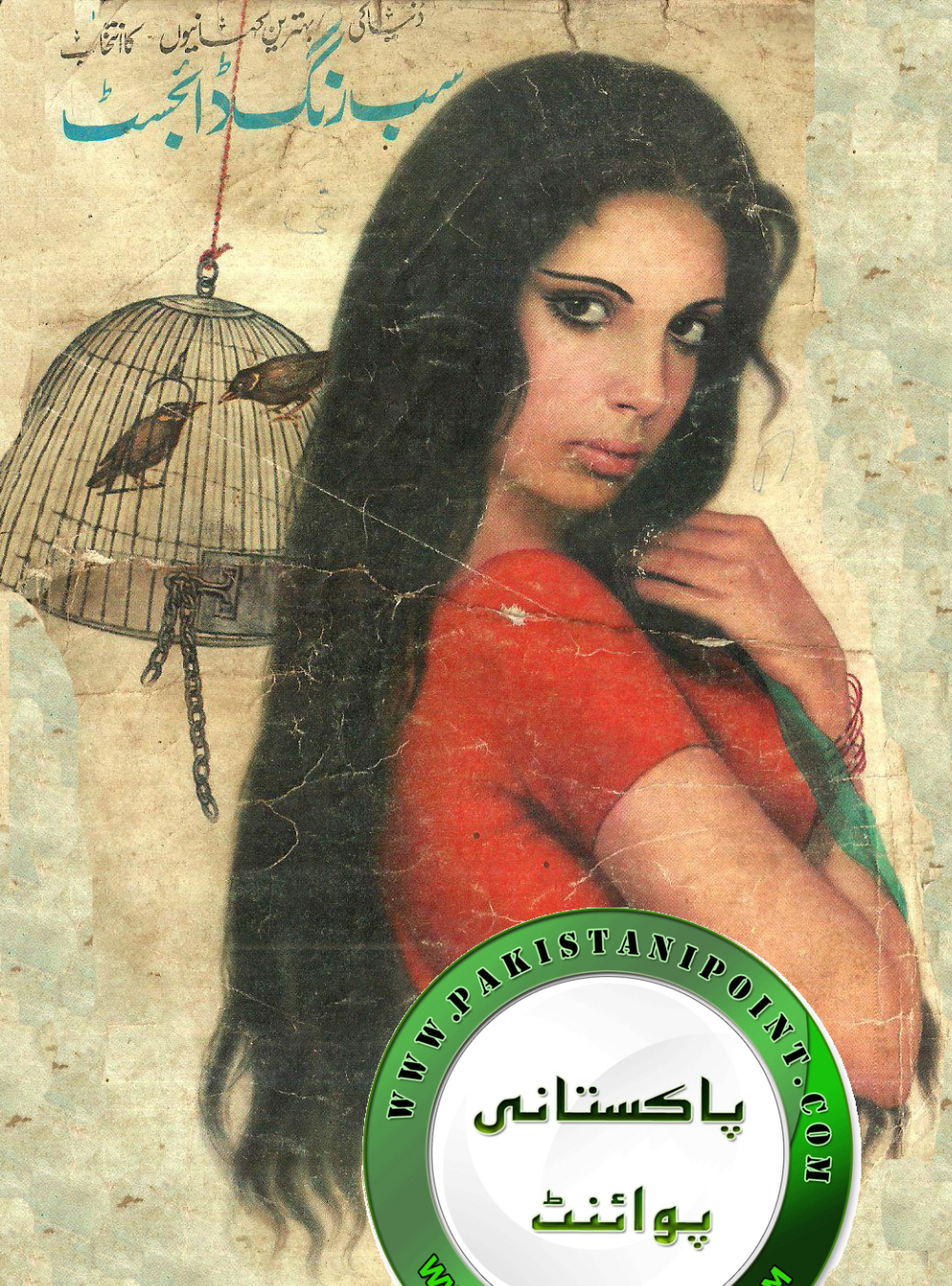

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی
پوائنٹ
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

تیسری دُنیا — ۹ — ادارتیہ
روشنی کے لیے روشن باتیں
سوانح، کرامتیں

ذاتی صفحہ — ۱۱ — شکیل عادل زادہ

کفن بردوش — ۱۲ — الیاس سیتاپوری
دُنیا کے ایک ناقابلِ فراموش شخص کی کہانی
تاریخ کے سچے واقعات، کئی مستند کتابوں کی ایک مختصر کتاب

کوئلے کی کان — ۳۹ — احمد ندیم قاسمی
سب رنگ کی منتخب کہانیاں اردو ادب کا عطر ہیں
ایک عزت مآب شخص کی شادی کا مسئلہ

بے تاج بادشاہ — ۶۷ — ضیا تسنیم بلگرامی
روشنی کے لیے روشن باتیں
سوانح، کرامتیں

کالی انا — ۸۲ — ش، م جمیل
سرکشی، جرأت اور انا کی داستان
امریکہ کی ایک اندھیری گلی میں یہ واقعہ پیش آیا

افتا بلا — ۹۲ — جابر بن یوسف الباقر
تاریک برِاعظم کا افسوں
سب رنگ کا تحیر خیز پُراسرار سلسلہ

قہرِ درویش — ۱۱۵ — وسیلہ خاتون
اس شمارے کیلیے بطورِ خاص تین چٹکلے
زندہ دلوں کے لیے مغرب سے تازہ تر

شمارہ ۳۰ ○ جلد ۵ ○ فی پرچا ۵۰/۲ روپے ○ زرِ سالانہ ۲۷ روپے ○ سرورق طباعت، ایلیٹ پبلشرز لمیٹڈ ○ پبلشر شکیل عادل زادہ نے شرف الدین بگھیو کے اہتمام میں

پُرانی شراب — ۲۲ — مسعود مفتی
اُردو کی ایک اور منفرد تحریر
مٹی کے دو مٹکوں کی کہانی

وقت پیما — ۴۷ — مینو یاسین قبا
مختصر، مختصر
عدالت میں ایک ماہر نفسیات کی دلچسپ گواہی

مقابلہ احتیاط — ۴۹ — حسن ہاشمی
مجرموں کے مابین خوں رنگ معرکے کی سرگزشت
مختصر، شوخ، مجرم کہانی

عشقِ کاذب — ۵۷ — ڈاکٹر مقبول حسین
ایک بے قرار عورت کی کہانی
جس کے پڑھنے سے بہتوں کو قرار آئے گا

کوڑیوں کے مول — ۱۱۹ — نسیم سحر
ایک تنگ دست دولت مند کے بُرے وقت کی کہانی
مغرب کے ایک دوسرے عیار کہانی

ٹیپ کا بند — ۱۲۶ — یوسف جمال
اس بے غیرت شخص کی کہانی جب اسے غیرت آگئی تھی
ناراضِ وقت کے لیے چیخوف کی ایک شوخ تحریر

انکا — ۱۳۱ — جمیل احمد خاں
سب رنگ کا سب سے مقبول سلسلہ
ایسے واقعات جو پہلے کبھی بیان نہیں کیے گئے

دُودھ کی مکھی — ۱۵۷ — ولیم برٹین، بتول فاطمہ
اس ماہ کی خاص کہانی
خوش ذوق قارئین کے لیے

پاکستان ہیرالڈ پریس ضیاالدین روڈ کراچی سے چھپوا کر ۵ سی ۱/۱۳ ناظم آباد سے شائع کیا ○ پتہ ۴۷، ۴۸ پریس چیمبرز آئی آئی چندریگر روڈ کراچی ○ ذیلی دفتر لطیف ہاؤس کرشن پورہ پشاور

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

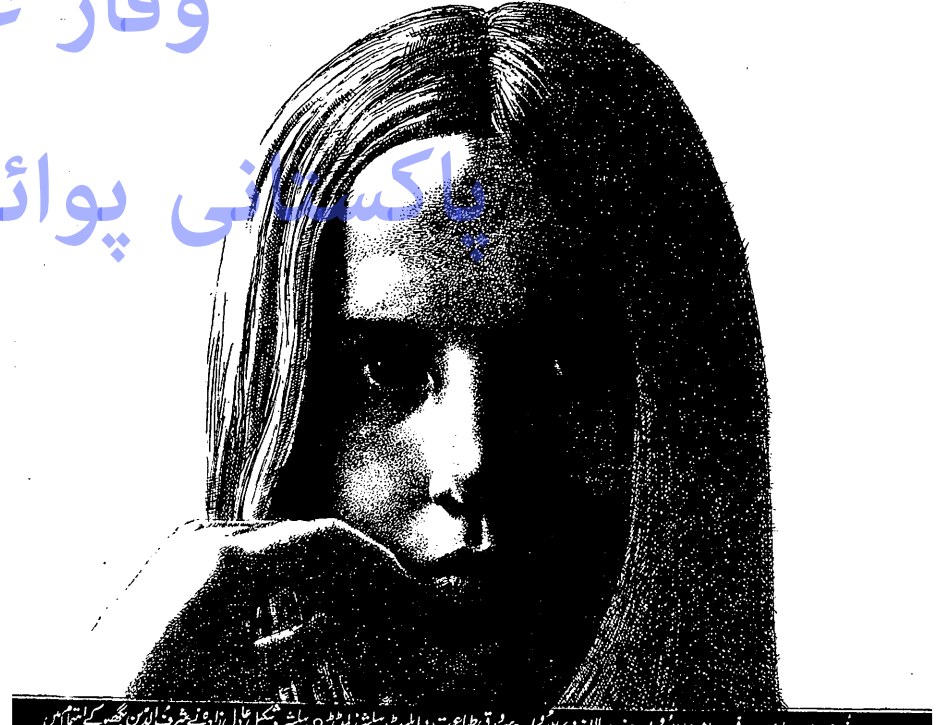

تیسری دُنیا

لاہور کی تاریخ ساز اسلامی سربراہی کانفرنس میں جو مسائل زیرِ بحث آئے، ان کی دل کش تفصیل کسی قدر معلوم ہو چکی ہے، باقی اُمید افزا باتیں بھی رفتہ رفتہ سامنے آ جائیں گی۔ مسائل حل کرنے کے لیے کانفرنسوں کا انعقاد کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ایسی عظیم الشان کانفرنسیں دنیا میں ہر جگہ بڑے جوش و خروش سے منعقد ہوتی رہی ہیں، ایسی محفلوں کی ہنگامہ آرائیاں کانوں میں رس گھولتی ہیں اِن سرگرمیوں سے محسوس ہوتا ہے کہ اس بار تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ لاہور سے پہلے ۱۹۶۹ء میں ایک اسلامی سربراہی کانفرنس رباط میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس کے مابعد اثرات کا دیانت داری سے جائزہ لیا جائے تو کوئی روشن صورتِ حال سامنے نہیں آتی۔ مسائل بدستور ہم پر مسلط رہے۔ اسرائیل نے دوبارہ مصر پر حملہ کیا اور فلسطین پھر بھی محکوم ہی رہا۔ وہی فاقہ کشی، ناداری، دست نگری، جہالت، وظیفہ خواری اور پیچھے رہنے کے عذاب میں ہم مبتلا رہے۔

چنانچہ پھر ایک جگہ مل بیٹھنے کی ضرورت محسوس کی گئی اور لاہور کی مہتم بالشان کانفرنس میں اتحاد کی تجدید کی گئی۔ اس بار پہلے سے زیادہ احساسِ یگانگت اور جذبۂ ملّی کانفرنس میں شامل مختلف وفود کے درمیان دیکھنے میں آیا ہے۔ یہاں تک کہ بنگلہ دیش کے ناراض لوگوں نے بھی اس میں شرکت کی اور کانفرنس چند خوش آیند اور ولولہ انگیز فیصلے کرنے کے بعد ختم ہو گئی۔ کانفرنس کے نظارے بلاشبہ بڑے رُوح پرور اور ایمان افروز تھے۔ حکومتِ پاکستان نے نہایت خوش اسلوبی سے پریشان حال لوگوں کو اکٹھا کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا اور میزبانی کی مثال قائم کر دی۔

مگر یہ اندیشہ اپنی جگہ بجا ہے کہ کہیں لوگ پھر اپنے اپنے قومی معاملوں میں اُلجھ کے منتشر نہ ہو جائیں، یہ چنگاری بُجھ نہ جائے جسے آگ بن جانا چاہیے۔ پاکستان کو یہ ذمّے داری بھی اپنے آپ پر عائد کرنی چاہیے کہ اس نے اتحاد و یگانگت کی جو مشعل اپنے ہاتھ میں سنبھالی ہے، اسے مخالف ہواؤں کی یلغار سے بچائے رکھے۔ اصل کام کانفرنس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ مراکش سے انڈونیشیا تک تیسری دنیا کے یہ لوگ صدیوں سے بڑی کس مپرسی اور لاچاری کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اِن کے پاس سب کچھ ہے مگر انھوں نے کبھی اپنے وسائل منضبط کرنے کی زحمت نہیں کی اور اگر ایسی کوئی کوشش کی بھی گئی تو مفاد پرست طاقتوں نے ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیا۔ وہ مغرب کے دو طاقت ور بلاکوں میں منقسم ہوتے رہے اور اِن کا آلۂ کار بنتے رہے۔ انھیں کئی موقعے ملے مگر انھوں نے بڑی سادہ لوحی اور بے نیازی سے گنوا دیے۔ وہ ایک دوسرے پر جھپٹتے رہے اور ان کی اس غفلت سے ترقی یافتہ ملکوں کی دکان چمکتی رہی۔

صرف تیل کے مسئلے پر عربوں کے اتحاد نے مغربی دنیا کو لرزہ بر اندام کر دیا ہے یہ اتحاد قائم رہے اور اسلامی ملکوں کے درمیان مختلف شعبوں میں پھیل جائے تو صدیوں کی تاریکی چند عشرہ ہائے سال میں دُور کی جا سکتی ہے، ایک دوسرے کے کام آنے اور ایثار کرنے کا یہ جذبہ قائم رہے تو تیسری دنیا میں انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ جن کے پاس سنہری زمینیں اور محنت کش افراد موجود ہیں، وہی اپنی بنیادی ضروریات کے لیے دوسروں کے دست نگر رہیں۔ وہ خودداری، حمیت اور غیرت کی روایتیں فراموش کر دیں، اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہو گی؟

لاہور کی اسلامی سربراہی کانفرنس، اسلام کی نشاتِ ثانیہ کی علامت ہے، اب عمل کا وقت آیا ہے تمام اختلافات دُور کر دیے جائیں، کہیں پھر تھکے ہوئے اعصاب کے لوگوں کو نیند نہ آ جائے، ورنہ مل بیٹھنے کا اعتبار ہی اٹھ جائے گا ـــ اور تیسری دنیا، دوسری دنیاؤں سے ہمیشہ پیچھے رہے گی۔

جوڑوں کے دَرد اور سُوجن میں
فوری آرام کے لئے
SK&F ایس۔کے اینڈ ایف کا تیّار کردہ
آیوڈین
میتھائل سَیلیسلیٹ آئنٹمنٹ (نَون اِسٹَیننگ)
پُشت در پُشت سے آپ کے خاندان میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ اس کا صرف نام تبدیل ہوا ہے لیکن یہ اپنی خاصیت اور بشیار فوائد میں ہمیشہ کی طرح مؤثر اور اعلیٰ ہے۔
آپ کے گھر کی ایک اہم ضرورت
ہمیشہ شیشی پر SK&F کی مہر دیکھ کر خریدیئے۔

کٹی، پھٹی جِلد، معمولی چرکے، خراش اور چوٹ کے لئے ایس۔کے اینڈ ایف کا تیار کردہ آیوڈین آئنٹمنٹ (نَون اِسٹَیننگ) اِستعمال کریں۔
خالص، معیاری اور قابلِ اعتماد اَدویہ کا نشان
SK&F اِسمتھ کلائن اینڈ فرنچ آف پاکستان لمیٹڈ۔کراچی
Paragon ● X/JA/ 5-73

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

ذات

لوگ بجا طور پر یہ سوچتے ہوں گے کہ یہ رسالے والے بھی کیا لوگ ہیں۔ خوب باتیں بناتے ہیں۔ کوئی اپنے دن کی کڑی دھوپ کی اذیت رقم کر رہا ہے، کوئی اپنی راتوں کی کروٹوں اور سیاہیوں کی سرگزشت سنانے کی فکر میں سرگرداں ہے، کوئی عشق کا دعوے دار ہے۔ کوئی اپنی تیرہ بختیوں پر نوحہ خواں ہے۔ کوئی اپنوں کے ستم، اغیار کی دیدہ دہنیوں کی جزئیات رقم کر رہا ہے۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ کہہ رہا ہے، اور کچھ نہیں تو فلسفہ بک رہا ہے، شعر منتقل کر رہا ہے۔ کبھی مذاق کرتا ہے، کبھی اپنے اوپر رونے اور ہنسنے کے لیے کوشاں ہے اور جسے اپنی آواز کے ابلاغ کا یقین نہیں ہے، وہ اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اِدھر اُدھر کے حوالوں کے ساتھ اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے لگا ہے۔ کوئی معشوق بنا بیٹھا ہے، کوئی محبوب بنا بیٹھا ہے، کسی کی آنکھ میں آنسو ہیں تو کسی کے سینے سے دھواں اُٹھ رہا ہے —— یہ کیسے لوگ ہیں؟

اب ہر رسالے میں ایک صفحہ ایسا ضرور ہوتا ہے جس کے اسٹیج پر ہر شخص کو تماشا دکھانے کی آزادی ہے۔ رسم یہ پڑی ہے کہ رسالے کا سربراہ صیغۂ واحد متکلم میں براہِ راست اپنے قاری سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل کرتا ہے اور رازدارانہ انداز میں —— اُس کے کان میں ناگفتنی کہنے کی کوشش کرتا ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ اس کی ابتدا میں نے کی تھی جیسے بزعمِ خود اور بہت سی چیزوں کا سزاوار میں ہوں، میں نے اپنے غم رونے اور اپنے زخم دکھانے کی طرح ڈالی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں نے یہ کیوں کیا تھا، شاید یوں کہ میں بڑی مشکل بہت ہی مصائب کے بعد آپ تک پہنچا تھا، میرا سانس پھول رہا تھا اور دل دھڑک رہا تھا۔

اس وقت مجھے یاد ہے میری کیا حالت تھی، میری آنکھیں جل رہی تھیں اور شوقِ دیوانگی میں قدم رکھتا کہیں تھا، پڑ کہیں رہے تھے، کہنا کچھ چاہتا تھا، کہہ کچھ اور جاتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ بعد کو اتنی جگ ہنسائی ہوگی۔ اتنا مذاق اُڑایا جائے گا۔ ان کیفیتوں کی آبروئیں داغ دار کی جائے گی، لوگ اپنا چہرہ پڑھوانے اور تشاعت کرانے کے لیے آپس میں معرکہ آرا ہو جائیں گے، ان لطیف لوگوں سے بلاغت بھی دُور ہو جائے گی کہ انھیں کون سی باتیں کب کہاں اور کیسے کہنی چاہئیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ذات کے اظہار کا ایسا سلسلہ چلے گا کہ لوگ اپنے نسب نامے، اپنے شب و روز کا تختۂ وصل باقی، اپنے دوستوں رقیبوں کی فہرست اور اپنے خاندان کے عشقی کارناموں کی روداد کے ساتھ حاضر ہو جائیں گے اور اتنی بے تکلف باتیں کرنے لگیں گے —— لوگ کپڑے بھی اُتار دیں گے، مجھے اس کی خبر نہیں تھی —— میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔

کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں یہ صفحہ لکھنا بند کر دوں، گونگے بھی اظہارِ محبت کرتے ہیں، اور میں جو کچھ پیش کرتا ہوں، وہ صرف اس تحریر کی سفارش سے تو آپ نہیں پڑھتے —— میں اپنے عشق کے ثبوت کے ساتھ حاضر ہوتا ہوں، اگر ایسا نہ ہوتا تو میری سفارش کا سحر کب تک چلتا؟ اتنی وضع داری کرۂ زمیں کی سرشت میں نہیں اور نہ میں اتنا بے حیا ہوں کہ بار بار آپ کو تنگ کرتا، میرے اظہار میں کوئی ندامت، کوئی خوشامد نہیں ہے، سب رنگ ہے آپ کی محبت کا سبب میرے ذاتی صفحے کی مظلومیت یا سفارش تو نہیں ہے —— ہاں ہاں بتائیے کہ آپ کے ہاں ہمدردی کا کوئی جذبہ نہیں ہے یا میں کوئی مظلوم شخص نہیں ہوں کہ مجھ سے دوشیزاؤں نے بے وفائی کی اور دوستوں سے جس نے جھٹکے کھائے —— کون شخص ایسا ہوگا جس کے ساتھ زمانہ سیدھا چلا ہوگا، یہ سب کچھ آپ کی طرح مجھ پر بھی گزرا ہے، جہاں ہمدردی کے جذبات اُبھر آئیں وہاں عشق کا تنزل شروع ہو جاتا ہے، مجھے یہ کیفیت منظور نہیں —— زندہ رکھنا ہے تو ہمدردی مت کیجیے —— عشق کیجیے۔ کوئی لذت حاصل کیجیے، کوئی لذت فراہم کیجیے۔

ذاتی صفحے کی غرض و غایت کے بارے میں بارہا کہہ چکا ہوں اب وضاحت کی ضرورت یوں پیش نہیں آتی کہ میں اور آپ جہاں کھڑے ہیں، وہ سب کی نظروں کے سامنے ہے اور میرے آپ کے ربط کا یہی ایک ذریعہ نہیں ہے جو یاروں نے سمجھ لیا ہے۔ ذاتی صفحہ میری تمہید میرا تعارف، میری محنت کے احوال کا ابتدائیہ ہے —— مگر سب یہ نہیں ہے۔ عاشق وہ سب نہیں ہوتا جو نظر آتا ہے اور اس کا کام محض جنوں کے اظہار پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ دوستی صرف ایک خوش دلانہ تعارف یا چند ملاقاتوں کا سرور نہیں، عشق کی پائداری اور پختگی کے لیے بے ترتیب بال، پھٹا ہوا گریبان، شراب کے جام اور چائے کا زہر ہی کافی نہیں ہوتا۔ ذاتی صفحہ تو ایک مصافحہ ہے، آپ کو میرا سلام ہے، آداب ہے —— میرا ذاتی ترانہ ہے میرے سُر یہیں تمام نہیں ہو جاتے، آگے میری ریاضت کا اصل مظاہرہ ہے، آگے میرے صدق کا دروازہ کھلتا ہے میرے دعوے کی آزمائش ہوتی ہے یہ میرے جنوں کی شہادتیں ہیں —— یہ پٹارا جب میں آپ کے سامنے کھولتا ہوں تو اس میں چند کام کی چیزیں ضرور نکلتی ہیں جو آسانی سے حاصل نہیں ہوتیں —— وہ آپ کو کہیں اور ملتی ہیں؟ —— ملتی ہیں تو وہ مجھ سے بڑا سچا اور مجھ سے بڑا عاشق ہے۔ مجھے اُس شخص کا نام پتہ بتائیے۔ میں اس کے ہاتھ چوموں گا، میں اس کے پیروں میں بیٹھ کر کچھ حاصل کروں گا۔

ان سطروں سے انا کی خوشبو آتی ہے تو یہ کوئی بُری بات نہیں، اس سے بڑھی ہوئی بات ہے تو میں معذرت خواہ ہوں، عشق کی انا ہی اس کا سب کچھ ہوتا ہے، یہ کچھ اور نہیں میرا سرخم ہے۔ حوصلے نکالنے کے لیے یہ جگہ تنگ اور ماحول حبس زدہ ہے، کرب یہ ہے کہ جو سوچتے ہیں، اس کی تکمیل نہیں ہو پاتی —— میں بیسویں صدی میں رہتا ہوں لیکن کتنے اعتبار سے میں دسویں صدی میں ہوں، اس سماج اور عہد، میری نظر اور میری بساط کی حدود میں جو چیزیں موجود ہیں، ان امانتوں کی دیانت سب رنگ ہے، اور کچھ مجھ سے نہ کہلوائیے ——

ہاں! ذرا یہ بتائیے کہ ۱۹۷۰ء میں آپ گوشت، پیاز، گھی، مرچ، سونا، کپڑا اور دیگر چیزیں کس شرح پر خریدتے تھے اور اب وہ آپ کو کن نرخوں پر حاصل ہوتی ہیں؟ —— ہماری پوچھیے تو ہم بتائیں کہ ہم کاغذ فی ریم ۲۴ روپے کھلے بازار سے خریدتے تھے، اب اس کی قیمت ۷۵ روپے فی ریم کھلے بازار میں ہے، جو کوٹا ملتا ہے، اس میں گزشتہ ماہ حکومت نے ۷۰۰ سو روپے فی ٹن کا اضافہ کیا ہے، یہی کاغذ قومی اخبارات کو حکومت ۲۵۰۰ سو روپے ٹن دیتی ہے اور قومی رسائل کو ۳۰۰۰ روپے ٹن —— کاغذ کی قسم وہی ہے، ماہانہ رسائل کو مجموعی طور پر کوئی پچیس تیس ٹن کاغذ کا کوٹا حکومت عنایت کرتی ہے، اس اعتبار سے حکومت کی آمدنی میں کوئی ۱۴-۱۵ ہزار روپے ماہانہ کا اضافہ ہو گیا ہے —— ویسے بھی رسائل ایک فضول سی چیز ہیں —— ہم یہ مزید خرچ پورا کرنے کے لیے قیمت بڑھائیں گے، آپ پڑھنا بند کر دیجیے —— اس طرح کاغذ کی خاصی بچت ہو جائے گی —— کتابوں اور رسالوں میں کیا دھرا ہے، خبریں پڑھیے اور سارے عالم کی سیر کیجیے —— یہ قصے کہانیوں کا دور نہیں ہے، بچے ٹی وی پر فلم دیکھ کر اور ریڈیو پر گانے سن کر سو جاتے ہیں۔

لیرک کراچی (ایرکنڈیشنڈ) میں شاندار نمائش جاری ہے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

سفینۂ آرزو

الیاس سیتاپوری

فنیقی بنیادی طور پر صنّاع اور تاجر تھے۔ یہ شیشے اور دھات کے سامان، مٹی کے ظروف، اسلحہ، اونی اور سوتی کپڑے اور زیورات وغیرہ کی تیاری میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ ان کے شہروں میں کپڑے کے کارخانوں کی بہتات تھی۔ اپنے مال کی منڈیوں کی تلاش میں یہ دُور دراز علاقوں کی سیاحت کرتے رہتے تھے۔ بحیرۂ روم کے جزائر اور ساحلی علاقوں کے علاوہ یہ ہندوستان اور جنوبی بحرِ اوقیانوس کے افریقی ساحلوں تک تجارتی دھاوے مارا کرتے تھے۔ کامیاب صنعت کاری، تجارت اور جہازرانی کی وجہ سے یہ لوگ اپنے عہد کی دولت مند ترین قوم شمار کیے جانے لگے۔ دولت کی ہوس نے انھیں بہت زیادہ چالاک اور عیّار بنا دیا تھا۔ اس راہ میں مطلب براری کی خاطر یہ جھوٹ اور مکر و فریب سے بھی باز نہ آتے تھے۔ دولت کمانے میں ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس سلسلے میں نت نئی ترکیبیں سوچنے اور اس پر عمل درآمد میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہ محسوس کرتے۔ بحرِ روم کے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

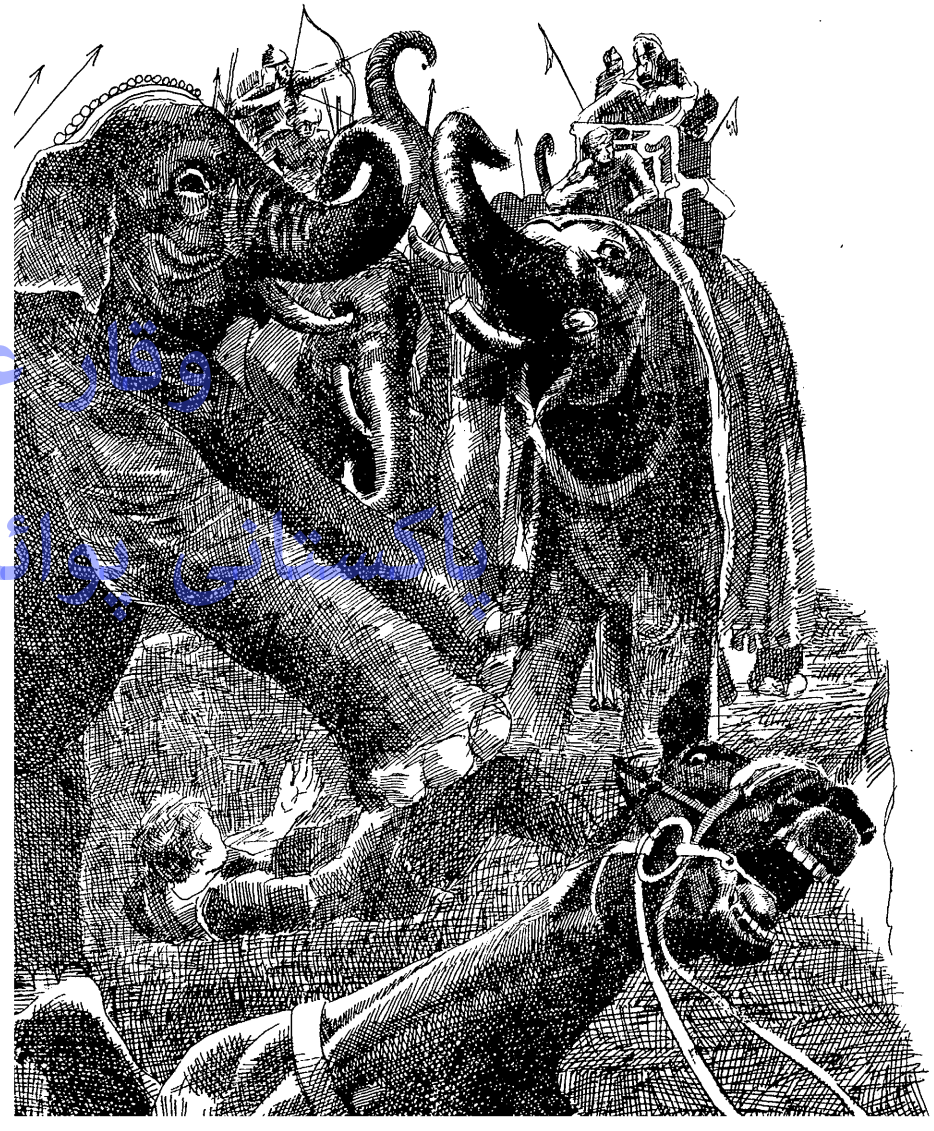

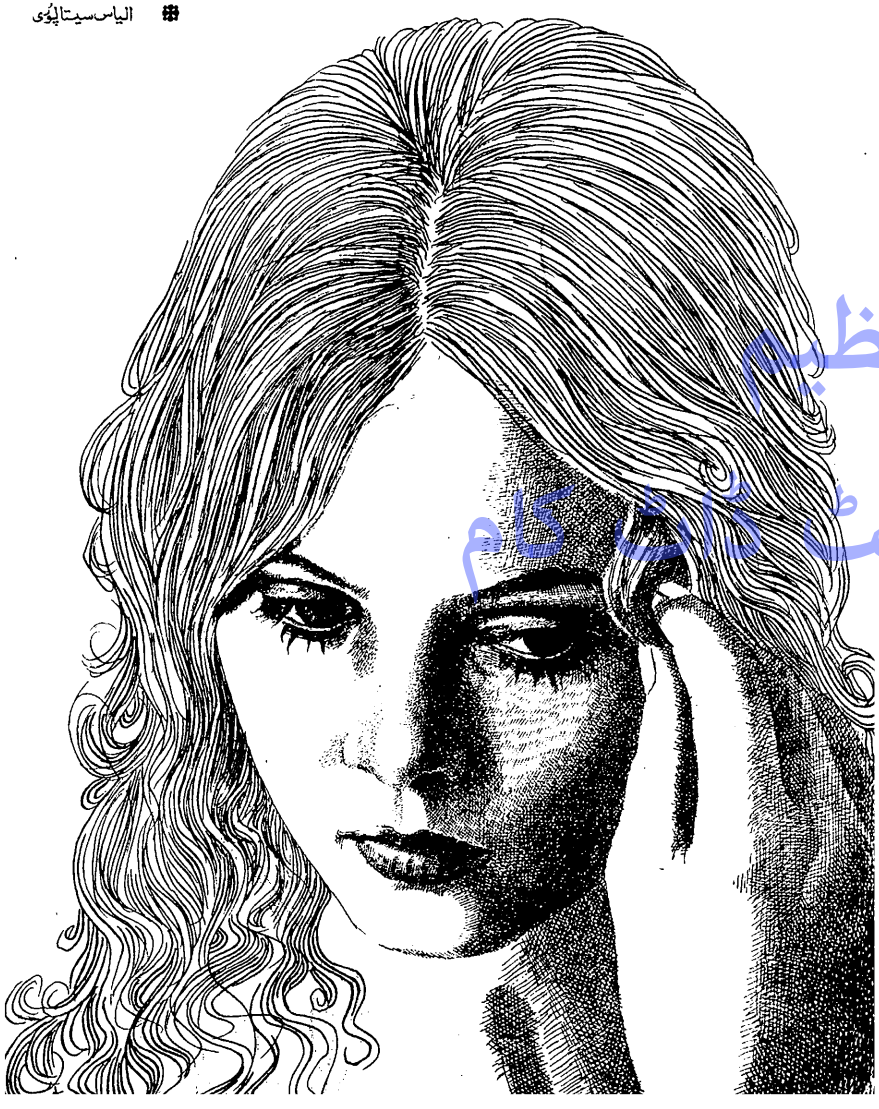

بشیتر جزائر انھی کے تسلط میں تھے اور جن جزائر پر انھیں جزوی تسلط حاصل تھا اس پر پوری طرح قابض ہو جانے کی تدبیریں سوچا کرتے تھے۔ یہ چالاک اور ذہین قوم اس راز سے بھی واقف تھی کہ کامیاب تجارت اور جہاز رانی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پسِ پشت ایک طاقت ور فوجی نظام بھی موجود ہو جو تجارت اور جہاز رانی کی پشت پناہی کرتا رہے۔ انھوں نے اس ضرورت کو بھی پورا کر دیا اور ایک زبردست عسکری قوت وجود میں لے آئے۔

اُن دنوں فنیقیوں کا جزیرۂ سسلی پر جزوی قبضہ تھا۔ سسلی کے مغربی کنارے کرہِ ارکس میں یہ لوگ ایک مدت سے آباد اور حکمراں تھے۔ کرہِ ارکس ان کا وطن نہیں تھا۔ یہ فنیقیوں کی نو آبادی تھی۔ ان کا اصل وطن تو قرطاجنہ تھا۔ جزیرۂ سسلی کے جنوب میں بحرِ روم کے اُس پار افریقیہ کے ساحل پر قرطاجنہ آباد تھا اور یہی قرطاجنہ ان کا مستقر اور مرکز تھا۔ یہیں ان کی منڈیاں قائم تھیں اور یہیں سے بحرِ روم کے جزائر ہندوستان اور بحرِ اوقیانوس کے ساحلی مقامات پر تجارتی سامان برائے فروخت بھیجا جاتا تھا۔ ساری دنیا کی دولت ڈھل ڈھل کر قرطاجنہ پہنچ رہی تھی جس سے فنیقیوں کی خوشحالی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ یہ ۲۴۰ قبل مسیح کا واقعہ ہے۔

سسلی کے کرہِ ارکس میں قرطاجنہ کی حکومت کی طرف سے ہمل کر برقہ حکمراں تھا۔ قرب جوار کے علاقوں کے لیے جو سامانِ تجارت قرطاجنہ سے کرہِ ارکس کی نو آبادی میں بھیجا جاتا اُس کے لوٹ لیے جانے کا ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا کیونکہ سسلی کے مشرقی حصے سیرا کیوزا اور مغربی کنارے پنارمس کی حکومتیں رومن ایمپائر کی مدد سے اپنی بحری قوت میں اضافے کر رہی تھیں۔ قرطاجنہ کے تجارتی جہاز سیرا کیوزا اور پنارمس کے بیڑوں سے بچتے بچاتے کرہِ ارکس کی ہلالی خلیج میں داخل ہو کر سکون کا سانس لیتے۔ کرہِ ارکس کے حکمراں ہمل کر برقہ نے اس مستقل دردِ سر کا یہ علاج دریافت کیا کہ کسی طرح پورے سسلی پر ہی قبضہ کیوں نہ کر لیا جائے۔ قرطاجنہ کی بالادست قوت نے ہمل کر برقہ کو فوجی کارروائی کا اختیار بھی دے دیا لیکن ان کی بدقسمتی سے سسلی کی مشرقی سیرا کیوزی حکومت نے ہمل کر برقہ کی طرف سے منڈلانے والے خطرات کو قبل از وقت ہی محسوس کر لیا اور طاقت ور جمہوریہ روما سے فوجی امداد کے طالب ہوئے۔ جمہوریہ روما نے ان کی درخواست منظور کر لی اور جب فنیقیوں نے جنگ کا بگل بجایا تو سیرا کیوزا کی حمایت میں جمہوریہ روما کی فوجی مداخلت نے نہایت فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ فنیقیوں نے میدان اپنے ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر صلح کی درخواست کی، رومیوں نے شکست خوردہ فنیقیوں کے سامنے نہایت شرمناک اور جابرانہ شرائطِ صلح رکھ دیں۔ قرطاجنہ کی حکومت نے رومیوں کے پاس معاہدۂ صلح کے لیے جن لوگوں کو بھیجا تھا اُن میں کرہِ ارکس کا ہمل کر برقہ بھی شامل تھا۔ فنیقی وفد کو اس صلح نامے کے ذریعے یہ حکم دیا گیا کہ وہ جلد از جلد کرہِ ارکس کی نو آبادی چھوڑ کر اپنے وطن واپس چلے جائیں اور ہمل کر برقہ نے اپنی کمزوری کے پیشِ نظر رومیوں کا یہ حکم مان لیا۔

کرہِ ارکس کی ہلالی خلیج میں فنیقیوں کے خالی جہاز پہنچنے لگے اور اپنے ہم قوموں کو لے کر قرطاجنہ واپس جانے لگے۔ بحرِ روم میں منڈلاتے ہوئے سیرا کیوزی، پنارمسی اور جمہوریۂ روما کے طاقت ور بحری بیڑے کرہِ ارکس کے مہاجرین کی رخصتی کا نظارہ ہنس ہنس کر اور کبھی کبھی ذلت آمیز قہقہے لگا کر کرتے رہے۔ انھیں اس بات کی خوشی تھی کہ سسلی ان عیّار اور چالاک تاجروں کے وجود سے پاک ہو رہا ہے۔

اس کھسیانی ہوئی شکست خوردہ قوم کا ایک جہاز پنارمس کی ایک قدرے غیر آباد بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ اس چھدری آبادی کے لوگ ساحل پر اس لیے جمع ہو گئے کہ ان بھگوڑے دولت مندوں کا ایک نظر وہ بھی دیدار کر لیں۔ فنیقی تاجر ہنس ہنس کے اور ہاتھ ہلا ہلا کے ان سے باتیں کرنے لگے۔ مقامی آبادی کے لوگ ان کے حوصلے اور قوتِ برداشت سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کے کچھ لوگ فنیقیوں کے جہاز پر پہنچ گئے اور جہاز میں مختلف قسم کے سامانوں کا ذخیرہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ خوش نما، دل کش اور آرائش و زیبائش کو چار چاند لگا دینے والے سامان کی زیارت نے ان مقامی زائرین کے دلوں میں جذبۂ طمع بیدار کر دیا۔ فنیقیوں نے غیر معمولی کشادہ دلی اور سخاوت کا مظاہرہ کیا۔ اس سے شیشے کا مرتبان مانگا تو بے چون و چرا وہ مرتبان کوئی قیمت لیے بغیر اس شخص کے حوالے کر دیا گیا۔ کسی نے اونی چادر پسند کی تو یہ بھی بلا قیمت اسے دے دی گئی، کچھ لوگ مٹی کی دل کش اور منقش صراحیاں لے گئے۔

اس داد و دہش کا بڑا شہرہ ہوا اور آبادی کا بیشتر حصّہ عورتوں اور بچوں سمیت ڈھل کر جہاز پر پہنچ گیا۔ یہ سب حرص و طمع کے مارے لوگ یہ اُمید لیے جہاز میں داخل ہوئے تھے کہ اپنی قسمت وہ اپنے اپنے حصّے کی چیزیں کوئی قیمت ادا کیے بغیر لے کر ہنسی خوشی واپس آ جائیں گے لیکن وہاں ان کی بدقسمتی کوئی اور ہی تماشا دکھانے پر تُلی ہوئی تھی۔

چالاک اور عیار فنیقیوں نے جب یہ دیکھا کہ آبادی کا بہت بڑا حصّہ ان کے جہاز میں داخل ہو چکا ہے تو انھوں نے جہاز کا لنگر اُٹھا دیا۔ مقامی لوگ تھوڑی دیر تک تو کچھ سمجھ ہی نہ سکے لیکن چند ساعتوں کے بعد

اس کہانی کے تاریخی پس منظر کے لیے مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:
تاریخ تہذیب ۰ تاریخِ یونان ۰ تاریخِ لبنان ۰ تاریخِ شام ۰ ہیمنی بال ۰ جہاں گرد کی واپسی ۰ قدیم تہذیبیں ۰ تاریخِ سلطنتِ روما
ترجمہ غلام رسول مہر ۰ پروفیسر شیروانی ۰ فلپ کے حتی ۰ فلپ کے حتی ۰ ہیرالڈ لیمب ۰ ہومر ۰ سید عین الحق ۰ جے بی بیوری

ان کے کان کھڑے ہوئے۔ ساحل پر کھڑے ہوئے عزیزوں اور دوستوں نے تنگر اُٹھاتے اور ساحل سے دُور ہٹتے ہوئے فنیقی جہاز کو دیکھ کر چلّانا شروع کیا۔ اِس شور غل سے فنیقی ڈرے کہ کہیں کسی حریف کا جہاز ان کا پیچھا نہ کرے۔ انھوں نے چند مقامی آدمیوں کو جہاز کے عرشے پر کھڑا کر کے ملائمت اور اخلاق سے درخواست کی کہ وہ اپنے عزیزوں اور ساتھیوں کو چلّا کر مطلع کر دیں کہ ہم ان کے ہم وطن اور ہم قوم افراد کو سمندر کی ہوا کھلا کے اور تحفے تحائف دے کر بہت جلد ساحل پر اُتار دیں گے۔ بھولے بھالے سادہ لوح لوگوں نے فنیقیوں کے حکم یا خواہش کی حرف بہ حرف تعمیل کر دی۔

کئی گھنٹے بعد ان پر یہ تلخ حقیقت منکشف ہوئی کہ فنیقیوں کا جہاز کہیں رُکے بغیر تیزی سے قرطاجنہ کی طرف بڑھا چلا جا رہا ہے۔ انھوں نے بدحواس ہو کر شور غل اور واویلا مچایا تو جہاز کے ملّاح نے انھیں ڈانٹ دیا اور دھمکی دی کہ اگر انھوں نے اپنی زبان بند نہ رکھی اور بدستور شور غل کرتے رہے تو وہ مجبوراً انھیں بحرِ روم کے حوالے کر دے گا۔ فنیقیوں کی خوش اخلاقی ان کے دلوں اور چہروں سے رخصت ہو چکی تھی اور ان کے چہروں سے ایک عجیب سی بے رُخی اور سنگ دلی عیاں تھی۔

نوگرفتاروں نے ایک جگہ جمع ہو کر اس نئی اور ناگہانی اُفتاد پر صلاح مشورے شروع کر دیے۔ انھوں نے ایک سب سے زیادہ عمر رسیدہ شخص کو اپنا نمائندہ بنا کے جہاز کے ملّاح کے پاس بھیجا۔ سبی ورحوطے جلیبی ناک والا یہ ستر بہتّر سالہ بوڑھا اپنے کاندھے پر کالی چادر ڈالے سر جھکائے ملّاح کے روبرو پہنچا، جہاز کے جملہ فنیقی کسی ناگہانی خطرے کے پیشِ نظر ننگی تلواریں ویسے ہی لیے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے، ملّاح نے لوہے کی لاٹھی پکڑ رکھی تھی۔ اپنے سامنے ستر بہتّر سالہ بوڑھے کو دیکھ کر ملّاح نے ناگواری سے سوال کیا "کیا بات ہے؟ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

بوڑھے نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا "میرے ہم قوم پوچھ رہے ہیں کہ انھیں کہاں لے جایا جا رہا ہے؟"

"قرطاجنہ!" ملّاح نے بے نیازی سے جواب دیا "اپنے آبا و اجداد کی سرزمین پر، جہاں تانت دیوی کا مندر ہے اور جہاں مقدس بیرسا کی چوٹی پر ملِ کرت دیوتا ہم سب کا انتظار کر رہا ہے!"

بوڑھے نے ذرا سکوت اختیار کیا، وہ کسی ذہنی اُلجھن میں مبتلا دکھائی دے رہا تھا، ہچکچاہٹ سے سوال کیا "ہمیں ہمارے وطن کب واپس پہنچایا جائے گا؟"

ملّاح ہنسنے لگا۔ بولا "کیا تھیں ابھی تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ آبادی اور شہر کا دیوتا ملِ کرت تم سے سخت ناراض ہے۔ تم لوگوں نے جمہوریۂ روما سے مِل کر ہمیں گھر سے بے گھر کیا، ہمارا کاروبار تباہ کر دیا، ہمیں کرہِ ارکس سے بے دخل کر دیا، ہم نے اپنے قیمتی مکان اور سامان وہیں چھوڑ دیے اور ہمیں ایک ذلیل معاہدۂ صلح کے طفیل جتنے نقصانات اُٹھانے پڑے ہیں، کیا ان کی تلافی ہو سکتی ہے، کیا وہ نقصانات پورے کیے جا سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! ہمیں بدرجہ مجبوری یہ ناگوار قدم اُٹھانا پڑا ہے، اس سے ہمارے نقصانات کی کسی حد تک تلافی ہو جائے گی!"

بوڑھا وحشت سے تیز تیز سانسیں لینے لگا اور اس کے ناک کی لَو سرخ ہو گئی تقریباً روہانسی آواز میں بولا "میرا وطن، میرا گھر، میرا خاندان، کیا اب میں اِن میں سے کسی ایک سے بھی نہ مِل سکوں گا؟"

ملّاح نے جواب دیا "شاید نہیں کیونکہ ہمیں خود بھی یہ نہیں معلوم کہ تمھارے آقا، تمھارے مالکان دُنیا کے کس خطے میں پائے جاتے ہیں اور تمھیں اپنی بقیہ زندگیاں کہاں اور کس کی غلامی میں گزارنا ہیں!"

بوڑھے پر لرزہ سا طاری ہونے لگا، خوف، مایوسی اور مذلّت کا لرزہ لڑکھڑاتی آواز میں بولا "دیوتاؤں نے ہمارے آیندہ دنوں کے لیے جو ذلتیں اور رسوائیاں مقرر کر دی ہیں اُن سے کوئی کس طرح اور کہاں بھاگ سکتا ہے؟ پھر بھی کیا یہ شرافت کا تقاضا نہیں ہے کہ تم ہمیں اُن فیصلوں سے مطلع کر دو جن کا تم نے ہمیں مستحق قرار دیا ہے!"

ملّاح نے لاپروائی سے جواب دیا "قرطاجنہ کی مجلسِ اقتدار ہی کوئی فیصلہ کر سکتی ہے لیکن اتنی سی بات تو ہم بھی جانتے ہیں کہ تم سب کو ایک نہ ایک دن غلاموں کی طرح کسی نہ کسی بازار میں بِک جانا پڑے گا کیونکہ ہم اِسی طرح اپنے نقصانات کی کمی کسی حد تک پوری کر سکتے ہیں!"

بوڑھے کی آنکھوں کے سامنے تتلیاں سی اُڑنے لگیں، انتہائے یاس اور احساسِ ذلت سے دل ڈوبنے لگا اور جہاز، اہالیانِ جہاز، وہ جہاز کا ساز و سامان گھومتا ہو محسوس ہونے لگا۔ وہ پوری قوت سے چیخا "ہائے میرا وطن، ہائے میرا کنبہ۔ ہائے میرے آبا و اجداد کے قبرستان، کیا میں پردیس ہی میں مروں گا؟ اُف اُف آہ!"

اس دلدوز آواز میں بھی ملّاح کے لیے تفریح اور لذّت کا عنصر موجود تھا، وہ ہنسنے لگا۔ وہ اس مخبوط الحواس اور یاس زدہ بوڑھے سے شاید کچھ کہتا بھی لیکن بوڑھا بے ہوش ہو کر گر گیا اور ملّاح حیرت سے اس بزدل اور کم ہمت بوڑھے پر افسوس کرنے لگا۔

★

قرطاجنہ کے بازار میں جبری غلاموں کو بیچ کر جہازیوں نے جو کچھ کمایا اُس کے حصّے بخرے میں بڑی اُلجھنیں پیش آئیں کیونکہ یہ لوگ اپنے حصّے میں ایک دوسرے سے زیادہ کے خواہش مند تھے۔ اگر قرطاجنہ کے چند بڑے

Pakistanipoint Waqar Azeem
وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

لوگ بروقت مداخلت نہ کرتے تو شاید خون خرابا ہو جاتا۔ انھوں نے آپس میں لڑتے جھگڑنے والوں کو یہ کہہ کر ڈانٹا کہ "تمھاری یہی نااتفاقیاں تھیں جنھوں نے ہمیں کوہِ اَرکس چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔"

جہاز کے ملاح نے کہا "میں اپنے حصّے کی رقم میں زیادہ کا مطالبہ اس لیے کر رہا ہوں کہ ان غلاموں کی اسیری اور تجارت کا منصوبہ سب سے پہلے میرے ذہن میں آیا تھا اور شروع سے آخر تک اس معاملے کا نگران اور عمل کار میں ہی رہا ہوں!"

شہر کے محافظ نے ملاح سے اتفاق کیا اور اسے غلاموں کی کُل قیمت میں سے چوتھائی کا مستحق قرار دے دیا۔ بوڑھا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بازار میں سڑک کے کنارے کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔ اس کے سامنے اور آس پاس اس کی قوم کے نوجوان لڑکے، لڑکیاں، جواں اور بوڑھے مرقعِ عبرت بنے بِک رہے تھے۔ بوڑھوں کی قیمتیں بہت کم لگ رہی تھیں کیونکہ ان کے بارے میں عام تاثر یہ تھا کہ یہ لوگ اوّل تو کام کے لائق ہی نہیں رہ جاتے اور جو کام کے لائق رہتے بھی ہیں تو ان میں پائی جانے والی قنوطیت اور مایوسی انھیں اس لائق نہیں رکھتی کہ وہ اپنے فرائض دل جمعی، لگن اور مستعدی سے انجام دے سکیں، قیمتیں لگانے والے اس کے قریب آتے اور جھرّیوں زدہ چہرہ دیکھ کر آگے بڑھ جاتے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بوڑھے لوگ کوئی بڑے نازک اور اہم کام کے لائق نہیں رہ گئے، بوڑھے نے اپنے سامنے سے گزرنے والے کئی امیروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "لوگو! مجھے خرید لو، میں تمھیں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ میں تمھیں عقل و دانش کی باتیں بتاؤں گا!"

ایک ادھیڑ عمر گٹھے جسم کے مالک نے بوڑھے کی درخواست پر غور کیا اور اس کا مول تول کرنے لگا۔ بات طے پا گئی، سودا ہو گیا اور بڑے میاں اس ادھیڑ عمر شخص کی غلامی میں چلے گئے۔ بعد میں خریدنے والے کو بڑی پریشانیاں اٹھانا پڑیں کیونکہ بڑے میاں کا بیشتر وقت وطن کی طرف منہ کر کے رونے اور بین کرنے میں گزر جاتا تھا۔ اِدھر سے فرصت پاتے تو چپکے چپکے فنیقیوں کو کوستے رہتے جنھوں نے اس کی قوم کے بہت سارے لوگوں کو دھوکے سے اپنا غلام بنا ڈالا تھا۔

بیرسا کی چوٹی پر مِل کرت دیوتا کا شاندار بُت رکھا تھا۔ اسی مندر کے دوسرے حصّے میں تانِت دیوی براجمان تھی۔ شام سے ذرا پہلے وہاں ایک زبردست اجتماع ہوا، اپنے ادھیڑ عمر مالک کے ساتھ بوڑھے کو بھی وہاں جانا پڑا۔ مندر کے آس پاس بڑے بڑے درختوں کی قطاریں تھیں، انھی کے جھنڈ میں مِل کرت دیوتا اور تانِت دیوی کا مندر تھا۔ بوڑھے کے ذمے یہ خدمت کی گئی کہ وہ معزز حاضرین کو پانی پلاتا رہے، ان معززین میں ہمل کر برقہ بھی اپنے بیٹے ہینی بال کے ساتھ شامل تھا۔ ہینی بال اس وقت آٹھ سال کا رہا ہو گا۔ ہمل کر برقہ نے کوہِ اَرکس سے بے دخل ہو جانے کی صورت میں جو بے عزتی اور ذلّت اٹھائی تھی، دل پر اس کا زخم تازہ تھا اور یہ اس وقت تک مندمل نہیں ہو سکتا تھا جب تک وہ خود بھی جمہوریۂ روما کو ذلیل اور شرمسار نہ کر لے گا۔ پنارس کی نواحی بندرگاہ سے لائے جانے والے غلاموں کو یہاں بطورِ خاص رکھا گیا تھا اور ان سے کمتر درجے کی خدمات لے کر یہ قرطاجنی "تاجر اپنے نفس کو تسکین دینا چاہتے تھے"، یہاں اس بوڑھے کو بہت سے ہم وطن، دوستوں اور عزیزوں کے چہرے نظر آئے ان میں چھوٹے چھوٹے بچّے بھی تھے جو اپنے قرطاجنی آقاؤں کی جوتیاں سنبھالے مندر کی سیڑھیوں کے نیچے کھڑے تھے۔ مندر کی سیڑھیوں پر دونوں طرف پجاری عورتیں معززینِ شہر کا پُرلطف اور دل کش مسکراہٹوں سے استقبال کر رہی تھیں اور سروں کے اوپر پردہ کبوتریاں منڈلا رہی تھیں جنھیں تانِت دیوی کے نام پر چھوڑا گیا تھا۔

اس بوڑھے کو جب بھی موقع ملا اس نے اپنے ہم وطنوں کو سرگوشی میں یہ یاد دلایا کہ انھیں یہاں مستقل نہیں رہنا ہے، ایک نہ ایک دن واپس ضرور جانا ہے کیونکہ یہ پنارسیوں کا وطن نہیں ہے، ان کا وطن تو یہاں سے دور بحرِ روم کے اس پار سسلی کے مغربی کنارے پر ہے۔ اس نے اپنے ہم وطنوں کو بتایا کہ وطن کی خوشگوار اور مرطوب ہوائیں ان کی یاد میں آوارہ و سرگرداں ہوں گی اور وطن کے لوگ ان کی یاد میں آہیں بھر رہے ہوں گے، اس نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ رات کے پچھلے پہر نیم غنودگی میں اس نے اپنے دور افتادہ ہم وطنوں کو روتے اور سسکیاں بھرتے سُنا ہے۔ اس نے اپنے ہم وطنوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ قرطاجنہ کی ذلیل سرزمین میں وہ مر کر دفن ہونا بھی پسند نہ کرے گا کیونکہ یہاں اس کے عزیزوں اور بزرگوں کی قبریں نہیں ہیں، اسی عالم میں اس نے ایک بچّے کو مندر کی نچلی سیڑھی پر سسکیاں بھرتے دیکھا، یہ بے چین ہو کر بچّے کے پاس پہنچا اور اس کا سر اوپر اٹھا کے پوچھا "بچّے! تم رو کیوں رہے ہو؟"

بچّے نے سُرخ سُرخ سوجی آنکھوں سے بوڑھے کی طرف دیکھا اور نفرت سے جواب دیا "کیا تم اپنی غلامی پر قانع ہو گئے ہو؟"

بوڑھے نے گھبرا کر جواب دیا "نہیں تو۔ غلامی پر کوئی حساس اور غیرت مند انسان آخر کس طرح قانع ہو سکتا ہے!"

"پھر تم مجھ سے رونے کا سبب کیوں دریافت کر رہے ہو؟" بچّے نے بوڑھے کو شرمسار کر دیا۔

بوڑھا کچھ دیر تک اس غیرت مند بچّے کو دیکھتا رہا پھر بولا "میرے بچّے! ابھی ذرا دیر پہلے تک میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ اپنے غلام ہم وطنوں میں، میں سب سے زیادہ حساس اور غیرت مند شخص ہوں لیکن تجھ سے مل کر اور تیری باتیں سُن کر میرا یہ پندار ٹوٹ گیا۔" پھر خوشی اور فخر کے جذبے سے بولا "ہم میں جب تک تیرے جیسے سمجھ دار اور غیرت مند بچے موجود ہیں میری قوم ذلیل نہیں ہو سکتی!"

بچّے نے کہا "میں اپنے بزرگوں کی عقل مندی اور حوصلے کی امید میں غلامی کے دن گزار رہا ہوں، اب دیکھنا یہ ہے کہ تم لوگ کب اور کس طرح ہمیں یہاں سے نکال لے جانے میں کامیاب ہوتے ہو!"

بوڑھے نے شرمساری سے کہا "ہم یہاں سے نکل بھاگنے کی کوشش تو ضرور کریں گے لیکن اگر موت کی دہلیز پر کھڑی ہوئی ہماری عمریں ہمیں موقع نہ دیں تو تم ہم پر لعن طعن بھی نہ کرنا کیونکہ زندگی کو لمبا کرنا ہم فانی انسانوں کے اختیار میں نہیں ہے، یہ دیوتاؤں کا کام ہے جب ہم مر کر دیوتاؤں کی سرزمین میں چلے جائیں تو اس وقت یہ تمھاری ذمّے داری ہوگی کہ تم اس ظلم و جبر کی سرزمین میں ہمیشہ کے لیے نہ رہ پڑو، تمھیں یہاں کی رنگینیاں اور دلکشیاں ہرگز ہرگز غلامی پر قانع نہ ہو جانے دیں اور تمھیں زندگی کی ہر آتی جاتی سانس میں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ تم قرطاجنہ کے باشندے نہیں ہو اور تمھارا اس سرزمین پر عارضی قیام ہے، تمھیں ایک نہ ایک دن یہاں سے چلا جانا ہے!"

بچّے نے پھر سر جھکا لیا۔ رقت زدہ لہجے میں بولا "میں اپنے باپ، ماں اور بہن بھائیوں کو کس طرح بھلا سکتا ہوں، یہ میری زمین نہیں ہے، یہ میرا وطن نہیں ہے، میں اس جگہ سے کس طرح محبت کر سکتا ہوں!"

تھوڑی دیر بعد ان غلاموں کو شراب کی صراحیوں اور بھیڑوں کے ساتھ مِل کرت دیوتا کے روبرو پہنچنے کا حکم دیا گیا۔ ان میں بوڑھا بھی شامل تھا۔ بوڑھے کے دونوں کاندھوں پر شراب کی صراحیاں رکھ دی گئیں اور وہ انھیں لے کر مِل کرت دیوتا کے روبرو پہنچ گیا۔ مندر کے صحن میں دھوپ بھری ہوئی تھی، اور سورج کی تمازت سرخ تمتمائے دے رہی تھی، اس تمازت میں لوگوں کا اژدحام اور زیادہ شدت پیدا کر رہا تھا۔ اسی مجمع میں اس نے ہمل کر برقہ اور اس کے آٹھ نو سالہ بیٹے ہینی بال کو کھڑے دیکھا، ہمل کر برقہ کبھی سسلی میں اس کے پڑوس کے کوہِ اَرکس پر حکومت کر چکا تھا۔ اس وقت وہ بہت اُداس تھا، غمگین اور فکرمند چہرے پر کچھ کھو دینے کے شدید احساس نے دُکھ کی تیرگی سی پھیلا دی تھی۔ ہمل کر برقہ کے ایک طرف اس کے کاندھے سے کاندھا ملائے بوڑھے کا ادھیڑ عمر آقا کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے بوڑھے کو قریب بلایا، پھر یہ لوگ لوگوں کے ہجوم اور دھوپ کی تمازت سے بچنے کی خاطر مندر کے اس حجرے میں چلے گئے جہاں مِل کرت دیوتا کا بُت

رکھا تھا۔ صراحی بردوش بوڑھا ان کے ساتھ، دو قدم پیچھے چل رہا تھا۔ برقہ خاندان کے بعض دوسرے معززین بھی ہمل کر برقہ کے ہمراہ تھے۔ ان کے پیچھے چند غلام قربانی کی بھیڑوں کی رسّیاں پکڑے حکم کے منتظر کھڑے تھے۔ ہمل کر برقہ کے حکم پر ایک بھیڑ کے چاروں پیر ایک رسّی سے باندھ دیے گئے اور اس بندھی ہوئی بے بس بھیڑ کو مِل کرت دیوتا کے قدموں میں ڈال دیا گیا۔ مجبور بھیڑ نے سر پیٹ اور پیروں سے فرش کو گھسنا شروع کر دیا۔ اس طرح وہ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن پیروں کے بندھے ہونے کی وجہ سے وہ اٹھ نہیں سکی۔ ہمل کر برقہ دو قدم آگے بڑھا اور قربانی کے گنڈاسے کی ایک ضرب سے بھیڑ کا سر الگ کر دیا۔ خون کی دھار اڑ اڑ کر مِل کرت دیوتا کے قدموں کو رنگین کرنے لگی۔ اس کے بعد ہمل کر برقہ نے بوڑھے کے کاندھے سے صراحیاں لے لیں اور یکے بعد دیگرے دونوں صراحیوں کی شراب دیوتا کے جسم پر انڈیل دی۔ ان رسوم کی ادائیگی کے دوران ننھا ہینی بال باپ کے قریب ہی موجود رہا۔ دیوتا کو بھیڑ کی قربانی دینے اور شراب میں نہلا چکنے کے بعد ہمل کر برقہ نے مندر میں موجود لوگوں کو حکم دیا کہ وہ سب کچھ اور پیچھے ہٹ جائیں حکم کی فوراً ہی تعمیل کر دی گئی۔ ہمل کر برقہ نے ننّھے ہینی بال کا ہاتھ پکڑا اور قربان گاہ سے متصل لے گیا وہ دونوں دیوتا کے قدموں میں دو زانو بیٹھ گئے۔

ہمل کر برقہ نے اپنا ایک ہاتھ دیوتا کے قدموں میں اور دوسرا مذبوحہ بھیڑ کی مُردہ پشت پر رکھ دیا اور قسم کھائی "مقدّس مِل کرت! آبادیوں اور شہروں کے دیوتا! ہمیں نئی زمین اور نئے شہر عطا فرما اور روم کو تباہ و برباد کر دینے کی قوت دے!" یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔ پھر اس نے اپنے بیٹے ہینی بال کا ہاتھ قربانی کی بھیڑ پر رکھ کر حکم دیا "ہینی بال! قسم کھا کہ اگر میں رومیوں کو تباہ و برباد نہ کر سکا تو میرا عہد تُو پورا کر دکھائے گا!"

ہینی بال نے ایک نظر باپ پر ڈالی، جذبات سے بھر بھرائے باپ کے چہرے کی کیفیت خود اس کے چہرے پر طاری ہو گئی، اس نے گردن جھکا لی اور

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

قسم کھائی: "رومیوں کی تباہی اور بربادی میری زندگی کا نصب العین اور اہلِ قرطاجنہ کی سُرخ روئی میرا مقصد ہوگا اگر میں اپنے عہد سے پھروں تو اے مِل کرت دیوتا! انھیں اختیار ہوگا کہ مجھے تباہ و برباد کر دو!"

ہمل کربرقہ نے اسی جگہ اپنے بیٹے کو اس فیصلے سے آگاہ کیا کہ وہ نئی زمینوں کی تلاش میں عنقریب روانہ ہو جائے گا کیونکہ کوہ ارکس کو کھو دینے کے بعد کسی اور نو آبادی کی دریافت اور اقتدار ضروری ہو گیا ہے اس نے بیٹے سے دریافت کیا: "ہینی بال کیا تم اس سفر میں بھی میرے ساتھ رہنا پسند کرو گے؟"

ہینی بال نے تائید میں گردن ہلائی۔ پنارمسی بوڑھا اس عہد و پیمان کو عقبے سے برداشت کر رہا تھا۔

اس عہد و پیمان کے کچھ دنوں بعد بوڑھے پنارمسی کی نگرانی میں ایک خوفناک بغاوت نے جنم لیا، یہ بغاوت آناً فاناً پھیلتی چلی گئی یہاں تک کہ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہو گئے جو غیر افریقی ہونے کے باوجود قرطاجنہ کی فوج میں ملازم تھے اور انھیں ماہ بہ ماہ تنخواہیں نہیں مل رہی تھیں اور وہ غریب کاشت کار اور دست کار بھی بغاوت میں شامل ہو گئے جو قرطاجنہ کی حکومت کو بھاری محصول ادا کرتے کرتے تنگ آ چکے تھے، یہ آگ اتنی تیزی سے پھیلی اور اس نے اتنا بڑا علاقہ گھیر لیا کہ قرطاجنہ اور اس کے حاکموں اور تاجروں کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا۔ بغاوت زدہ علاقہ ہمل کربرقہ کی تحویل میں دے دیا گیا ہمل کربرقہ نے افریقہ کے نومدلیں کو فوج میں لے لیا۔ اور مقامی اور غیر مقامی وفادار سپاہ کو لے کر باغیوں کے گرد گھیرا تنگ کرنے لگا۔ ہاتھیوں کی قطاریں فوج کے آگے آگے تھیں، ہاتھیوں پر چمڑے کی جھولیں پڑی ہوئی تھیں، ان دیو پیکر جانوروں اور نومدیہ کے بے جگرے شہسواروں نے باغیوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ باغی مجبوراً اپنی قوت کو مجتمع کر کے کھلے میدان میں آ گئے ہمل کربرقہ چاہتا بھی یہی تھا۔ اس نے باغیوں پر ہاتھیوں کی قطاریں چڑھا دیں اور جو ہاتھیوں کی روندن سے بچ گئے انھیں ہمل کربرقہ کی سپاہ نے تلواروں کی دھار اور برچھوں کی نوک پر رکھ لیا اور ایک بڑی تعداد زندہ گرفتار کر لی گئی۔ قرطاجنہ سے مختلف اندرونی علاقوں میں جانے والی سڑکوں پر سُولیاں گاڑی گئیں اور ان میں باغیوں کو لٹکا دیا گیا، وہ پنارمسی بوڑھا جو اس بغاوت کا اصل بانی تھا۔ ہمل کربرقہ کے ہاتھ نہیں آیا تھا اور اس کے نوجوان شکاری کتوں کی طرح اس کی بُو سونگھتے پھر رہے تھے۔ بوڑھا بچتا چھپتا قرطاجنہ کی بندرگاہ تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اس کے بعد اس کی دوسری کوشش یہ ہوتی کہ کوئی غیر افریقی جہاز ساحل پر آ جائے تو وہ کسی طرح اس میں سوار ہو جائے اور خوشامد درآمد یا کسی بھی ممکنہ طریقے سے وہ جہاز کے ملاح کو ساتھ لے جانے پر آمادہ کر لے۔

پندرہ سولہ دن اِدھر اُدھر روپوش رہنے کے بعد وہ ایک پتھریلے مکان کی حدود میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دن بیرسا کی چوٹی پر مادرِ زمین کے بُت تانِت کا کوئی میلہ ہو رہا تھا اور آبادی کے بیشتر لوگ وہیں گئے ہوئے تھے، بوڑھا جس پتھریلے مکان میں داخل ہوا تھا اس کے عقبی حصے میں ایک اُجاڑ مگر گنجان باغ تھا اور مختلف قسم کے بڑے بڑے درختوں نے اندھیرا کر رکھا تھا۔ انھی میں وہ خاردار جھاڑیاں بھی تھیں جو ایک وسیع رقبے میں پھیلی ہوئی تھیں اور جنھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا، وہ مکان کی پتھریلی دیواروں کی آڑ لیتا ہوا باغ میں داخل ہو گیا اور اسے اس جگہ کا سرسری جائزہ لے کر صحیح فیصلے تک پہنچنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ اس کا فیصلہ یہ تھا کہ اسے کسی بھی طرح خطرناک خاردار جھاڑیوں میں پناہ لینا ہے خواہ اس کوشش میں اس کا جسم چھلنی ہی کیوں نہ ہو جائے، موت تو ہر طرح اس کے تعاقب میں تھی۔ اگر پکڑا جاتا تو قتل کیا جانا یقینی تھا اور اگر خاردار جھاڑیوں میں کوئی زہریلا کیڑا اسے کاٹ لیتا، تب بھی موت یقینی تھی لیکن اگر خوش قسمتی سے جھاڑی کے کسی کیڑے نے اسے نہیں کاٹا تو نوکیلے کانٹے اسے زخمی کر کے لہولہان ہی کر سکتے تھے اور وہ کچھ اذیت جھیل کر زندہ تو رہ سکتا تھا۔ رہا کھانے پینے کا مسئلہ تو اس پر اطمینان سے غور کیا جا سکتا تھا۔ اس فیصلے کے بعد وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا خاردار جھاڑیوں کی طرف بڑھا لیکن عین اس وقت جب وہ باغ میں داخل ہو چکا تھا، اس نے اپنے پیچھے کسی کے بھاگ کر آنے کی آہٹ محسوس کی، وہ ٹھٹھک کر رک گیا اور پلٹ کر دیکھا، ایک گیارہ بارہ سالہ لڑکا اس کی طرف دوڑا چلا آ رہا تھا۔ پنارمسی بوڑھا گھبرا گیا اس نے تشویش سے زمین کا جائزہ لیا وہاں اِدھر اُدھر مختلف حجم اور وزن کے پتھر بکھرے ہوئے تھے اس نے فوراً ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ یہ لڑکا جیسے ہی اس کے قریب آئے گا وہ اسے کسی پتھر کی بھرپور ضرب سے ہلاک کر دے گا کیونکہ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو یہ لڑکا اسے گرفتار کرا دے گا لیکن یہ لڑکا جیسے جیسے قریب ہوتا گیا، پنارمسی بوڑھے کا جوش اور غصہ ٹھنڈا پڑتا گیا کیونکہ یہ لڑکا وہی پنارمسی خدمت گار تھا جو اسے کچھ عرصے پہلے بیرسا کی چوٹی پر مِل کرت دیوتا کی سیڑھیوں پر مِلا تھا۔

بوڑھے نے لڑکے سے کہا: "فنیقی کُتے میری تلاش میں ہیں، مجھے ان خاردار جھاڑیوں میں چھپ جانے دو!"

لڑکے نے کہا: "آؤ میں تمھیں ایک ایسی جگہ چھپا دوں کہ تم آرام سے روپوش رہو اور موقع ملتے ہی یہاں سے نکل جاؤ!"

بوڑھے کی جان میں جان آئی اور غور اسے تامل کے بعد لڑکے کی بات مان لی۔

لڑکے نے اسے خام مال کے اُس گودام میں چھپا دیا جہاں گھر والے شاذ و نادر ہی جایا کرتے تھے اور اس گودام سے مال نکالنے اور رکھنے کا کام اسی لڑکے کے ذمے تھا۔ لڑکے نے بوڑھے کو یہاں چھپا دیا اور اسے یقین دلایا کہ اسے کھانا پینا یہیں ملتا رہے گا لیکن اگر کسی وقت ناغہ ہو جائے تو بوڑھا اسے معاف کر دے کیونکہ ایسا کسی خطرے ہی کی گھڑی میں ممکن ہوگا۔

ایک دن جب یہ لڑکا گودام میں داخل ہوا تو بوڑھے نے اس سے چند غیر متوقع سوالات کیے، سب سے پہلے تو اس نے لڑکے سے نام پوچھا: "میں نے تمھارا نام تو پوچھا ہی نہیں!"

لڑکے نے جواب دیا: "فِلبی، یوں پورا نام فلباس ہے!"

بوڑھے نے دوسرا سوال کیا: "اس گھر میں اور کون رہتا ہے؟"

"گھر کا مالک، اس کی بیوی، ایک لڑکی زلیفو۔ ایک لڑکا بھی تھا جو پچھلی بغاوت میں مارا گیا!"

بوڑھے نے ذرا پریشانی سے سوال کیا: "لڑکی کی عمر کیا ہے؟"

"یہی کوئی دس گیارہ سال!" لڑکے نے جواب دیا: "کیوں؟"

بوڑھے نے فکرمندی سے پوچھا: "تمھیں وہ لڑکی اچھی لگتی ہے؟"

"ہاں اچھی کیوں نہیں لگتی؟" لڑکا ان سوالات سے پریشان تھا۔ "کیوں؟ کوئی خاص بات؟"

"کیا وہ لڑکی بھی تمھیں پسند کرتی ہے؟"

"ممکن ہے پسند کرتی ہو لیکن یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے نفرت نہیں کرتی!"

بوڑھے کے کان کھڑے ہوئے، پوچھا: "تم دونوں آپس میں بے تکلف بھی ہو گئے؟"

"ہاں خاصے بے تکلف ہیں اور اسی لڑکی کے طفیل میری اس گھر میں خادموں یا غلاموں جیسی حیثیت نہیں رہی، اب میں اس گھر کا ایک فرد سمجھا جاتا ہوں!"

بوڑھے نے خوف زدہ انداز میں پوچھا: "تم نے اس لڑکی سے میرا ذکر تو نہیں کیا؟"

لڑکے نے جواب دیا: "زلیفو بُری لڑکی نہیں ہے، وہ میری باتیں کسی اور کو نہیں بتاتی!"

بوڑھے نے تلخی سے کہا: "میرے سوال کا جواب دو، تم نے اس لڑکی سے میرا ذکر تو نہیں کیا؟"

لڑکے نے کسی قدر جھجکا کر جواب دیا: "نہیں!"

لیکن جھوٹ اس کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔ اس نے رازداری کا وعدہ لے کر زلیفو کو سب کچھ بتا دیا تھا۔

بوڑھے نے غصے اور خفگی سے کہا: "لڑکے تم نے یہ بہت بُرا کیا تم نے مجھے میرے دشمنوں کے حوالے کر دیا۔ میں نے تم پر اعتماد کر کے زندگی کا بدترین فریب کھایا ہے!"

لڑکا کھانے پینے کا جو سامان بوڑھے کے لیے لے گیا تھا۔ بوڑھے نے اسے نفرت سے واپس کر دیا۔

لڑکے نے جھک کر بوڑھے کے پیر پکڑ لیے، روتا ہوا بولا: "میں اپنی غلطی پر شرمسار ہوں، مجھے معاف کر دو۔"

بوڑھے کی آنکھیں بھیگ گئیں، بولا: "فلبی! تم میرے بچے ہو، میرے ہم وطن کے بیٹے ہو، میں تم سے کس طرح نفرت کر سکتا ہوں، تم نے لڑکپن کی سادگی میں بہت بڑی غلطی کی ہے اور اس غلطی پر میں تم سے نفرت نہیں، تم پر افسوس کر سکتا ہوں!"

فلبی نے بڑی کوشش کی کہ وہ کچھ کھا پی لے لیکن پنارمسی بوڑھا اپنی ضد اور انکار پر آخر تک قائم رہا۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

بڑھے کا خدشہ بالکل صحیح نکلا۔ اسے ہمل کربرقہ کے آدمیوں نے خام مال کے گودام سے برآمد کرلیا۔ فلبی خاموش تماشائی بنا اس کی گرفتاری کا منظر دیکھتا رہا۔ زلفیو اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔ جب ہمل کربرقہ کے آدمی پنارسی بوڑھے کو ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے گودام سے باہر لائے تو اس کے کولھے سے خون کا فوارا چھوٹ رہا تھا۔ ہمل کربرقہ گودام کے باہر کھڑا اس نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کے قریب داہنی طرف ہنیی بال کھڑا تھا۔

سپاہیوں نے بوڑھے کو بے دردی سے ہمل کربرقہ کے سامنے ایک جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔

ہمل کربرقہ نے پوچھا۔ ”اس کے کولھے سے خون کیا بہہ رہا ہے؟“

ایک سپاہی نے جواب دیا۔ ”جب ہم لوگ گودام میں داخل ہوئے تھے تو یہ خطرے کا صحیح اندازہ لگا کے خام مال کے نیچے چھپ گیا تھا۔ ہم اسے خام مال میں نیزے چبھو چبھو کر تلاش کر رہے تھے۔ اس تلاش میں ہمارا ایک نیزا اس کے کولھے میں اتر گیا اور جب ہم نے نیزا کھینچ کر باہر نکالا تو اس کی انی خون میں تر تھی!“

تکلیف سے نڈھال بوڑھے نے حاضرین کو دیکھا پھر اس نے فلبی پر نظریں گاڑ دیں اور کرب سے چلّایا۔ ”مجھے اس کا غم نہیں ہے کہ میں گرفتار کرلیا گیا اور کچھ دیر بعد اذیتیں دے کر ہلاک کر دیا جاؤں گا۔ افسوس ہے تو صرف اس بات کا کہ میں ہمیشہ کے لیے اجنبیوں کی زمین میں دفن ہو جاؤں گا!“

فلبی نے زلفیو کو شکایت آمیز نظروں سے دیکھا اور آہستہ سے پوچھا ”کیا اس کی مخبری تم نے کی تھی؟“

زلفیو نے معصومیت سے جواب دیا۔ ”ہاں کیونکہ تم اسے یہاں کب تک چھپائے رکھتے، ایک نہ ایک دن تو یہ پکڑا ہی جاتا۔ میں نے سوچا یہ خبر تمھارے حوالے سے میں خود ہی کیوں نہ دے دوں کیونکہ اس طرح تم ہمارے وفادار کہلاؤ گے؟“

فلبی نے خاموشی اختیار کرلی۔ بوڑھا بدستور بڑبڑا رہا تھا۔ ”معصومیت کی غلطی قابلِ معافی ہے لیکن جو لوگ جوان ہو کر بھی اپنے آباواجداد کی زمین کو بھلا دیں، اُن پر میں دیوتاؤں کی لعنت بھیجتا ہوں!“

ہمل کربرقہ نے نہایت سنجیدگی سے بوڑھے کا مقدر فیصل کر دیا۔ تماش بینوں کے ہجوم میں ہمل کربرقہ نے دو گھڑسواروں کو حکم دیا کہ وہ اپنے گھوڑوں کی دو بالمقابل ٹانگوں میں بوڑھے کی ایک ایک ٹانگ باندھ دیں۔ ہمل کربرقہ کے حکم کی فوری تعمیل ہوئی۔ اس کے بعد دونوں سوار اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوگئے اور ہمل کربرقہ کے دوسرے حکم پر دونوں گھڑسوار یکساں رفتار سے متوازی بھاگنے لگے۔ بوڑھے کا پتھروں اور کنکروں سے رگڑ کھاتا ہوا جسم لہولہان ہونے لگا۔

تقریباً ایک فرلانگ کے بعد دونوں گھوڑوں نے اچانک دو مخالف سمتوں میں بھاگنا شروع کر دیا اور ایک جھٹکے سے بوڑھا دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ تماشائی فرطِ جوش میں خوشی سے نعرے لگانے لگے۔

فلبی اُداس اور چپ چاپ گھر واپس ہوا۔

زلفیو نے پوچھا۔ ”کیا تمھیں اس واقعے سے دکھ پہنچا؟“

فلبی نے جواب دیا۔ ”اس سے میں خوش بھی نہیں ہوا!“

اس وقت زلفیو کے باپ نے فلبی کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔ ”فلبی! تمھارا بہت بہت شکریہ۔ اگر تمھاری مدد شاملِ حال نہ ہوتی تو یہ بوڑھا کبھی بھی نہ پکڑا جا سکتا!“

فلبی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے کان میں بوڑھے کی آواز اب بھی گونج رہی تھی۔ ”معصومیت کی غلطی قابلِ معافی ہے لیکن جو لوگ جوان ہو کر بھی اپنے آباواجداد کی زمین بھلا دیں، اُن پر میں دیوتاؤں کی لعنت بھیجتا ہوں!“

زلفیو کے باپ نے فلبی کو تسلی دی اور اسے یقین دلایا کہ اگر وہ اہلِ قرطاجنہ کا اسی طرح وفادار رہا تو اسے بہت جلد وہی حقوق حاصل ہو جائیں گے جو ہمیں حاصل ہیں۔

زلفیو اس کی خاموشی سے پریشان تھی۔ جب اس کا باپ چلا گیا تو اس نے غصّے سے کہا۔ ”اب تمھارا یہی وطن ہے اور تم اسی زمین کے باشندے ہو۔ تمھیں اس غدّار بوڑھے کے انجام پر غمگین نہیں ہونا چاہیے!“

فلبی اپنے غصّے اور صدمے کا برملا اظہار نہیں کرسکا۔ بمشکل جواب دیا ”زلفیو! تم نے جو کچھ کیا اگر یہ سب میرے علم میں لا کر کرتیں تو زیادہ اچھا ہوتا!“

اس واقعے کے کئی ماہ بعد ہمل کربرقہ اپنے خاندان اور جاں نثار ساتھیوں کے ساتھ اس جہاز میں چلا گیا جو ایک نامعلوم دنیا کی تلاش میں جا رہا تھا۔ اس سرزمین کی جستجو میں جو کوہِ اراکس کا بدل ثابت ہو سکے۔ تجارتی بندرگاہ کے ایک حجرے میں سیرِ سفر کے دیوتا کے روبرو قربانی پیش کی گئی اور عود و عنبر کی خوشبو میں چند لوش عمائدِ شہر نے خیر و سلامت سے منزلِ مقصود تک پہنچنے کی دعائیں مانگیں۔ اس کے بعد پچاس لمبے لمبے چپّو حرکت میں آگئے اور ہمل کربرقہ کے جہاز نے پانی میں حرکت شروع کر دی۔ ساحل پر کوہِ بیرسا کی مقدّس چوٹی انھیں الوداع کہہ رہی تھی۔ جہاز نے احتراماً کوہِ بیرسا کے سامنے ایک چکّر لگایا اور پھر اُس سمت میں روانہ ہوگیا۔ جہاں دو ساحلوں کے درمیان سورج ہر روز غروب ہوا کرتا ہے، جبرالٹر اور سیوتہ کے درمیان۔

ساحل پر کھڑے ہوئے عمائدِ شہر اور دوسرے شہریوں کی نظریں جہاز کے مستولوں اور چپوؤں پر جمی ہوئی تھیں جو لمحہ بہ لمحہ مختصر ہوتے جا رہے تھے۔ اور یہ مختصر ہوتے ہوئے دھبّے کی شکل اختیار کر گئے پھر یہ دھبّے بھی سمندر کی وسعتوں

میں گم ہوگئے۔ اس وقت فلبی ایک ایسے جہاز کا تصور لیے کھڑا تھا جو اسے پنارس کی آبادیوں میں لے جائے گا۔ اس کے آباواجداد کی سرزمین میں۔ سامنے شمال کی ہواؤں میں اسے وطن کی بو محسوس ہو رہی تھی۔

اسی دن زلفیو کے والدین نے اپنا یہ فیصلہ سنا دیا کہ اگر ہمل کربرقہ ان کے لیے کوئی نئی دنیا حاصل کرسکا تو یہ لوگ بھی وہیں چلے جائیں گے۔

▲▲ ▼▼

جیسے جیسے دن گزرتے گئے فلبی قرطاجنہ والوں کا اعتماد حاصل کرتا گیا لیکن دوسری طرف فلبی کے دل میں ہم وطن بوڑھے کی گرفتاری اور موت کے نقوش گہرے ہوتے چلے گئے۔ وہ اس سانحے کو بھول جانا چاہتا تھا مگر بوڑھے کی روح نے گویا اس کے دل پر قبضہ کرلیا تھا اور کسی طرح حافظے سے نکلنے پر تیار ہی نہ ہوتی تھی۔ زلفیو اسے اچھی لگتی تھی لیکن اس اچھائی اور دل کشی میں بوڑھے کی موت شیشے میں بال پڑ جانے کی طرح شامل ہوگئی تھی، وہ اپنے اِس دکھ کا زلفیو پر اظہار بھی نہ کرسکتا تھا لیکن زلفیو یہ تبدیلی تو محسوس کر ہی سکتی تھی کہ فلبی میں کچھ تبدیلی آگئی ہے مثلاً یہ تبدیلی کہ وہ اس سے باتوں اور معاملات میں گرم جوشی اور محبّت کا مظاہرہ کرتے کرتے اچانک سرد مہری اختیار کرلیتا ہے۔ زلفیو کا ننھا ذہن اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

ہمل کربرقہ نے اسپین کے جنوب مشرق میں ایک نئی دنیا حاصل کرلی تھی اور اس کا نام ”نیا قرطاجنہ“ رکھ دیا تھا۔ قرطاجنہ کے حکام نے ہمل کربرقہ کو فرمانِ حکمرانی کی ایک کندہ تختی پہلے ہی سے دے رکھی تھی جس پر لفظ ”شوفت“ (محافظ) کھدا ہوا تھا اور جس کا یہ مطلب تھا کہ ہمل کربرقہ کو عمائدِ قرطاجنہ نے کسی بھی علاقے کی حفاظت کا فرض سونپ رکھا ہے۔ ہمل کربرقہ نے اس تختی سے وہی کام لیا جو کسی حکومت کے عہدے دار پروانۂ تقرری سے لیا کرتے ہیں، ہمل کربرقہ نے ایک پانچ رکنی وفد بھیج کر قرطاجنہ کے حکمرانوں کو یہ خوش خبری سنا دی۔ کوہِ بیرسا کی بلندی پر مجلسِ قرطاجنہ کا وہ محل تھا جہاں حکومت کی ذمّے دار مجلس اہم ترین فیصلے صادر فرمایا کرتی تھی۔ اس ایوان میں پردوں کے پیچھے ارکانِ مجلس سر جوڑ کے بیٹھتے اور گھنٹوں بحث مباحثے کرتے رہتے پھر جب کسی نتیجے پر پہنچ جاتے تو پردے سے نمودار ہو کر اپنے فیصلوں کا اعلان کر دیتے۔ ہمل کربرقہ کی کامیابی کی خوشی میں ایک شاندار جشن کا اہتمام ہوا۔ مل کرت دیوتا کی قربان گاہ پر بھیڑیں ذبح کی گئیں اور تانِت دیوی کے نام پر بے شمار کبوتریاں چھوڑی گئیں۔ شہر کی نشیبی آبادی کے لوگ بھی اُوپر پہنچ گئے اور ان سب نے مل کر شاندار جشن منایا۔ نومدیہ کے زندہ دل اور بہادر سپاہیوں نے آگ کا الاؤ جلایا اور اس کے گرد بیٹھ کر شرابیں پینے لگے۔ قرطاجنہ کے شہری بھی بیرسا کے مختلف مندروں میں قربانیاں اور نذرانے پیش کرتے

یعقوب کندی

سے کسی نے کہا۔ ”اگر خدا زندگی میں خوشی ہی خوشی رکھتا تو کتنا مزہ رہتا اور زندگی کتنی حسین ہوتی؟“

کندی نے جواب دیا۔ ”تمھاری بات مہمل ہے!“ پھر سوال کیا۔ ”کیا تم نے دُنیا میں کوئی ایسی چیز بھی دیکھی ہے جو یک رُخی ہو اور اس کا دُوسرا رُخ نہ ہو؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”نہیں، یہ ناممکن ہے!“

کندی نے کہا۔ ”پھر تم ناممکن چیز کی خواہش کیوں کر رہے ہو، خُوشی زندگی کا ایک رُخ ہے اور غم دوسرا اور زندگی کی تکمیل ان دونوں رُخوں سے ہوتی ہے!“

پھر رہے تھے۔ انھیں میں زلفیو کا خاندان بھی شامل تھا۔ زلفیو کے باپ نے شراب کے کئی مرتبان ایک گاڑی میں لادے اور بیرسا کی چوٹی پر پہنچ کر دیوی دیوتاؤں کو شراب میں نہلانے لگا۔ اور اس نے یہ منت مانی کہ اگر دیوی دیوتاؤں نے اسے مجلسِ قرطاجنہ سے کسی علاقے کی شوفت کی تختی دلوا دی تو وہ ان کے قدموں میں پچاس بھیڑیں قربان کرے گا اور انھیں بیس سیر شراب سے غسل دلائے گا۔ تانِت دیوی سے یہ عہد کیا کہ اگر وہ اپنا دلی مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تو وہ تانِت دیوی کے نام پر پچاس کبوتریاں آزاد کرے گا۔

یہیں رات کے اندھیرے میں مل کرت کی سیڑھیوں پر زلفیو اور فلبی بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ زلفیو نے محسوس کیا تھا کہ وہ آج کے ہنگامے میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا ہے اور یہ احساس زلفیو کے لیے بہت اذیت ناک تھا۔ ان دونوں سے تقریباً پانچ سو قدم دور نومدیہ شہسوار الاؤ کے گرد بیٹھے ناؤنوش میں مشغول تھے الاؤ کی روشنی میں اِن دونوں کے چہرے دمک رہے تھے۔

زلفیو نے خاموش اور فکرمند فلبی سے پوچھا۔ ”کیا تم آج بھی خوش نہیں ہو؟“

فلبی نے بے خیالی میں جواب دیا۔ ”معلوم نہیں کیوں کبھی کبھی میرے دل کی حرکت بہت تیز ہو جاتی ہے اور جب مجھ پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو میں بہت اُداس ہو جاتا ہوں!“

زلفیو نے پوچھا۔ ”اِس اُداسی کا سبب؟“

”میں خود نہیں جانتا!“

”یہ کیونکر ممکن ہے!“ اس وقت وہ خود بھی اُداس تھی۔ ”میں ایک بات آج تمھیں ضرور بتا دینا چاہتی ہوں، تم میرے گھر میں زرخرید غلام کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے لیکن آہستہ آہستہ تمھارے دل نشیں انداز اور بے لوث خدمت گزاری سے تمھارے لیے میرے گھر میں بڑی عزت پیدا ہوگئی

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

اور اب یہ حال ہے کہ تم میرے گھر کے ایک فرد سمجھے جاتے ہو!"

فلبی نے جواب دیا "بہت بہت شکریہ لیکن میں نے تمہارے خاندان میں اپنی شمولیت کی درخواست تو نہیں دی تھی۔ اگر تمہارے گھر کے لوگ مجھے اپنے خاندان میں شامل کر لینا چاہتے ہیں تو میں انہیں خوش آمدید کہنے کو تیار رہوں!"

"پہلے تم بہت خوش رہتے تھے لیکن اب اُداس اور چپ چپ رہنے لگے ہو، آخر اس کا سبب؟"

"کہہ تو دیا کہ سبب تو میں خود بھی نہیں جانتا!"

زلیفو نے کہا "کیا تمہیں یہ بات معلوم ہے کہ قرطاجنہ کے بعض بڑے تاجر اپنے لڑکوں کے لیے مجھے پسند کرنے لگے ہیں، میرے باپ نے انہیں یہ جواب دیا ہے کہ زلیفو ابھی بچی ہے لیکن تم خود سوچو کہ میرے باپ کا یہ جواب ایسا تو نہیں ہے جو ہمیشہ دیا جاسکتا ہو، وہ کچھ دنوں سے تمہاری پُراسرار تبدیلی پر بھی غور کر رہے ہیں چنانچہ کل رات میں نے خود اپنے کانوں سے سنا وہ میری ماں سے کہہ رہے تھے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ فلبی ہمیں دھوکا دے جائے۔ کیونکہ اس کی پُراسرار خاموشی سے ڈر لگنے لگا ہے!"

فلبی نے جواب دیا "ابھی ہمیں یہ باتیں نہیں سوچنی چاہئیں، کیا خود تمہیں یہ باتیں اچھی لگتی ہیں اور ان کا اصل مفہوم تمہاری سمجھ میں آتا ہے؟"

زلیفو نے کہا "یہ باتیں تو مجھے بہت اچھی لگتی ہیں، رہا ان کے مفہوم سمجھنے کا مسئلہ تو کبھی نہ کبھی تو ان کا اصل مفہوم سمجھنے ہی لگوں گی!"

فلبی نے کہا "جب ان کا مفہوم سمجھنے لگو تو اس سلسلے میں باتیں بھی کر لینا، فی الحال تو اس موضوع کو یوں ہی سپاٹ رہنے دو!"

"وہ یہ کس طرح ممکن ہے!" زلیفو تڑپ کر بولی "تمہیں میری خاطر پہلے جیسا تو بننا ہی پڑے گا!"

اسی وقت مندر کی سیڑھیوں سے ایک نوجوان اترتا ہوا ان تینوں کے قریب آگیا۔ اس نے زلیفو کو دیکھا اور ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ بولا "لڑکی! تمہارا نام کیا ہے؟"

زلیفو نے تنک کر جواب دیا "میرے نام سے تمہیں کیا کام؟ کچھ بھی ہو میرا نام، تمہیں کیا!"

نوجوان نے شرارت سے ایک آنکھ میچ لی اور آنکھ ملا کے بولا "تم ابھی چھوٹی ہو لڑکی، میرے باپ کو معلوم نہیں کیوں، تم بہت زیادہ پسند آگئی ہو لیکن اب میں اس سے یہ کہوں گا کہ ابھی کچھ دن انتظار کرو۔ ورنہ جلدی میں کام بگڑ جائے گا!"

فلبی غصے میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا، بولا "نوجوان! تم جاؤ اور ہمیں پریشان نہ کرو، میں یوں ہی بہت پریشان ہوں!"

نوجوان نے شرارت سے کہا "میرے چھوٹے سے دوست! اگر تم نے اس لڑکی کے حقوق کسی طرح بھی حاصل کر لیے ہیں تو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں، تم دونوں عیش کرو، میں چلتا ہوں!"

جب وہ چلا گیا تو زلیفو نے فلبی کو آڑے ہاتھوں لیا، بولی "یا تو تم خود کو پہلے جیسا بنا لو یا پھر اس کے لیے تیار ہو جاؤ کہ ہم دونوں کے درمیان جو فاصلہ اس وقت موجود ہے وہ وقت کے ساتھ ساتھ بتدریج بڑھتا چلا جائے!"

فلبی نے آہستہ سے جواب دیا "زلیفو! میں اپنی غائب دماغی کی معافی چاہتا ہوں، تم مجھے معاف کردو، آیندہ میں پہلے جیسا بننے کی کوشش کروں گا!"

پہاڑ کی خنک ہوائیں سمندر کی نمی سے سردی کی کیفیت پیدا ہو گئی اور یہ سردی دونوں ہی محسوس کر رہے تھے۔

فلبی نے پوچھا "ہم گھر واپس کب چلیں گے؟"

زلیفو نے جواب دیا "میرے ماں باپ دیوتاؤں کو نذرانے پیش کرنے پھر رہے ہیں، وہ فارغ ہو کر آجائیں تو ہم دونوں بھی چلنے کی تیاری کریں۔"

فلبی نے کہا "تب پھر ملو، چل کے ہم دونوں کسی حجرے میں بیٹھیں جہاں یہ سرد ہوائیں نہ پہنچ سکتی ہوں!"

زلیفو نے فوراً کہا "میں تیار ہوں!"

یہ دونوں مندر کی سیڑھیاں عبور کر کے تانت دیوی کے مندر میں داخل ہو گئے، یہاں زلیفو نے دیوی کے قدموں میں شراب انڈیلی اور فلبی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگی "اے تانت دیوی! فلبی کو پہلے جیسا بنا دے!"

لیکن فلبی نے کوئی دعا بھی نہ مانگی۔ زلیفو نے کہا "تم دیوی سے کچھ مانگتے کیوں نہیں، یہ زمین کی دیوی تانت ہے اور لوگوں کا تجربہ ہے کہ اگر اس سے خلوص کے ساتھ کچھ مانگا جائے تو یہ اپنے پرستاروں کو مایوس نہیں کرتی!"

فلبی نے شرما حضوری دیوی سے دعا مانگی "مجھے پہلے جیسا بنا دو!"

زلیفو نے حجرے کے باہر اپنے باپ کو ایک طرف جاتے ہوئے دیکھا تو وہ یہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی کہ میں اپنے باپ سے مل کر ابھی آتی ہوں کہیں میرا باپ مجھے تلاش کرتا ہوا اس ہجوم میں بھٹک نہ جائے!"

اس کے جاتے ہی فلبی نے رو رو کر دعا مانگی "تانت دیوی! تم زمین کی دیوی ہو تم مجھے میری زمینوں میں واپس کیوں نہیں بھیج دیتیں، میرے ماں باپ میرے غم میں رو رو کر نڈھال ہو گئے ہوں گے، میرے بھائی بہن آتی جاتی سانسوں

میں میرا نام لے رہے ہوں گے، تانت دیوی! میں اس زمین کا آدمی نہیں ہوں جیسا کہ تم کو معلوم ہے کہ میں نیارسی ہوں، مجھے وہیں بھیج دو دیوی! یہ میری آخری اور سب سے بڑی دعا ہے، اسے قبول کر لو!"

تھوڑی دیر بعد زلیفو پھر واپس آگئی، اس وقت تک فلبی اپنے دل کا بوجھ اتار چکا تھا اور خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے زلیفو کا استقبال کیا، فلبی کو ایسا لگا جیسے اس کی دعا قبول کی جا چکی ہے۔ زلیفو اسے خوش دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ فلبی نے اسے تسلی دینے کی خاطر کہا "زلیفو! ابھی میں نے دیوی سے یہ دعا مانگی تھی کہ وہ مجھے پہلے جیسا بنا دے، اس دعا کے فوراً بعد میرے دل کا بوجھ اتر گیا، میرا خیال ہے اب میں پھر پہلے جیسا ہو گیا ہوں!"

زلیفو نے فرطِ خوشی میں اس کا ہاتھ چوم لیا "کاش دیوی ایسا ہی کر دے!"

واپسی میں دونوں مست اور بے حال زائرین کے الاؤ کے قریب گئے اور ان کی بلانوشی کا نظارہ کرتے رہے، اس کے بعد خالی مرتبانوں سمیت اپنے گھر روانہ ہو گئے۔

بوڑھے کی موت کو جتنا عرصہ گزرتا گیا، فلبی کے ذہن سے اس کی یاد اور تعلیمات محو ہوتی چلی گئیں، اسے زلیفو اور اس کے والدین نے اتنا آرام پہنچایا کہ اسے قرطاجنہ اور اہلِ قرطاجنہ سے محبت ہو گئی۔ زلیفو کے باپ نے فلبی کو تجارت میں لگا دیا، وہ بہت جلد اس لائق ہو گیا کہ بڑے بڑے بحری تاجروں کے ہاتھ اپنا مال فروخت کرنے لگا لیکن اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ تجارتی سامان دوسرے ملکوں اور شہروں میں بیچنا زیادہ نفع بخش ہے، اس نے زلیفو کے باپ کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ قرطاجنہ سے نکل کر بحرِ روم کے ساحلی شہروں اور جزیروں میں قسمت آزمائی کرے۔ زلیفو کے باپ نے اس کی تجویز سے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ اس پر عمل کیا اور وہ فلبی کو ساتھ لے کر ایک لمبے سفر پر روانہ ہو گیا، دونوں قرطاجنہ سے تقریباً چار سال دور رہے لیکن جب واپس آئے تو اپنے ساتھ بڑی دولت کما لائے، زلیفو کا باپ فلبی سے بہت خوش تھا۔ اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی یہ اعلان کر دیا کہ وہ فلبی کو عنقریب اپنی دامادی کا شرف بخش دے گا، دوسری طرف زلیفو پر جوانی پھوٹ پڑی تھی اور اس نے کئی نوجوانوں کو دیوانہ بنا رکھا تھا لیکن خود زلیفو فلبی کی دیوانی تھی اور اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتی رہی تھی، وہ فلبی کی عدم موجودگی میں بارہا ساحلی چٹانوں پر بیٹھ کر اس جہاز کا انتظار کر چکی تھی جو کسی بھی طرف سے نمودار ہو کر فلبی کو لانے والا تھا لیکن یہ تقدیر کی ستم ظریفی تھی کہ جب وہ قرطاجنہ کے

ساحل پر اُترا، اس وقت زلیفو اپنے گھر میں تھی اور جب فلبی اس کے باپ کے ساتھ گھر میں اچانک داخل ہوا تھا تو وہ خوشی کے مارے پاگل سی ہو گئی تھی پھر جب زلیفو کے باپ نے فلبی کو داماد بنانے کا اعلان کر دیا تو اہلِ قرطاجنہ نے اس اعلان کو خوشی سے نہیں سنا کیونکہ فلبی بدقسمتی سے نیارسی تھا اور نیارسی رومی نسل سے تعلق رکھتے تھے وہ رومی جنھوں نے قرطاجنہ والوں کو کئی نوآبادیوں سے محروم کر دیا تھا، اسی دوران ہسپانوی قرطاجنہ سے یہ خبر ملی کہ ہمل کر برقہ کسی مقامی سازش میں قتل کر دیا گیا اور جمہوریۂ روما نے ان کے جزیرے ساردینیا اور سالونیکا کو بھی خالی کرا لیا ہے۔ یہ بڑی تشویش ناک خبریں تھیں، زلیفو کے باپ کو کوہ بیرسا کے ایوان میں طلب کر لیا گیا، وہاں عمائدِ شہر جمع تھے اور ایوان کے دروازے سُرخ پردوں میں چھپے ہوئے تھے۔

مجلس کے صدر نے زلیفو کے باپ سے سوال کیا "کیا یہ خبر درست ہے کہ تم اپنی بیٹی زلیفو کی شادی رومی نژاد فلبی سے کر دینا چاہتے ہو؟ وہ فلبی جو رومی ہونے کے ساتھ ہی تمہارا غلام بھی ہے!"

زلیفو کے باپ نے جواب دیا "وہ رومی اور غلام ہونے کے ساتھ ہی ہمارا وفادار شہری ہے، میں اپنے فیصلے اور اس کے اعلان پر شرمندہ نہیں ہوں، فلبی ہر طرح اس اعزاز کا مستحق ہے کہ میں اسے اپنا داماد بنا لوں!"

مجلس کے ایک ممبر نے تقریباً چیخ کر کہا "ایسا نہیں ہو سکتا، کبھی بھی ایسا نہیں ہو سکتا، اگر ایسا ہوا تو میں اس منحوس کام میں ہر طرح کی مداخلت کا ارادہ کر چکا ہوں!"

میرِ مجلس نے دھمکی دی "اور بیرسا کی مجلس یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ اگر ایک رومی کو کسی بھی طرح وہ عزت بخشی گئی جو صرف اہلِ قرطاجنہ کا حق ہے تو وہ اس قومی مجرم کو صنعت اور تجارت کے حقوق سے محروم کر دے گی!"

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

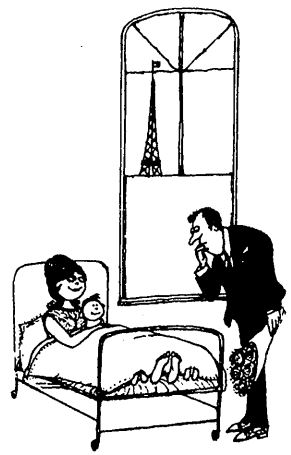

زلفیو کا باپ دل شکستہ اور پاگرفتہ حالت میں بیرسا سے نیچے آیا اور اپنے کمرے میں منہ چھپاکے بیٹھ رہا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ بیرسا کے ایوان کا فیصلہ زلفیو اور فلبی کو کس طرح سنائے؟ اس فیصلے کی سن گن زلفیو کو بھی مل چکی تھی۔ اس نے اپنے اُداس باپ کو کمرے میں جاتے دیکھا تو سمجھ گئی کہ معاملہ کچھ زیادہ گمبھیر ہے۔ کچھ دیر تک تو اس نے یہ انتظار کیا شاید اس کا باپ اسے بُلا کر بیرسا کے ایوان کا فیصلہ سنا دے لیکن جب ایسا نہیں ہوا تو اس نے خود بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس وقت فلبی گھر میں موجود نہیں تھا۔ وہ دبے قدموں باپ کی خلوت گاہ میں داخل ہوئی تو وہاں ماں کو موجود پایا۔ دونوں کی نظریں تقریباً ایک ساتھ اُٹھیں اور افسردہ زلفیو کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔

ماں نے زلفیو کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ لیٹے ہوئے باپ نے کانوں پر سے بالوں کی لٹیں ہٹائیں اور داڑھی کھجانے لگا۔ ماں نے زلفیو کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور مضبوط لہجے میں کہا: "اگر مقدس بیرسا کے ایوان نے متفق ہوکر بیک آواز یہ فیصلہ کردیا ہے کہ میری بیٹی زلفیو کا ہاتھ پنارسی نوجوان کے ہاتھ میں دیا جائے تو ہمیں بھی بے چون و چرا اس فیصلے کو قبول کرلینا چاہیے کیونکہ یہ ہمارے بڑوں کا فیصلہ ہے!"

زلفیو کے باپ نے کہا: "میں اپنے بڑوں کے فیصلے کو رد کیونکر کرسکتا ہوں لیکن یہ بات بھی آسان نہیں ہے کہ میں اس شریف پنارسی نوجوان کو خود اپنی زبان سے یہ موت کا حکم سنا دوں!"

ماں نے کہا: "تم زلفیو کو ہمارے بڑوں کا فیصلہ سنا دو۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ ناگوار فرض جو خالصتاً زلفیو کی ذات سے تعلق رکھتا ہے، یہ خود انجام دے لے گی!"

باپ نے بیرسا کی مجلس کا فیصلہ زلفیو کو سنا دیا اور تالیفِ قلب کے لیے بولا: "یہ ایک نہایت ناگوار اور ظالمانہ فیصلہ ہے جو بیرسا کے بڑے لوگ دو نوجوانوں کی ذاتی اور جذباتی زندگی کے خلاف سنا بیٹھے ہیں۔ ہم چاہیں تو ان کے اس فیصلے کو ٹھکرا دیں لیکن ہمارے خاندان میں آج تک ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ دوسرے یہ کہ اس فیصلے کے خلاف قدم اُٹھانے کی جو ہمیں سب سے بڑی سزا بھگتنا پڑے گی وہ یہ ہے کہ ہمیں صنعتی اور تجارتی حقوق سے محروم کردیا جائے گا!"

زلفیو کے دل پر مسلسل گھونسے سے لگ رہے تھے۔ وہ کافی دیر خاموش بیٹھی رہی۔ اس کے ماں باپ زلفیو کا جواب سُننا چاہتے تھے۔ جب دیر تک خاموشی طاری رہی تو ماں نے کہا: "زلفیو! تو کیا سوچ رہی ہے؟ کیا تجھے مقدس بیرسا کے بڑوں کا یہ فیصلہ قبول نہیں ہے؟"

زلفیو نے نہایت دھیمی آواز میں جواب دیا: "بیرسا کے بڑوں نے جو بھیانک فیصلہ کیا ہے، اس سے زیادہ بھیانک اور دردناک آپ دونوں کا یہ فیصلہ ہے کہ آپ مجھے مجبور کررہے ہیں کہ اس فیصلے کو فلبی تک میں پہنچا دوں!"

باپ نے کہا: "زلفیو! تم ہماری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم نے یہ فرض محض اس لیے تمھیں سونپا ہے کہ یہ مسئلہ تمھاری ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم نے اپنی کاروباری زندگی میں یہی سیکھا ہے کہ جس کے ذمے جو کام ہے وہ اسے خود انجام دے۔ یہ مسئلہ تمھارا ہے۔ ہمیں تم سے ہمدردی ہے لیکن اس ہمدردی پر ہم اپنے صنعتی اور تجارتی مفاد نہیں قربان کرسکتے!"

زلفیو نے جواب دیا: "میں بیرسا کے بڑوں کا یہ فیصلہ قبول کرتی ہوں لیکن ایک فیصلہ میں نے بھی کیا ہے اور میں اس میں کسی اور کی مداخلت ہرگز قبول نہ کروں گی!"

اس کے ماں باپ نے حیرت اور تجسس سے زلفیو کو دیکھا اور اس کا فیصلہ سننے کی خواہش کی۔

زلفیو نے تجسس کی فضا زیادہ دیر نہیں قائم رہنے دی۔ اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا: "ہمارے بڑوں نے اس پنارسی نوجوان کی اس خدمت کو کیوں بھلا دیا جو اس نے اپنے ہم قوم خطرناک بوڑھے کی گرفتاری کی شکل میں انجام دی تھی۔ تم لوگ اپنے پتھروں جیسے دل سے اس کی خدمات نکال دو لیکن میں نہیں نکال سکتی۔ اس نے تجارتی اور صنعتی معاملات میں ہمیں اور ہماری قوم کو بڑے فائدے پہنچائے ہیں اور یہ باتیں ایسی نہیں ہیں جنھیں بآسانی نظرانداز کردیا جائے۔ فلبی کے ان احسانات اور خدمات کا میں عملاً یوں اعتراف کروں گی کہ زندگی بھر اسی کے نام پر کنواری بیٹھی رہوں اور یہی میرا وہ فیصلہ ہے جس میں اپنے کسی بڑے کی مداخلت پسند نہیں کروں گی!"

زلفیو کی ماں نے پریشان ہوکے کہا: "یہ کس طرح ممکن ہے؟"

باپ نے ذرا سختی سے کہا: "ہمارے خاندان میں ایسا آج تک نہیں ہوا۔ میں نے تمھیں پالا پوسا ہے اور تمھاری پرورش اور تربیت پر میں بہت کچھ خرچ کرچکا ہوں۔ فلبی سے زیادہ تم پر میں نے احسانات کیے ہیں۔ کیا ان احسانات کا عوض تم نہیں دوگی!"

زلفیو نے اُکل اور سے مرتی کے انداز میں جواب دیا: "آپ لوگ اپنا قرض پہلے ہی وصول کرچکے ہیں!"

"وہ کس طرح اور کب؟" زلفیو کا باپ تلملایا ہوا تھا۔

زلفیو نے نہایت اطمینان سے جواب دیا: "میں نے مقدس بیرسا کے بڑوں کا وہ فیصلہ جو انھوں نے آپ کے خلاف نافذ کیا تھا خندہ پیشانی سے قبول کرکے آپ کا قرض اتار دیا ہے!"

باپ غصے میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ شاید تشدد پہ آجاتا لیکن مہربان ماں نے دونوں کے درمیان حائل ہوکر فریقین کو ٹھنڈا کرنا شروع کردیا۔ شوہر سے کہا: "زلفیو ہماری بیٹی ہے اور اس پہ ہاتھ اُٹھاکے یا کسی اور تشدد کے طریقے سے تم اس کے دل کو نہیں جیت سکتے۔ ہمارے لیے فی الحال یہی مناسب ہے کہ اس معاملے کو کچھ دنوں کے لیے التوا میں ڈال دیں اور دو چار سال خاموش تماشائیوں کی طرح زلفیو کا جائزہ لیتے رہیں اور مجھے یہ یقین ہے کہ کوئی بھی نوجوان یکساں جذباتی حالت کو تادیر قائم نہیں رکھ سکتا!"

پھر اس نے سسکیاں لیتی ہوئی زلفیو کو سینے سے لگا لیا اور سر پہ ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی: "بیٹی! تیرا باپ مرد ہے اور مردوں میں اپنے فیصلے جبراً مسلط کرنے کی پرانی عادت چلی آرہی ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ تو نے کوئی غلط فیصلہ کیا ہے۔ ان حالات میں عموماً نوجوان لڑکیاں اسی قسم کے جذباتی ارادے کرلیا کرتی ہیں جن پہ وہ زندگی بھر نہیں چل پاتیں اور بعد میں جب ان وقتی جذبوں پہ حالات اور تقاضوں کی تندی غالب آتی ہیں تو وہ وہی راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہوجاتی ہیں جو صحیح اور سچا راستہ ہوتا ہے!"

زلفیو نے روتے ہوئے کہا: "لیکن میں نے جو فیصلہ کیا ہے اسے زندگی کی آخری سانسوں تک نباہوں گی!"

"ٹھیک ہے؟" ماں نے کہا: "میں اس سلسلے میں تجھے پانچ سال دوں گی۔ اس عرصے میں اگر تو اپنے فیصلے پر اسی تندہی سے قائم رہی تو میں پانچ سال بعد اور توسیع کردوں گی لیکن اگر تیرے قدم ڈگمگانے لگے تو میں تیرے لیے تیرے شایانِ شان کسی خوب صورت اور دولت مند فنیقی نوجوان کو پسند کرلوں گی!"

باپ نے درمیان میں مداخلت کی، کہا: "لیکن ان پانچ سالوں میں زلفیو کو ایک بات کا بطورِ خاص خیال رکھنا پڑے گا!"

ماں نے چڑکر کہا: "تم معاملے کو ضرور بگاڑ دوگے، میں کہتی ہوں تم خاموش رہو!"

"او کم عقل عورت!" زلفیو کا باپ گرجا: "تو نے زلفیو کو پانچ سال کی مدت دینے میں ایک خاص نکتہ نظرانداز کردیا ہے، اور وہ ایسا نکتہ ہے کہ اگر اس کا خیال نہیں رکھا گیا تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ زلفیو ایک زندگی تو کیا کئی زندگیاں اپنے اس عہد پر قائم رہ کر گزار سکتی ہے!"

زلفیو نے اپنے بے رحم باپ کو رحم کی نظروں سے دیکھا۔

ماں نے پوچھا: "وہ کون سا نکتہ ہے، ذرا مجھے بھی تو بتاؤ!"

زلفیو کے باپ نے کہا: "تم زلفیو سے وعدہ لو کہ وہ ان پانچ سالوں میں فلبی سے دور بلکہ اس کی نظروں سے اوجھل رہے گی!"

زلفیو چیخ اُٹھی: "ایسا نہیں ہوسکتا، ایسا نہیں ہوسکتا!"

ماں ششدر رہ گئی اور سناٹے میں آگئی، آہستہ سے بولی: "اس کے بغیر تو میری عائد کردہ شرط کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی۔"

زلفیو چیختی رہی: "مجھ پر اتنا ظلم نہ کرو، میں مر جاؤں گی، میں یہ ظلم نہیں برداشت کروں گی!"

ماں اپنے شوہر کو زلفیو سے ذرا دور کمرے کے کونے میں لے گئی اور سرگوشی میں کہا: "میں سمجھتی ہوں اس نکتے کا زلفیو کے سامنے اظہار مناسب بات نہ تھی، یہ کام تو تمھارے کرنے کا ہے۔ اب فی الحال خاموش رہو اور وقت کا انتظار کرو، کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا!"

زلفیو نے چیخ کر کہا: "ماں! انھیں جو فیصلہ کرنا ہے سب کے سامنے کریں، دشمنوں کی طرح پیٹھ میں چھرا گھونپنے سے کیا حاصل!"

ماں نے جواب دیا: "زلفیو! میں تیری ماں ہوں، مجھے اپنا دشمن نہ سمجھو!"

باپ نے کہا: "زلفیو! جو ہونا تھا ہوچکا، اب تم اپنا فرض انجام دو اور

> ## ہتّے کٹّے
>
> بھکاری نے راہ گیر کو ایک ایسی جگہ روک لیا جہاں سناٹا تھا اور لوگوں کی آمد و رفت نہیں پائی جاتی تھی۔
>
> بھکاری نے ذرا اکڑ کے راہ گیر سے کہا: "آپ مجھے ایک روپیہ عنایت فرما دیں ورنہ سمجھ لیجیے کہ میں اپنی اسکیم پر عمل کر بیٹھوں گا!"
>
> راہ گیر نے بھکاری کے تن و توش اور تیور سے یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ انکار کی صورت میں یقیناً حملہ کر بیٹھے گا۔ اس نے خوفزدہ ہوکر ایک روپیہ بھکاری کے حوالے کردیا اور اس سے سوال کیا: "اگر میں تمھیں یہ روپیہ نہ دیتا تو تم کیا کرتے؟"
>
> بھکاری نے روپیہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اور ایک طرف جاتا ہوا بولا: "کسی جگہ مزدوری یا کسی کارخانے میں ملازمت!"

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

اپنے بڑوں کا فیصلہ فلبی کو جا کر سنا دو!"

زلیفو کوئی جواب دیے بغیر کمرے سے باہر نکل گئی۔

زلیفو نے اپنے بڑوں کا فیصلہ مکان سے ملحق، پیچھے باغ میں فلبی کو لے جا کر سنا دیا۔ فلبی پر اِس فیصلے کا اتنا بُرا اثر نہیں ہوا، جس کی زلیفو امید کر رہی تھی۔ اس نے افسوس سے پوچھا: "کیا تمھیں اِس فیصلے سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی؟"

فلبی نے جواب دیا: "پہنچی کیوں نہیں لیکن میں اسے جھیل یوں گیا کہ میں اس کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا!"

زلیفو نے حیرت سے پوچھا: "کیا مطلب؟ کیا تم ہمارے بڑوں کے اِس فیصلے سے قبل از وقت ہی آگاہ ہو گئے تھے؟"

"ہاں!" فلبی نے جواب دیا: "تم لوگوں میں بچپن سے رہ رہا ہوں، تمھاری قوم کے مزاج اور طبیعت سے اتنا واقف تو ہو ہی گیا ہوں کہ بہت سی باتیں وقت سے پہلے جان جاتا ہوں!"

زلیفو نے پوچھا: "اب کیا ہوگا؟"

"وہی جو تمھارے بڑے چاہتے ہیں!"

"لیکن میں نے تو ان سے یہ کہہ دیا ہے کہ میں بیرسا کے بڑوں کا فیصلہ اس شرط پر قبول کروں گی کہ وہ بھی میری ذاتی زندگی میں آیندہ کسی جبر سے کام نہ لیں!" اس کے بعد آہستہ سے گردن جھکا کے کہا: "کیونکہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ زندگی بھر کنواری رہوں گی اور کسی فنیقی نوجوان یا مرد کو اپنا شوہر نہ بناؤں گی!"

فلبی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ زلیفو کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ تھوڑی دیر بعد قدموں میں پڑے ہوئے خشک پتوں پر کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ زلیفو نے سر اُٹھا کے فلبی کی طرف دیکھا وہ آنسو بہا رہا تھا اور آنسوؤں کے قطرات خشک پتوں پر گر گر کے ہلکا سا شور کر رہے تھے۔

"تم رو رہے ہو؟ مرد ہو کر رو رہے ہو!" زلیفو نے کُرتے کے دامن سے اس کے آنسو خشک کرنے کی کوشش کی اور کہنے لگی: "رونے کا کام مجھ پر چھوڑ دو، میں رو لوں گی۔ اگر تم ہمارے بڑوں کے اس فیصلے کے خلاف کوئی بڑا عملی قدم اُٹھا سکتے ہو تو ہمت کرو میں تمھارا ساتھ دوں گی!"

فلبی نے جواب دیا: "یہاں سے پنارس بہت دور ہے اور درمیان میں سمندر حائل ہے۔ اگر پنارس تک پہنچنے کا کوئی بری راستہ ہوتا تو میں تمھیں دُنیا کے آخری سرے تک لیے چلا جاتا!"

زلیفو نے کہا: "کوئی جلدی نہیں ہے، پانچ سالوں کے دوران تم اس مسئلے پر آزادی سے سوچتے رہو اور جب کسی اُمید افزا نتیجے پر پہنچ جاؤ تو اس سے مجھے مطلع کر دو، میں اس منصوبے میں تمھارا ساتھ دوں گی!"

فلبی نے بے دلی اور مایوسی سے کہا: "میں کوشش کروں گا۔"

زلیفو سے جُدا ہو کر فلبی اُس جگہ پہنچا جہاں پنارسی بوڑھا دو حصّوں میں تقسیم ہو کر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کے جسم کے منتشر اعضا اس وقت بھی اِدھر اُدھر پڑے ہوئے تھے۔ گوشت مردار خور پرندے چٹ کر گئے تھے۔ تھوڑی بہت ہڈیاں اور سر اَب بھی موجود تھا۔ اس نے انھیں یکجا کیا اور پھر ایک گڑھا تلاش کر کے انھیں اس میں ڈال دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر گھر واپس آیا اور رات کی تاریکی میں ایک بار پھر وہیں پہنچ گیا۔ اس نے اپنے کاندھے پر لپٹی ہوئی چادر میں ایک چراغ، ایک کوزہ، ایک قاب اور کھانے پینے کے چند دوسرے برتن چھپا رکھے تھے۔ فنیقیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ مُردے بھی انھی کی طرح زندگی گزارتے ہیں اور انھیں بھی ان ضروری چیزوں کی ضرورت رہتی ہے۔

فلبی نے یہ چیزیں بوڑھے کے سر اور ہڈیوں کے پاس رکھ دیں اور مؤدب کھڑے ہو کر عرض کیا: "میرے معزز ہم وطن بزرگ! میں شرمندہ ہوں کہ تمھیں اتنے دنوں تک ان ضروری اشیا کے بغیر دن گزارنے پڑے۔ تمھیں یقیناً پریشانی اُٹھانی پڑی ہوگی لیکن تم میری بات کا یقین کرو کہ پہلے میں ان رسوم سے واقف نہ تھا، تم میری لغزشیں اور کوتاہیاں معاف کر دینا۔ آیندہ میں تمھارا خیال رکھوں گا!"

اس کے بعد اُس نے تھوڑی دیر کے لیے سکوت اختیار کیا اور گڑھے کی طرف نظریں جمائے رہا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے بوڑھا اس گڑھے سے جھانک رہا ہے۔ فلبی کا دل بھر آیا۔ وہ بھرّائی آواز میں بولا: "میرے محترم ہم وطن بزرگ! تمھیں یہ جان کر یقیناً دُکھ پہنچے گا کہ میں زلیفو کو نہیں حاصل کر سکا کیونکہ مقدس بیرسا کے سُرخ پردوں والے ایوان نے یہ فیصلہ سُنا دیا ہے کہ میں پنارسی ہوں جو روم ہی کا ایک جزیرہ ہے، روم اور فنیقیہ والوں میں ازلی بیر چلا آ رہا ہے، پھر وہ اپنی لڑکی ایک رومی کو کیوں دے دیں!"

پنارسی بوڑھے نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن خوش عقیدہ فلبی یہی سمجھ رہا تھا کہ بوڑھا نہ صرف یہ کہ اس کی باتیں بغور سُن رہا ہے بلکہ وہ اس کا کوئی حل بھی ضرور سوچ رہا ہوگا۔

فلبی نے مزید کہا: "میرے محترم بزرگ! میں تمھارے پاس اس لیے آیا ہوں کہ تم میرے اِس جان لیوا مسئلے کو حل کرو! میں تمھیں ایک بار پھر یہ یقین دلاتا ہوں کہ میں ابھی تک اپنے وطن کو بھولا نہیں ہوں، مجھے اپنی زمین آج بھی اتنی ہی عزیز اور پیاری ہے جتنی خود تمھیں تھی اور مجھے آج بھی اپنے خاندانی قبرستان کی یاد ستاتی رہتی ہے۔ تم نے میرے دل میں وطن کی عظمت اور محبت کا جو چراغ روشن کیا تھا، وہ آج بھی روشن ہے اور مرتے دم تک اسی طرح روشن رہے گا!"

اس کے بعد اس نے اپنے آنسو خشک کیے اور گھر واپس چلا گیا۔

اسپین کے شہر قرطاجنہ میں ہمل کر برقہ کا داماد بھی قتل کر دیا گیا اور وہاں کی قیادت ۲۵، ۲۶ سالہ نوجوان ہینی بال کو منتقل ہو گئی۔ ہینی بال حقیقت میں عینی بعل تھا جس کا مطلب ہے بعل کے لطف و نوازش۔ ہینی بال کی پرورش اور تربیت مخصوص انداز میں ہوئی تھی، وہ بچپنے سے رومیوں کے خلاف جذبوں کی پرورش کر رہا تھا چنانچہ نئے قرطاجنہ کا اقتدار سنبھالتے ہی اس نے اسپین کے ان علاقوں کی تسخیر کا منصوبہ بنا لیا جو یا تو روما کے زیر تسلط تھے یا اس کے حریفوں کے قبضے میں تھے۔ ایک پُرانے معاہدے کی رُو سے شمال میں ابرو ندی کے اُس پار کا علاقہ رومیوں کے زیر تسلط تھا اور ابرو ندی کے اس پار جنوب میں نئے قرطاجنہ تک ہینی بال کا قبضہ تھا۔ اسی طرح شمال کا ساحلی شہر سگنیتم ہینی بال کے برسر اقتدار آنے سے پہلے تک رومیوں کے زیر اثر تھا لیکن پُرجوش اور سرپھرے ہینی بال میں اب اتنا یارا نہ تھا کہ وہ تمام جزائر اور ساحلی شہروں سے دستبردار ہو جائے، وہ ایک مدت سے یہ محسوس کرتا چلا آ رہا تھا کہ رومی حکومت اپنا پنجۂ اقتدار دور تک پھیلاتی چلی جا رہی ہے اور یہ بات کم از کم نوجوان ہینی بال ہرگز برداشت نہ کر سکتا تھا بلکہ وہ تو اس فکر میں تھا کہ رومیوں سے وہ تمام علاقے واپس چھین لے جو اس سے پہلے گنوائے جا چکے ہیں، یہ سوچ کر اس نے ساحلی شہر سگنیتم پر حملہ کر کے زیر کر لیا۔ سگنیتم نے روما سے مدد مانگی لیکن جب تک یہ مدد آئے سگنیتم ہینی بال کے قبضے میں جا چکا تھا اور اس سے بڑی ستم ظریفی یہ ہوئی کہ ہینی بال نے ابرو ندی کی حد بندی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ روم کے عمائدین شہر اس فیصلے سے بہت ناخوش تھے، انھوں نے ایک پانچ رُکنی وفد قرطاجنہ روانہ کیا اور اسے یہ اختیار دیا کہ وہ بے جھجک شاہانہ وقار سے بیرسا کی مقدس چوٹی پر جائے اور وہاں سُرخ پردوں والے دروازوں کے پیچھے بیٹھی ہوئی مجلس کو یہ بتائے کہ اگر ہینی بال اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو روما کو مجبوراً کوئی سخت قدم اُٹھانا پڑے گا۔

روم کا یہ پانچ رُکنی وفد جب قرطاجنہ میں داخل ہوا تو شہر والوں نے اس کا استقبال متضاد جذبوں سے کیا۔ زلیفو کے باپ کو ایک عجیب موقع ہاتھ آ گیا اس نے فلبی سے کہا: "تمھیں ہمارے ساتھ بیرسا کے ایوان میں چلنا ہے۔"

فلبی کو اِن باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس نے وہاں جانے سے انکار کر دیا، کہا: "بیرسا کے ایوان کی وہ مجلس جو میرے خلاف ایک دردناک اور سوہانِ رُوح فیصلہ سُنا چکی ہے اس لائق ہی نہیں کہ اس کے سامنے جایا جائے!"

لیکن زلیفو نے کہا: "فلبی! چلے جانے میں کوئی ہرج نہیں، ہو سکتا ہے وہاں کوئی ایسی صورت پیش آ جائے جس سے ہمارے بڑے اپنا فیصلہ بدل دیں،

اب کیا کرنا ہے میں بھول گیا

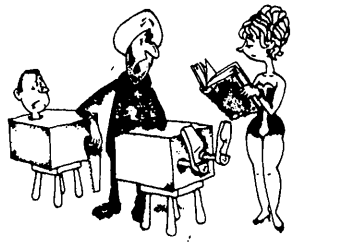

مجھے ایسا لگ رہا ہے، جیسے دیوتا ہم پر مہربان ہو رہے ہیں اور وہ بہت جلد ہمارے دُکھوں کو ختم کر دیں گے!"

فلبی نے بے بسی سے کہا: "زلیفو تم کہتی ہو تو میں تمھارے بڑوں کی مجلس میں چلا جاؤں گا ورنہ وہاں جانے کو میرا جی نہیں چاہتا!"

زلیفو کا باپ فلبی کو اُس ایوان میں لے گیا جہاں قرطاجنہ کی مجلس کے بڑے لوگ روم کے پانچ رُکنی وفد سے مصروفِ گفتگو تھے۔

وفد کے صدر نے قرطاجنی مجلس کے سامنے وہ الزامات دُہرائے جو رومی حکومت نے ہینی بال پر عائد کیے تھے۔ انھوں نے غصّے میں مٹھیاں بھینچ بھینچ کر قرطاجنہ کے بڑوں کو بتایا کہ "ہینی بال ڈاکو کا کردار ادا کر رہا ہے اور اس نے اِن سرحدوں کو توڑ دیا ہے جن کا احترام واجب تھا اور اس نے بعض ایسے قلعوں پر قبضہ کر لیا ہے جو کمزور تھے اور انھیں رومیوں کی حلیفی کا شرف حاصل تھا!"

بیرسا کی مجلس نے رومی وفد کے الزامات بے دلی سے سُنے اور پوچھا "ہمیں یہ بتایا جائے کہ رومی حکومت ہم سے کیا چاہتی ہے؟"

وفد کے صدر نے سوچے سمجھے منصوبے کے ماتحت جواب دیا: "ہمل کر برقہ کے بیٹے ہینی بال اور اس کے آدمیوں کو روما کی حکومت کے حوالے کر دیا جائے!"

بیرسا کی مجلس نے جواب دیا: "نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا!"

رومی وفد کے صدر نے سوال کیا: "کیا ہینی بال کے اقدامات میں قرطاجنہ کے بڑوں کی خواہش یا حکم شامل ہے؟ اور یہ کہ کیا بیرسا کے بڑے لوگ ہینی بال کے اقدامات کو ناجائز نہیں سمجھتے!"

بیرسا کی مجلس کا صدر اپنی جگہ کھڑا ہو گیا اور کہا: "ہینی بال نے جو کچھ کیا وہ ناجائز کس طرح ہے؟ اس نے جن قلعوں پر قبضہ کیا ہے وہ پہلے ہمارے حلیف تھے لیکن جب انھوں نے حلف توڑنے میں پہل کی تو ہینی بال کو اس بات کا پورا حق حاصل ہو گیا کہ ان کی گوشمالی کر دی جائے!"

روما کے وفد کا صدر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

چغے کو سینے پر کس لیا اور کہا: "برسا کے معزز سردارو! میں تمہاری باتوں سے تھک چکا ہوں۔ میں اپنے چغے کی تہ میں جنگ اور صلح کو لپیٹ کر لایا ہوں۔ قرطاجنہ کی قسمت کے مالکو! مجھے جواب دو کہ تم کیا پسند کرتے ہو؟"

قرطاجنی مجلس کا قائد اب بھی کھڑا تھا، اس نے کہا: "کیا میں اپنے ساتھیوں کو ایک طرف لے جا کے مشورے کر سکتا ہوں؟"

روما کا صدرِ وفد مان گیا لیکن جب قرطاجنی مجلس کا قائد اپنی جگہ پر دوبارہ واپس آیا تو اس نے خلافِ توقع جواب دیا: "روما کے معزز نمائندو! اپنے چغے کی تہ میں جو کچھ بھی لپیٹ کر لائے ہو اسے تم اپنی مرضی سے نکال لو!"

رومی وفد کے صدر نے غیر جذباتی آواز میں کہا: "تو پھر جنگ ہے!"

برسا کے بڑوں نے بیک آواز جوش و خروش سے جواب دیا۔

"ہمیں منظور ہے منظور ہے!"

رومی وفد کے صدر نے قرطاجنی مجلس کو نہایت افسوس سے مخاطب کیا: "افسوس کہ تم نے وہ پسند کیا ہے جو بالآخر قرطاجنہ کی تباہی پر ختم ہوگا۔ ہم روما والوں نے جنگ کے دیوتا جانوس کے مندر کو ایک عرصے سے مقفل کر رکھا تھا لیکن اب وہ ہمارے واپس جاتے ہی کھول دیا جائے گا!"

رومی وفد واپس چلا گیا۔ زلفو کا باپ اسی موقع کا منتظر تھا وہ مجلس کے قائد کی طرف بڑھا اور عرض کیا۔

"کیا برسا کے بڑوں کا یہ فیصلہ ہمل کر برقہ کے بیٹے ہینی بال تک پہنچایا جائے گا؟"

مجلس کے قائد نے جواب دیا: "ہاں اسی وقت، ابھی کیونکہ ہمارے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے!"

زلفو کے باپ نے کہا: "تب پھر اس کام کو میرا یہ بیٹا فلبی انجام دے گا اسے دیوتاؤں کی طرف سے ہمت، عقل، استقلال اور دیانت کا جوہر عطا ہوا ہے!"

فلبی نے بے دلی سے جواب دیا: "لیکن خود کو میں اس کا اہل نہیں سمجھتا!"

زلفو کے باپ نے کہا: "یہ تمہارا انکسار ہے!"

مجلس کے قائد نے کہا: "تم اس نوجوان کو خواہ مخواہ مجبور کرتے ہو۔ اس کام کے لیے ہمارے پاس اور بھی لوگ ہیں!"

زلفو کا باپ برسا کے قائد کے پاس پہنچ گیا اور سرگوشی میں کہا۔

"میں اس نوجوان کو اپنی بیٹی زلفو کی نظروں سے اوجھل کر دینا چاہتا ہوں اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ اسے ہینی بال کے پاس بھیج دیا جائے!"

اس کے بعد مجلس نے اپنا یہ فیصلہ بھی سنا دیا کہ فلبی اس وفد کے ساتھ جائے گا جو ہینی بال کو روما والوں کے فیصلے سے آگاہ کرنے کے لیے جانے والا ہے۔ فلبی تو کیا کسی میں بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ قرطاجنہ کے بڑوں کے فیصلے سے روگردانی کر سکتا۔

فلبی وہاں تو کچھ بھی نہ بولا لیکن گھر آ کے شدید غم و غصے کا اظہار کیا۔ اس نے کہا: "میں خوب جانتا ہوں کہ مجھے قرطاجنہ سے دور کیوں بھیجا جا رہا ہے لیکن اب میرے لیے یہ بالکل ناقابلِ برداشت ہے کہ میں برسا کے بڑوں کے ہر اذیت ناک اور سوہانِ روح فیصلے کے آگے سر جھکاتا چلا جاؤں۔ ان سوہانِ روح فیصلوں کا میں انتقام لوں گا، بھیانک اور اذیت ناک انتقام!"

زلفو کے باپ نے نرمی سے کہا: "روما والوں نے ہمارے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا ہے، یہ بہترین موقع ہے کہ تم قرطاجنہ کو عملاً اپنی وفاداری کا یقین دلاؤ۔ مقدس برسا کے بڑوں کا فیصلہ ایسا نہیں ہے جو بدلا نہ جا سکے، ہو سکتا ہے کل وہ تم سے خوش ہو کر ہمیں اجازت دے دیں کہ زلفو کو تمہارے حوالے کر دیا جائے!"

فلبی نے جواب دیا: "اب مجھے کسی بات کا یقین نہیں رہا!"

اس کے بعد جانے سے پہلے وہ زلفو سے ملا اور کہا: "زلفو! میں قرطاجنی وفد کے ساتھ ہینی بال کے پاس جا رہا ہوں!"

"جاؤ!" زلفو نے اس طرح جواب دیا گویا وہ کچھ اور سوچ رہی ہو، پھر پوچھا: "واپسی کب تک ہوگی؟"

اس نے جواب دیا: "کچھ پتہ نہیں، مجھے یہ بھی یقین نہیں کہ ہینی بال تک پہنچتے پہنچتے میں زندہ بھی رہوں گا یا نہیں کیونکہ تم سب کی قومی عصبیت ان حالات میں مجھے زندہ نہیں دیکھنا چاہتی!"

"ایسی باتیں مت کرو!" زلفو نے ناگواری سے کہا: "آخر تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ میں بھی اسی قوم سے تعلق رکھتی ہوں اور میں تم سے اتنی محبت کرتی ہوں جتنی ایک وہ پرستار اپنے دیوتا سے کرتا ہے جو بالآخر دیوتا کی قربان گاہ پر اپنی جان قربان کر دیتا ہے!"

فلبی نے جواب دیا: "کیا پتہ؟"

زلفو تلملا گئی، اٹھ کر کھڑی ہو گئی، شدید جذبات میں تنفس تیز ہو گیا اور جسم تھر تھرانے لگا۔ بولی: "تم میری محبت پر یقین نہیں رکھتے؟ یہ سب کچھ ڈھونگ ہے؟ میں نے اپنی یہ حالت جو بنا رکھی ہے اس میں جھوٹ اور ریاکاری کارفرما ہے؟ میں نے عمر بھر کنواری رہنے کا عہد جو کیا ہے تو کیا میں اس سے پھر جانے کا ارادہ کر چکی ہوں!" یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

فلبی پتھر کی طرح ساکت کھڑا رہا۔

زلفو نے اچانک اس کو شانوں سے پکڑ لیا اور جھنجھوڑتی ہوئی بولی: "اگر میں جھوٹی ہوں تو مجھے صحت و تندرستی کا دیوتا ایشمون اپنی نعمتوں سے محروم کر دے اور میں اپاہج اور معذور ہو جاؤں، یہ میری بدقسمتی ہی تو ہے کہ میں جس کی وجہ سے ان حالوں پہنچی، وہی مجھ پر اعتبار نہیں کر رہا، کیا تم کسی ایسے نوجوان کا نام بتا سکتے ہو جس نے اتنی قربت حاصل کی ہو اور میں نے اس کے سامنے لطف و محبت کے دو جملے بھی ادا کیے ہوں!"

فلبی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ زلفو کہتی رہی: "بہرحال تم اب واپس آؤ یا نہ آؤ، مجھے کوئی پروا نہیں، میں نے جو عہد کیا ہے مرتے دم تک اس پر قائم رہوں گی!" اس کے بعد وہ رونے لگی، اس نے فلبی کے شانے چھوڑ دیے اور گھٹنوں میں سر دے کے سسکیاں بھرنے لگی: "اے مقدس برسا کے دیوتا! کیا تم نے محبت اور سچائی کو اس دنیا سے اٹھا لیا ہے؟ آخر یہ کیسی دنیا ہے جہاں محبت کی کوئی قدر نہیں، اس محبت اور خلوص سے محروم دنیا میں، میں خود کو اکیلی اور تنہا محسوس کر رہی ہوں، دیوتاؤ! مجھ پر رحم کرو اور مجھے اپنے پاس بلا لو!"

بے حس فلبی کھڑا اسے دیکھتا اور اس کی باتیں سنتا رہا اور آخر اسے اسی حالت میں چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد زلفو اٹھی اور کھوئی کھوئی برسا کی چوٹی پر تانیت دیوی کے مندر میں چلی گئی، تانیت دیوی جو ہندوستوں میں دھرتی ماتا کہلاتی ہے، وہ تانیت دیوی کے قدموں میں لیٹ گئی اور آنسو بہا کے درخواست کی: "دیوی! مجھے اپنی آغوش میں چھپا لو، میں غموں سے تنگ آ گئی ہوں، تیرے بیٹوں نے میرے دل کو طعن و تشنیع اور دل آزار برتاؤ سے چھلنی کر دیا ہے!"

فلبی قرطاجنی وفد کے ساتھ ہینی بال کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے زلفو کے رویے میں پہلی بار یہ تبدیلی محسوس کی کہ وہ ساحل سمندر پر اسے الوداع کہنے نہیں آئی، زلفو کی محبت پر شک کر کے فلبی نے اس کا دل دکھایا تھا۔ زلفو نے اس کے خلاف خاموش احتجاج کیا تھا ورنہ اس کا دل اپنے اس رویے پر خون کے آنسو رو رہا تھا۔

قرطاجنی وفد کو ہینی بال کے پاس فوراً ہی پہنچا دیا گیا۔ اس وقت وہ مِل کرت دیوتا کی سیڑھیوں پر کھڑا تھا، دراز قامت، کاندھے پر سیاہ شال پڑی ہوئی تھی، چوڑی اور گندمی پیشانی کے نیچے پُرعزم آنکھوں میں ایک خاص چمک پائی جاتی تھی۔ بال گھونگھریالے اور داڑھی چھوٹی تھی، کاندھے ذرا جھکے ہوئے تھے۔ قرطاجنہ کے بڑوں کا فیصلہ اس کے حوالے کر دیا گیا۔ اس نے مندر کی سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے اس فیصلے کو پڑھا اور وفد کو جواب دیا۔

"میں اس فیصلے کو خوش آمدید کہتا ہوں، اب وقت آ گیا ہے کہ اہلِ قرطاجنہ روما کی سیاسی اور فوجی برتری کو خاک میں ملا دیں!"

والٹیر نے طریقِ تعلیم کی مذمت کرتے ہوئے کہا: "ایسا طریقِ تعلیم کس مصرف کا جو لڑکوں کو روزی کمانا تو سکھا دیتا ہے لیکن انھیں بہترین طریقے سے زندگی بسر کرنے کا علم نہیں سکھاتا۔"

اس نے وفد کو چند دنوں کے لیے اپنے پاس روک لیا۔ فلبی نے ہینی بال میں کچھ ایسی غیر معمولی صلاحیتیں دیکھیں کہ وہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ہینی بال روما پر ایک غیر معمولی اور فیصلہ کن ضرب لگانے کا بہت پہلے تہیہ کر چکا تھا، چنانچہ اس کی فوج میں اسپین، فرانس، افریقہ جیسے دور دراز علاقوں کے سپاہی ایک ہی صف میں کھڑے تھے اور ان میں اتحاد تھا۔ ہینی بال نے ان کے دلوں کو اپنی مٹھی میں لے رکھا تھا۔ ان میں غلام بھی تھے اور آزاد بھی اور ان دونوں میں امتیاز نہیں برتا گیا تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ یہاں اسے زلفو کی یاد بہت کم آتی تھی، چنانچہ جب ہینی بال نے قرطاجنی وفد سے یہ سوال کیا کہ: "وفد کا کون رکن واپس جانا چاہتا ہے اور کون یہاں رکنا چاہتا ہے؟"

تو فلبی کا نام رکنے والوں میں شامل ہو چکا تھا۔

ہینی بال کو جب یہ معلوم ہوا کہ فلبی پنارمس سے تعلق رکھتا ہے تو اس نے فلبی سے وفاداری کا سخت عہد لیا۔ اس نے فلبی کو مِل کرت دیوتا کے سامنے کھڑا کر کے حکم دیا کہ: "اپنے سیدھے ہاتھ میں شگاف لگا کے خون بہاؤ اور قسم کھاؤ کہ تم سازش یا غداری کے مرتکب نہیں ہو گے!"

یہ عہد فلبی ہی سے نہیں، بعض اور لوگوں سے بھی لیا جا رہا تھا۔ فلبی نے شانے سے ذرا نیچے ہاتھ کی مچھلی میں شگاف دیا اور خون کے چند چھینٹے مِل کرت دیوتا کے قدموں میں چھڑک دیے اور ہینی بال کے حلفیہ کلمات ادا کر دیے۔

صبح طلوعِ آفتاب کے بعد ہینی بال اپنی سپاہ کا جائزہ لینے نکلا، جب وہ فلبی کے قریب پہنچا تو اس نے اہلِ قرطاجنہ کے وہ مظالم جو اس کی روح پر ڈھائے گئے تھے ہینی بال کے گوش گزار کیے اور کہا: "برقہ خاندان کے عظیم سردار! میں زخم خوردہ انسان اپنی وفاداریوں کے عوض یہ چاہوں گا کہ میرے دل پر قرطاجنہ کے بڑوں نے جو گھاؤ لگائے ہیں، ان کا حسنِ سلوک سے اندمال کر دیا جائے!"

ہینی بال نے کوئی خاص اثر لیے بغیر جواب دیا: "اپنی وفاداریوں کا تم کس منہ سے معاوضہ طلب کر رہے ہو، یہ گستاخی ہے، تم نے اپنی جان ہمارے عزائم کے ہاتھ بیچ دی ہے، اب یہ ہماری مرضی پر موقوف ہے کہ اس کا کیا اور کس طرح اپنی مرضی سے معاوضہ دیں اور اس کی صحیح قیمت اس وقت متعین ہوگی جب تم واقعی اپنی وفاداریاں ثابت کر چکے ہو گے ورنہ ابھی تو تم ایک

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

عام اور معمولی انسان ہو عشق زدہ ایک نوجوان حسینہ کی زلف گرہ گیر کے اسیر اور میری نظر میں عشق کرنا کوئی قابلِ تحسین یا لائقِ عزت کارنامہ نہیں ہے۔ سبھی نوجوان کرتے ہیں!"

قلبی اس تیز دل نوجوان سے خوف زدہ ہو گیا۔ ہینی بال کہتا رہا۔

"سپاہیوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ملک گیری اور کشور کشائی کے علاوہ کسی کام میں دلچسپی لیں، اسی سے وہ خود کو اور اپنی قوم کو سر بلند رکھ سکتے ہیں، تجارت، صنعت، سیاست، مذہب سبھی اس کے تابع ہیں، طاقت، تلوار اور ہتھیار، عزت اور کامیابی کی کنجی ہیں، عورت کا عشق تو ایک سطحی اور سفل جذبہ ہے، اس ابال کی طرح جو ہانڈی میں تھوڑی دیر کے لیے آتا ہے، اس بلبلے کی طرح جو سطحِ آب پر ذرا سی دیر کے لیے نمودار ہو کر غائب ہو جاتا ہے!"

اس کے بعد اس نے اپنی سپاہ کو مخاطب کیا اور اس کو بتایا کہ "دیکھو ہم عنقریب روما میں داخل ہو جائیں گے، ایک فاتح اور کشور کشا کی حیثیت سے، وہاں گداز جسم اور تیکھے نقوش والی غزال صفت عورتیں تمھارے دلوں پر چھاپے ماریں گی، خبردار جو تم نے ان عورتوں کے ہاتھوں مفتوح ہونا پسند کیا، اگر تم نے ایسا کیا تو لوگ تم پر ہنسیں گے اور کہیں گے کہ تم کتنے بے وقوف انسان ہو کہ روما کے مردوں کو تو فتح کر لیا لیکن ان کی عورتوں کے ہاتھوں مفتوح ہو گئے، یہ وہ ذلیل ترین داغِ رسوائی ہے جو کسی مرد کی درخشاں پیشانی پر لگ سکتا ہے!"

ہینی بال کی تقریر اور خیالات نے قلبی کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی وہ زلیفو سے عشق کرتا تھا۔ شدید عشق لیکن ہینی بال کی تقریر کے بعد اسے یہ محسوس ہوا جیسے وہ اب تک عشق نہیں گناہ کرتا رہا ہے، کوئی جرم کرتا رہا ہے۔

ہینی بال نے اپنی تقریر کی صداقت کو عملاً یوں ثابت کیا کہ اس نے اپنی چہیتی بیوی املکہ اور چھوٹے سے بچے کو افریقی قرطاجنہ روانہ کر دیا، جس جہاز پر اس کا خاندان قرطاجنہ کے لیے روانہ ہوا تھا، ہینی بال اس کا نظارہ ایک ساحلی دیدبان سے کرتا رہا۔

قلبی کے لیے یہ دنیا عجیب تھی، طاقت ور اور عظیم شخصیت کس طرح کمزور شخصیتوں کو مغلوب کر لیتی ہے، اس کی بہترین مثال ہینی بال اور اس کے آس پاس کے ماحول میں موجود تھی، یہاں ذہین لوگ بھی موجود تھے اور کوڑھ مغز بہادر بھی، یہاں فرماں برداروں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی اور سرکشوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی، اور ان سب پر ہینی بال کی شخصیت حاوی تھی، نئے قرطاجنہ کی سڑکیں بھری رہتیں، چاروں طرف سے فوجی آئے چلے جا رہے تھے۔

افریقہ کے نومدی اپنی مخصوص وضع میں دور ہی سے پہچانے جاتے، یہ بغیر لگام کے گھوڑوں پر سوار، ہاتھی کی کھال کی ڈھالیں اپنی پشت پر ڈالے سانگ (چھوٹی برچھی) اور چھروں سے لیس گردنیں ٹیڑھی کیے یوں گزر جاتے۔ گویا دنیا کی شجاعت اور بے جگری ان پر ختم ہو گئی ہے، یہ نومدی بے لگام گھڑ سواری میں جنگ کے دوران اپنے حریف پر سبقت لے جاتے کیونکہ ان کے حریف کا ایک ہاتھ تو گھوڑے کی لگام پکڑے ہوتا اور دوسرے ہاتھ سے وہ مقابلہ کرتے لیکن یہ سرفروش نومدی دونوں ہاتھوں سے جنگ کرتے اس لیے کہ یہ بے لگام گھوڑوں پر سوار ہونے کی وجہ سے دونوں ہاتھ خالی رکھتے تھے، ان کی سانگ (چھوٹی برچھی) کی مار بہت مشہور تھی یہ اپنے حریف کو سانگ کھینچ کر مارتے تھے جو اس کی زرہ توڑ کر جسم میں داخل ہو جاتی تھی، اس سانگ کے علاوہ فلاخنوں میں سیسے کی گولیاں رکھ کر بھی چلاتے تھے اور یہ گولیاں بھی اکثر زرہ توڑ کر جسم میں پیوست ہو جاتی تھیں، اسپین کے ریبیری بھی اپنے جھنڈوں سے پہچانے جاتے تھے۔ کرنوں والا سورج اور ہلال ان کے جھنڈوں کے امتیازی نشان تھے، اسی طرح قلط بیری تھے جو حرمی کنٹوپوں میں منہ چھپائے اور بڑے بڑے برچھے سنبھالے ایک اندازِ سرکشی سے آگے بڑھ جاتے، ان کے کنٹوپ میں لوہے کی کڑیاں لگی ہوتیں جو میدانِ جنگ میں بڑا بچاؤ کرتی تھیں، ان میں قلطی بھی شامل تھے جو اپنی خمیدہ تلواروں اور فولادی لٹھ کی وجہ سے دور ہی سے پہچانے جاتے تھے، ان میں عالی خاندان لوگ بھی شامل تھے یہ گُل بوٹوں کی سرخ قبائیں پہنے اپنے گھوڑے اچکاتے ادھر ادھر بھاگتے نظر آتے۔

یہ سب پچاس ہزار تھے، ان میں چالیس ہاتھی تھے۔ ہینی بال اپنے لشکر کے ساتھ ابرو ندی کی طرف بڑھا، یہ وہی ندی ہے جس کی بابت روما کی حکومت بڑی فکر مند رہتی تھی اور اس نے افریقی قرطاجنہ کے بڑوں سے یہ معاہدہ کر رکھا تھا کہ ابرو ندی کے شمالی ساحل سے روما والوں کے اقتدار کی حد شروع ہو جاتی ہے اور ہینی بال کی حد و اس کے جنوبی کنارے تک تھی، یہ اور یہ معاہدہ ہوا تھا کہ ہینی بال کی افواج روما کی مرضی کے بغیر ان حدود کی خلاف ورزی نہیں کریں گی، ہینی بال اپنا پنج رنگی لشکر لے کر ابرو ندی کی طرف بڑھا اور ابرو ندی کے اس پار اتر گیا۔ اس نے ہنستے ہوئے زیرِ لب کہا "خوب! معاہدہ تو یہ تھا کہ ہم افریقی اپنے ہتھیاروں کے ساتھ ابرو ندی نہیں پار کریں گے لیکن آج میں اپنی پچاس ہزار سپاہ اور چالیس ہاتھیوں کے ساتھ دوسرے کنارے پر اتر چکا ہوں، روما والو! آؤ دیکھو، یہ میں نے کیا کر دیا!"

ہینی بال کے سپاہی ابھی تک اس کے عزائم سے پوری طرح باخبر نہ تھے، انھیں تو بس اتنا معلوم تھا کہ ہینی بال روما پر حملہ کرنے جا رہا ہے لیکن یہ حملہ روما پر کس سمت سے کیا جائے گا، ابھی تک کسی کو بھی نہیں معلوم تھا۔

ابرو ندی کے اس پار وہ الربحت کی پہاڑیوں میں داخل ہو گیا۔ یہاں کے بہادر لوگ اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے لیکن ہینی بال عظیم رومن امپائر کی

بربادی کا ارادہ لے کر چلا تھا۔ الربحت کے پہاڑی بہادر اس کے ایک ہی ریلے میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے اور شکست اٹھانے کے بعد بہتوں نے اس کی فوج میں نوکری کر لی۔

ابرو ندی سے پائی رین کے دروں کا فاصلہ ایک سو اسّی میل تھا اور یہ فاصلہ چھ دن میں طے کیا جا سکتا تھا لیکن ہینی بال اپنے لشکر کے ساتھ جن دنوں یہ فاصلہ طے کر رہا تھا موسم بہت خراب تھا اور قدم قدم پر موسم کی مزاحمت نے چھ دن کا سفر تین مہینوں میں پورا کرایا تھا۔ اگر اس کے سپاہیوں کو یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ آہستہ آہستہ الپس کے اس کوہستانی سلسلے کی طرف بڑھ رہا ہے جس کے دوسری طرف جنوب میں روماسینہ تانے کھڑا ہے۔

اس سفر کی سب سے عجیب کیفیت یہ تھی کہ ہینی بال یہ دشوار گزار سفر سردیوں سے پہلے پہلے ختم کر لینا چاہتا تھا۔ پائی رین میں قلطیوں نے راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن انھیں بھی پسپا ہونا پڑا، یہ قلطیوں کی آبادی تھی ہینی بال راہ کی مشکلات پر قابو پاتا ہوا الپس کے کوہستان میں داخل ہو گیا، وہ جن علاقوں سے بھی گزرا دولت اور عورت کی بہتات دیکھی لیکن ہینی بال نے اپنی فوج کو خراب نہیں ہونے دیا اور یہی کہتا رہا "بہادرو! ان معمولی لوگوں پر اپنی قوت ضائع کرنے سے فائدہ؟ روما کی تسخیر کے بعد یہ لوگ خود بخود اطاعت قبول کر لیں گے، اس وقت تم لوگ آزاد اور خود مختار ہو گے اور جی بھر کے عیش کر لینا لیکن ابھی میں اس کی اجازت نہیں دوں گا!"

پائی رین کے دشوار گزار دروں کے ساتھ ہی الپس کا سلسلہ راستہ روک کے کھڑا ہو گیا اور فوجیوں کے حوصلے پست ہونے لگے۔ اس نے مذبذب اور کم ہمت سپاہیوں کے چہرے پر خوف کا ہلکا سا سایہ محسوس کیا۔

اس نے اپنی پوری فوج کو مخاطب کیا اور کہا "میں نے اپنے بہت سے سپاہیوں کے چہرے پر فکر اور تردد کی سیاہیاں محسوس کی ہیں، کیا تم لوگوں نے یہی طے کر لیا ہے کہ روما والوں کے سامنے روسیاہ پہنچو، ممکن ہے تمھیں اپنی عزت کا پاس نہ ہو لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا اور میں اپنی فوج کے سیاہ چہرے والوں سے چند سوال کرنا چاہتا ہوں!"

ایک اسپینی نے سوال کیا "پہلے ہمیں یہ بتاؤ کہ تم ہمیں لیے کہاں جا رہے ہو؟"

ہینی بال زور سے ہنسنے لگا، بولا "سمجھا، سمجھا، تو یہ بات ہے" پھر سنجیدگی سے سوال کیا "کیا میں نے تمھیں اپنے عزائم سے مطلع نہیں کر دیا تھا، میں روما والوں کو ایک ایسا سبق دینے جا رہا ہوں جسے وہ ہمیشہ یاد رکھیں گے!"

"ہمیں یہ تو معلوم ہے!" ایک اسپینی سردار نے کہا "لیکن اب ہم زیادہ دور نہیں جا سکتے؟"

ہینی بال نے کہا "تم بزدل ہو، جنگ سے ڈرتے ہو!"

کئی سال کا قرض واجب الادا چلا آ رہا تھا، آخر تنگ آ کر اس نے تقاضا ہی بند کر دیا اور قرض دار نے خاموشی اختیار کر لی لیکن ایک دن چڑ کر اپنے مقروض کو چند سطریں لکھ ہی ڈالیں اس نے خط میں لکھا تھا:

"مسلسل تین سال کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نصف قرض معاف کر دوں! براہِ کرم بقیہ نصف تو ادا فرما دیں!"

مقروض نے اطمینان سے جواب میں لکھ دیا "بہت بہت شکریہ کہ تین سال بعد میرے ذمے واجب الادا قرض کا نصف آپ نے معاف فرما دیا، میں بقیہ کے لیے تین سال اور گزارنے کی کوشش کروں گا۔"

اسپینی سردار نے جواب دیا "نہیں ایسی کوئی بات نہیں، ہم لڑائی سے بالکل نہیں ڈرتے مگر ہم نامعلوم پہاڑوں میں جانا بھی پسند نہیں کرتے کیونکہ ہم اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ ان نامعلوم پہاڑوں میں اجنبی دیوی دیوتا مسلط ہیں۔ ہمیں اپنا وطن عزیز ہے، اپنے وطن کے میدان پیارے ہیں، ہم آگے نہیں جانا چاہتے!"

قلبی کو اپنا بوڑھا یاد آ گیا، وہ بھی اسی طرح وطن کی رٹ لگائے رہتا تھا۔ اسی دوران اسے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ ہینی بال اپنا لشکر ہاتھیوں سمیت الپس کے اس پار لے جانا چاہتا ہے، اس کے سامنے حدِ نظر تک سفید پوش پہاڑوں کا پیچ در پیچ اور کوہان در کوہان سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔

ہینی بال نے اسپینی سرداروں سے سوال کیا "تم کیا چاہتے ہو؟"

اسپینی سرداروں نے بیک آواز جواب دیا "اپنے وطن واپس جانا چاہتے ہیں!"

"بہتر ہے!" ہینی بال نے اسپینی سرداروں کا فیصلہ خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔ اس نے باوقار انداز میں مزید کہا "جو لوگ واپس جانا چاہتے ہیں میں انھیں واپس جانے کی اجازت دیتا ہوں لیکن جو لوگ میرا ساتھ دینا چاہتے ہیں انھیں آفرین کہتا ہوں اور انھیں یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مرنا جینا انھی کے ساتھ ہو گا!"

ہینی بال کی طرف سے اجازت ملتے ہی سات ہزار اسپینی فوج سے الگ ہو گئے، قلبی کے جی میں آئی کہ وہ بھی انھی کے ساتھ ہو لے لیکن یہ اسپینی

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

تھے اور اسپین اس کا وطن نہیں تھا۔

واپس جانے والوں نے دوسرے فوجیوں میں بددلی اور مایوسی پھیلا دی تھی، جب یہ لوگ دریائے رہون کے اُس پار پہنچے اور ایلپس کے بلند ترین سلسلوں پر نظر ڈالی تو بہت زیادہ گھبرا گئے۔ ہینی بال ان پر گہری نظریں رکھے ہوئے تھا اور وہ انھیں نفسیاتی طریقوں سے قابو میں رکھنے کا قطعی فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے ان پریشان حال بدحواسوں کو اپنے روبرو طلب کیا اور کہا "میں دیکھ رہا ہوں کہ بعضوں کے چہرے کی سیاہیاں گہری ہوتی جا رہی ہیں، آخر اس کا کوئی خاص مطلب ہے؟"

کسی سپاہی نے بدقت تمام عرض کیا "میں نے نہایت غور سے آسمان اور پہاڑی سلسلوں کو دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہی وہ بلند و بالا پہاڑ ہیں جن کی چوٹیاں نظر نہیں آتیں اور جن کی بابت عقلمندوں نے کہا ہے کہ یہ نیلے آسمان تک بلند ہیں!"

کسی دوسرے سپاہی نے کہا "یقیناً ان بلند و بالا پہاڑوں نے ہمارا راستہ روک لیا ہے اور دوسری آفت یہ ہے کہ یہاں پھسلن بہت زیادہ ہے۔ مرطوب جنگل، ہوا کی وجہ سے کپڑے سکھانا یا بدن گرم رکھنا ناممکن ہے لوگ کہتے ہیں کہ اس کی بلندیاں، دیوتاؤں کے دیس تک چلی گئی ہیں!"

ہینی بال نے بے رُخی سے جواب دیا "ہو سکتا ہے تمھارا خیال درست ہو لیکن میں یہ جاننے کے بعد کہ ان پہاڑوں کی بلندیاں دیوتاؤں کے دیس تک چلی گئی ہیں، انھیں پار کرنے کا شرف حاصل کیے بغیر واپس نہ جاؤں گا!"

اس کے بعد وہ ایک مقامی سردار کو پکڑ لایا اور ان شاکی اور تھڑدلوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ جوش میں بولا "معزز دوستو! میں تمھارے روبرو کھڑا ہوں اور اپنے ساتھ ایک ایسے سردار کو بھی لایا ہوں جو ان پہاڑیوں کو کئی بار عبور کر چکا ہے ذرا اس کی بات تو سنو، دیکھو یہ کیا کہتا ہے؟"

یہ مسلح سوار صفوں میں سے نکلا اور ہینی بال کی طرف بڑھنے لگا پھر اس کے قریب پہنچ کر کھڑا ہو گیا، ایک نظر مجمع پر ڈالی اور کہنے لگا "میرے خوف زدہ اور ہراساں ساتھیو! میں دیوتاؤں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اسے میں کئی بار عبور کر چکا ہوں یہاں کوئی دیوتا نہیں، ہاں راستے البتہ ہیں اور ان راستوں پر کوئی بھی چل سکتا ہے!"

اس کے بعد ہینی بال مخاطب ہوا "میں کہتا ہوں تم لوگ خیالی اندیشوں میں مت پڑو اور حقیقت سمجھنے کی کوشش کرو، یہ ایلپس جسے تم یقیناً عبور کرو گے بس یہ ذرا اونچا پہاڑ ہے لیکن تم یقین کرو کہ یہ پہاڑ آسمان نہیں چھوتے، جب تم ان پر سے گزر رہے ہو گے تو یہ دلچسپ منظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ ان میں آباد قبائلی خاندان کھیتی باڑی کر رہے ہوں گے!"

اِدھر ہینی بال ایلپس کو عبور کرنے کی کوشش میں تھا دوسری طرف روما والے اس کی آمد سے خبردار ہو چکے تھے اور ان کا وہ لشکر جو پانچ رکنی وفد کے اعلانِ جنگ کے بعد قرطاجنہ جانے والا تھا روک لیا گیا تھا کیونکہ ہینی بال بلائے آسمانی کی طرح ان کے سروں پر منڈلانے ہی والا تھا۔

ہینی بال ایلپس میں داخل ہو گیا، یہاں جگہ جگہ ندیوں کا جال سا بچھا ہوا تھا۔ اس عظیم لشکر میں ملبی کی حیثیت ایک جھنگے جیسی تھی اور اسے صاف نظر آ رہا تھا کہ اب وہ نہ تو وطن واپس جا سکے گا نہ قرطاجنہ یا اسپین اور اسے یہ یقین بھی نہ تھا کہ وہ روما کی کسی جنگ میں شرکت کر سکے گا لیکن اسے یہ یقین ضرور تھا کہ وہ ایلپس کو عبور کرتا ہوا کہیں بھی کسی کھڈ میں غائب ہو جائے گا۔

ہینی بال نے بہت سارے آدمیوں کو برف توڑنے اور کھڈوں کو قابلِ عبور بنانے کے لیے بڑے بڑے پتھروں سے پاٹنے کے کام پر مامور کیا۔ یہ ایک کھڈ پاٹتے تو دوسرا سامنے آ جاتا، اسی طرح چٹانیں بھی حائل ہو رہی تھیں، ایک کے بعد ایک۔ یہ انھیں نہایت مشکلوں سے عبور کرتا بڑھا چلا جا رہا تھا۔ اس کا ہر قدم ایلپس کی رکاوٹیں روک رہی تھیں، ہاتھی نہایت احتیاط سے آگے بڑھتے اور جب ایک بار اپنا توازن کھو بیٹھتے تو دوبارہ وہ کہیں نظر نہ آتے، کسی کھڈ میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتے۔ گرتے ہوئے ہاتھی کی چنگھاڑ سے پہاڑی چٹانیں گونج اٹھتیں اور سپاہ کے دلوں میں زلزلہ سا آ جاتا۔ باربردار گاڑیاں بھی حرکت میں تھیں، یہ لوگ ایلپس کی بلندی پر جا رہے تھے۔ سپاہ اِدھر اُدھر منتشر ہو چکی تھی اور مختلف سمتوں سے اوپر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسی عالم میں انھیں طوفانِ باد و باراں

شاعرِ اعظم عبدالعزیز خالد کے شعری کارنامے
پروازِ عقاب (زندان نامہ) ہوچی منہ
سلومی
آئینۂ ادب انارکلی لاہور

کا مقابلہ کرنا پڑا اور کتنے ہی لشکری راستے کی صعوبتوں کا مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے ایلپس کی گہرائیوں میں ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گئے۔

اس پُرصعوبت سفر کے نویں دن ہینی بال پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا اور وہاں اپنے ان ساتھیوں کا انتظار کرنے لگا جو دوسرے راستوں سے اُوپر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے، یہاں وہ دو دن مقیم رہا، اس عرصے میں دوسرے لوگ بھی وہاں پہنچ گئے۔ برف اور طوفانِ باد و باراں نے بہتوں کو بیمار ڈال دیا اور ان میں سے اکثر اُوپر پہنچتے پہنچتے مر گئے، سپاہیوں میں سخت بددلی پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں اُنھیں کھانے پینے کی دشواریاں بھی پیش آئیں، جس پہاڑ کی سطح پر وہ پہنچ چکے تھے، اس کے دونوں طرف ایلپس کے سفید حصار کھڑے حیرت سے انھیں دیکھ رہے تھے۔ سپاہیوں میں اب مزید چلنے کا یارا نہ رہا تھا۔ ان کے بدن اکڑ چکے تھے اور بھوک نے اُنھیں نڈھال کر دیا تھا۔ زندگی کی طرف سے مایوسی نے سپاہ میں سرکشی اور سستی پیدا کر دی تھی، ہینی بال کے لیے یہ وقت بہت بُرا تھا۔ اس لیے اپنے نیم مُردہ ساتھیوں کو ہاتھ کے اشارے سے حکم دیا کہ تھوڑی دیر اس کے ساتھ چلنے کی زحمت گوارا کریں۔ اس بار اس نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ وہ اپنے ساتھ انھی لوگوں کو لے کر آگے بڑھے جو سردار ہوں کیونکہ سرداروں میں حوصلہ اور برداشت زیادہ پایا جاتا ہے۔

یہ صبح کا وقت تھا، اس نے پہاڑ کی بلندی سے مشرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اُدھر دیکھو مشرق میں وہاں تمھیں کچھ دکھائی دے رہا ہے؟"

سرداروں نے دُور نیچے کی طرف دیکھا وہاں دھندلے جنگل اور کھیت دکھائی دے رہے تھے۔

ہینی بال نے کہا "یہ روما کے کھیت ہیں!" اس کے بعد اس نے اپنا سیاہ چغہ سینے پر سے ہٹا دیا۔ اس کے ہٹتے ہی تلوار کا مرصع قبضہ صاف نظر آنے لگا۔ اس نے اک شانِ بے نیازی سے کہا "یہ روما کے میدان ہیں اور یہ پہاڑ جہاں ہم اس وقت کھڑے ہیں روما کی فصیلیں ہیں، ہم اپنے دشمن کی فصیلوں پر قابض ہو چکے ہیں، اب نیچے آبادیوں میں حسین عورتیں اور دولت تمھاری منتظر ہیں اور انھیں ہم اسی وقت حاصل کر سکتے ہیں جب ان فصیلوں سے نیچے اُتر جائیں گے!"

سرداروں کے مُردہ چہروں پر رونق آ گئی، عورت، دولت اور شہرت ایلپس کے نیچے دنیا کی ساری نعمتیں ان کی منتظر تھیں۔

ہینی بال نے ان سرداروں کو حکم دیا "جاؤ اور اپنے اپنے سپاہیوں کو بھی خوش خبری سناؤ کیونکہ اس خوش خبری کے بغیر ان کے مُردہ چہروں پر رونق نہیں آئے گی!"

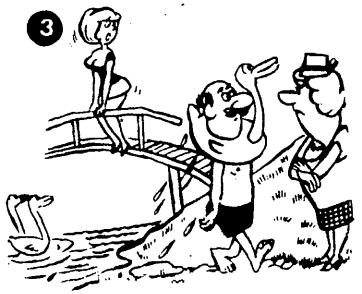

ہینی بال کا یہ پیغام ایک ایک سپاہی تک پہنچ گیا، یہاں تک کہ باربردار اور پہرے دار تک اس خوش خبری سے آشنا ہو چکے تھے۔ راستے کی صعوبتیں اٹھائے بھوک پیاس سے نڈھال اور اپنے وطن سے کئی سو میل دُور ہر سپاہی خوشی سے ایک دوسرے کو یہ بتا رہا تھا کہ "دوستو! سختی کا زمانہ گیا۔ اس وقت ہم روما کی فصیل پر قابض نیچے اُترنے کے منتظر ہیں ہمارے نیچے روما کے شہر ہیں جہاں گوشت، شراب، عورت، دولت، شہرت اور آگ کے الاؤ ہیں، وہاں سونے چاندی کا ڈھیر لگا ہوا ہے اور وہاں کی مہذب عورتیں ہمارا

کہتے ہیں انھیں ساقی گری آتی ہے !''

طوفانِ باد و باراں راستے کی صعوبتیں اور بھوک پیاس کی سختیاں جھیلی ہوئی فوج تازہ دم ہو گئی اس میں زندگی کی حرارت دوڑ گئی۔

دو دن قیام کرنے کے بعد تیسرے دن پہاڑوں سے نیچے اترنے کے لیے فوج حرکت میں آ گئی۔ اُتار چڑھائی سے زیادہ دشوار ثابت ہوا، پہاڑی راستے جگہ جگہ جمی ہوئی برف کے نیچے چھپ گئے تھے، برف کی تہوں میں جمی ہوئی پہاڑوں میں مویشیوں کے لیے چارہ ملنا ناممکن تھا اس لیے بھوک کے جانور اتنے کمزور ہو چکے تھے کہ ہر قدم پر لڑکھڑا کر گر جاتے، کہیں کہیں جب برف کی تپلی تہہ ان مویشیوں کا بوجھ نہ سہار سکتی اور ٹوٹ جاتی تو جانوروں کے پیر ٹوٹی ہوئی برف میں دھنس جاتے اور جانور اس میں پھنس کر اچھا خاصا تماشا بن جاتے اور ہینی بال کے لشکری ان دلچسپ مناظر سے خوش ہونے کے بجائے خوف زدہ اور پریشان ہو جاتے ہینی بال کے فوجی سرداروں کو یہ تشویش تھی کہ اگر پہاڑوں کے نیچے اُترتے ہی ان پر روما والوں نے حملہ کر دیا تو ان کا مقابلہ کس طرح کیا جائے گا لیکن ہینی بال کا چہرہ فکر و تشویش کے تاثرات سے بالکل عاری تھا۔

لشکریوں کی بڑی تعداد برف کے تودے توڑ توڑ کر راستے بنانے میں مصروف تھی، چلتے چلتے یکایک یہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں برف کی تہہ میں چھپا ہوا راستہ ایک دم ختم ہو جاتا تھا اور سامنے ایک بہت بڑی چٹان ان کا راستہ روکے کھڑی تھی، چٹان کے نیچے، وادی میں سرسبز و شاداب جنگل یوں کھڑا تھا جیسے بھوکوں کے سامنے ناقابلِ دسترس حد میں لذیذ اور خوش ذائقہ کھانوں کے خوان، پورا لشکر اس چٹان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ہینی بال کے حکم سے چٹانیں توڑنے والے کدالیں لے کر آگے بڑھے بمشکل الاؤ جلایا گیا اور چٹان کی دراڑوں میں سرکے کے مرتبان انڈیل دیے گئے، آگ اور سرکے کے امتزاج نے چٹان کو کسی حد تک نرم کر دیا اس کے بعد ان پر کدالوں کی بارش ہونے لگی کدالوں کی پے در پے شدید ضربات نے چٹان کو توڑ دیا اور اتنا راستہ نکل آیا کہ یہ لشکر وادی میں نظر آنے والے جنگل میں داخل ہو گیا۔ کہتے ہیں اوپر سے نیچے اُترنے میں ہینی بال کے پندرہ دن ضائع ہوئے تھے اور ہزاروں آدمیوں اور جانوروں نے اپنی زندگی سے ہاتھ دھو لیا تھا۔

نیچے اطالیہ کی پہلی بستی کے لوگ ہینی بال کی سپاہ کو پہاڑ کی چوٹی سے اترتے دیکھ رہے تھے ان کے لیے ہینی بال کی سپاہ کی جدوجہد بڑی پُر لطف اور مزے دار تھی اور اس جدوجہد کو وہ اس شوق سے دیکھ رہے تھے جیسے تھیٹر کو تماشائی دیکھتے ہیں لیکن جیسے جیسے یہ لوگ نیچے اترے مقامی لوگوں کو ہوش آتا گیا انھوں نے ہینی بال کے دو آدمیوں کو نڈھال اور بے حال دیکھا تھا۔ اسی طرح ان کے مویشیوں کو لنگڑا لنگڑا کر چلتے دیکھا تھا۔ ان کے پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ ہاتھیوں کی پشت پر بوسیدہ کپڑے پڑے تھے، مقامی لوگ تیزی سے اپنے گھروں میں داخل ہوئے اور ہتھیاروں سے لیس ہو کر ہینی بال کے مقابل آ گئے انھیں قرطاجنی سپہ سالار کے ارادوں میں پہلی بار کوئی کھوٹ محسوس ہوئی تھی ان کا خیال تھا کہ اگر اس تھکے ماندے پریشان حال لشکر پر ایک دم ہلّا بول دیا جائے گا تو بڑی جلدی قابو میں آ جائیں گے، انھوں نے ان تازہ واردان پر ایک دم ہلّا بول دیا تھکی ماندی قرطاجنی سپاہ جان پر کھیل کر یہاں تک پہنچی تھی اسے کھانا درکار تھا۔ آگ چاہیے تھی اور سر چھپانے کے لیے ٹھکانوں کی تلاش تھی۔ انھوں نے ہلّا بولنے والوں کو بلائے بے درماں کی طرح گھیر لیا اور بہتوں کو قتل اور گرفتار کر لیا کچھ گھروں سے فرار ہو گئے اور جب جنگ کا مطلع صاف ہوا تو مقامی لوگوں کی پوری بستی ویران اور سنسان پڑی تھی ہینی بال نے ان خالی مکانوں میں اپنی سپاہ کو گھس جانے کا حکم دیا اور کہا "ہم کچھ دن یہیں ستائیں گے اور ساز و سامان درست کریں گے، ہمارے مویشی نڈھال ہیں ان کی توانائی بحال کریں گے اس کے بعد آگے کا ارادہ کریں گے" یہاں اسے اپنے ان دستوں کا بھی انتظار کرنا تھا جو اب تک نہیں پہنچے تھے اور انھوں نے راہ میں اس کی رفاقت اور ملازمت اختیار کی تھی لیکن کافی انتظار کرنے کے بعد بھی جب یہ لوگ وہاں نہیں پہنچے تو ہینی بال کے ساتھ ہی دوسرے فوجی افسروں کو بھی یہ یقین ہو گیا کہ ان حلیفوں نے انھیں دھوکا دیا ہے اور اب وہ شاید کبھی بھی نہ آئیں گے۔

ہینی بال کے عمر رسیدہ اور تجربہ کار سپہ سالار پرٹ اور مہربال اس فکر میں پھنسے ہوئے تھے کہ اگر ان کے حلیف واقعی نہ آئے تو ان چھبیس ہزار سپاہیوں سے روما کس طرح فتح کیا جائے گا۔ پچاس ہزار میں سے اب صرف چھبیس ہزار سپاہی بچے تھے۔ ان دونوں سپہ سالاروں نے یہ بھی سوچا کہ اگر مقابلہ ان چھبیس ہزار سپاہ سے ہی کرنا پڑ جائے تو پھر اس جنگ کو سرِ دست ملتوی کر دینا چاہیے اور اسپین واپس چلا جانا چاہیے پرٹ اور مہربال سپاہیوں کے درمیان بیٹھے مستقبل کے لائحہ عمل پر غور کر رہے تھے ان کے ہم خیالوں میں قلبی بھی شامل تھا۔ اس نے کہا "اہلِ قرطاجنہ نے جن طاقت ور رومیوں سے ڈر کر کوہ ارکس خالی کر دیا تھا اور پھر سارڈینا اور کورسیکا سے بھی بے دخل ہو گئے تھے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ کیا ہم اپنے اس طاقت ور دشمن کو اپنی تھکی ماندی چھبیس ہزار فوج سے شکست دے دیں گے؟"

عمر رسیدہ سپہ سالار مہربال نے بھی قلبی کی اس رائے سے کسی حد تک اتفاق کیا۔ بولا "پنارسی نوجوان! تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میرا جنگی میدانوں کا وسیع تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اب حالات ذرا بدل گئے ہیں اور ہم معقول تعداد کی فوج سے روما والوں کو شکست دے سکتے ہیں لیکن اتنی کم تعداد اور تھکی ہوئی فوج سے یہ کارنامہ نہیں انجام دیا جا سکتا!"

ہینی بال کے بڑے بڑے کان اپنی سپاہ کے ایک ایک آدمی کی باتیں ہی نہیں ان کے دل کی دھڑکنیں تک سن رہے تھے۔ وہ مہربال کی چوپال میں ہونے والی باتیں نہایت توجہ سے سنتا رہا۔ پھر اچانک اندر داخل ہو گیا اور قلبی کو جھڑکتا ہوا بولا "او پنارسی غلام! کہیں تو ہماری سپاہ میں سازش اور افتراق کے بیج تو نہیں بو رہا، تجھے یہاں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں، ہم روم پر دیوتاؤں کا قہر بن کے ٹوٹے ہیں اور تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا کہ روما والوں سے وہ سارا حساب کیا جائے گا جو اب تک اہلِ قرطاجنہ ان سے لے نہیں سکے ہیں، کوہ ارکس، سارڈینا اور کورسیکا خالی کر دینے کی ذلت کا حساب، میں اہلِ روما کو ان کی اپنی زمین میں غلام بنانے آیا ہوں!"

پھر وہ بوڑھے مہربال سے مخاطب ہوا "تم میرے باپ کے زمانے سے سپہ سالاری کرتے چلے آ رہے ہو اگر میری جگہ اس فوج کے تم سپہ سالار ہوتے تو ان حالات میں کون سا قدم اُٹھاتے؟"

جرأت مند مہربال نے جواب دیا "ہینی بال! تم ابھی نوجوان ہو اور تھیں وہ تجربہ حاصل نہیں جو میرا برف کے گالوں میں چھپا ہوا دماغ رکھتا ہے تم جو کچھ کر رہے ہو اس میں نوجوانی کا جوش اور غیر مآل اندیشی کارفرما ہیں، اگر تمھاری جگہ میں ہوتا تو یقیناً روم میں داخلے کے لیے یہ تباہ کن راستہ نہ اختیار کرتا اور اگر غلطی سے یہ راہ اختیار بھی کر لیتا تو یہاں سے جہاں اس وقت ہم سب ٹھہرے ہوئے ہیں چپ چاپ واپس چلا جاتا کیونکہ طاقت ور اور چاق و چوبند دشمن کے ہاتھوں خواہ مخواہ قتل ہو جانے سے یہ بہتر ہے کہ اپنی سپاہ کو بخیر و عافیت یہاں سے واپس لے جائیں!"

ہینی بال نہایت توجہ سے مہربال کی باتیں سنتا رہا، پھر زور سے ہنس دیا۔ بولا "جسے تم میری جوانی کا جوش اور غیر مآل اندیشی کہہ رہے ہو اس میں میرا تدبر کارفرما ہے، روما والے اُن تمام راہوں کا نشان وار اور ناقابلِ تسخیر دفاع کر سکتے ہیں جدھر سے ان کا کوئی بھی دشمن وارد ہو سکتا ہے لیکن یہ راستہ جسے ہم بدقّت عبور کر کے روم میں داخل ہو گئے ہیں یوں ہی خالی پڑا تھا۔ اور روما والے یہ یقین کیے بیٹھے ہیں کہ ان ناقابلِ گزر راستوں سے برف باری کے زمانے میں کم از کم کوئی انسان تو نہیں گزر سکتا نہ کہ دشمن کی سپاہ، میں ان کی اسی غفلت سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہوں ذرا سوچو تو کہ جب اہلِ روما کے عمائدین اور سپاہ کو یہ معلوم ہو گا کہ میں کوہِ ایلپس کی چوٹیوں سے اپنی فوج لے کر ان پر ٹوٹ پڑا ہوں تو ان پر اس خبر کا کتنا برا نفسیاتی اثر پڑے گا آدھی جنگ تو اس نفسیاتی اثر ہی سے جیت لی جائے گی!"

مہربال نے سرکشی سے جواب دیا "یہ خیالی باتیں ہیں، میں ان پر اس وقت تک یقین نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کے نتائج خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں!" پھر ٹھنڈی سانس بھر کے کہا "اور حسبِ توقع نتائج دیکھنا شاید ہماری قسمت میں نہیں لکھا گیا!"

ہینی بال نے سختی سے کہا: "بہر حال اور کوئی بات یقینی ہو یا نہ ہو لیکن ایک بات ضرور یقینی ہے اور وہ یہ کہ ہم یہاں سے واپس نہیں جائیں گے!"

اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ جو لوگ اس سے جنگ کرتے ہوئے پکڑے گئے ہیں انھیں ایک میدان میں کھڑا کیا جائے جب یہ زنجیروں اور رسّیوں میں جکڑے ہوئے قیدی میدان میں کھڑے کیے گئے تو اس نے اپنی سپاہ کو حکم دیا کہ وہ بھی یہیں جمع ہو جائے کیونکہ ایک دلچسپ کھیل دکھایا جائے گا قرطاجنی سپاہ بھی وہیں پہنچ گئی۔

ہینی بال ان قیدیوں کی قطاروں کے سامنے سے گزرتا چلا گیا پھر واپس آ کے ان کی صف کے درمیان کھڑا ہو گیا اور بآوازِ بلند اعلان کیا "تم میں جو بھی آزادی کا خواہاں ہو اپنی صف سے باہر آ جائے!"

سبھی آزادی کے خواہاں تھے۔ ہینی بال مسکرایا، کہنے لگا "آزادی یوں ہی نہیں مل جایا کرتی۔ اس کی حصولیابی کا ایک واحد طریقہ ہے اور وہ یہ کہ طاقت سے حاصل کی جائے۔ ہتھیاروں کی مدد اور شجاعت کے اظہار سے!"

ہینی بال کہنا کیا چاہتا ہے۔ سبھی یہ جاننے کے لیے بے چین تھے۔ ہینی بال نے قیدیوں کی صف سے دو آدمی نکال لیے، بولا

چرچل نے اپنی بیالیسویں سالگرہ سادگی سے منائی۔ پریس فوٹوگرافر بھی وہیں موجود تھا وہ مختلف زاویوں سے ان کی تصویریں لیتا رہا۔ تصویریں کھینچ چکنے کے بعد اس نے ایک خاص جذبے سے کہا: "جنابِ والا! آپ کی سوویں سالگرہ پر بھی میں ہی تصویریں کھینچوں گا!"

چرچل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ہاں بظاہر تو کوئی ایسی وجہ نہیں نظر آتی کہ میری سوویں سالگرہ میں تصویریں نہ کھینچ سکو۔ کیونکہ جوان بھی ہو اور صحت مند بھی۔

وقارِ عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

"کیا تم اس پر تیار ہو کہ دونوں اپنی مرضی اور پسند کے ہتھیاروں سے ایک دوسرے کا مقابلہ کرو۔ آزادی صرف اس کا حصّہ ہوگی جو اپنے مقابل کو شکست دے کر قتل کر دے گا۔ آزادی اور ہتھیار اسی فاتح کا حق ہوں گے!"

دونوں قیدی بخوشی مقابلے پر آمادہ ہو گئے۔ انھیں قید و بند سے آزاد کیا گیا اور انھیں ان کی پسند کے ہتھیار دے دیے گئے۔ پھر ہینی بال کے ایک اشارے پر دونوں آزادی کی خوف ناک جنگ لڑنے لگے۔ ان دونوں کو یہ احساس بھی تھا کہ اپنوں اور غیروں کی نظریں ان پر جمی ہوئی ہیں۔ دونوں نے بے مثال شجاعت اور بے جگری سے مقابلہ کیا اور ایک طویل مقابلے کے بعد ایک قیدی مہلک زخم کھا کے گر گیا اور دوسرا فاتح خوشی سے دیوانہ سا ہو گیا۔ ہینی بال کی سپاہ اور قیدیوں نے مرنے والے میں بھی ایک خاص ادا دیکھی وہ اس شاندار مقابلے میں شرمندگی سے بچنے کے لیے تمکنت اور خودداری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

ہینی بال نے اپنی سپاہ کو مخاطب کیا: "اس دلچسپ تمثیل میں تمھاری قسمتوں کا فیصلہ موجود ہے۔ اہلِ روما کے مقابلے میں فتح کی شادمانی اور انعام و اکرام کا خود کو مستحق ثابت کر دیا پھر اس کی طرح بہادرانہ موت مر جاؤ، تیسرا کوئی راستہ نہیں!"

ہینی بال کے شمالی روما میں مقابلے شروع ہو گئے۔ ہینی بال کی سپاہ نے اس کی تمثیل کو گرہ میں باندھ لیا تھا۔ اور انھوں نے ہر محاذ اور ہر معرکے میں بے مثل شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ اہلِ روما پر ہینی بال ہوّا بن کر نازل ہوا تھا۔ ہینی بال کا اندازِ فکر بالکل درست نکلا۔ سردیوں میں ایلپس کے دشوار گزار سلسلوں کو عبور کر کے روما پر حملہ آور ہونا ایک بڑا اور ناقابلِ فہم کارنامہ تھا، اہلِ روما کے ہوش اُڑ گئے۔ ہینی بال نے اپنی فوج کی کمی کو یوں پورا کیا کہ مفتوحہ علاقوں کے نوجوانوں کو اپنی فوج میں بھرتی کر لیا۔ ہینی بال شمال سے جنوب کی طرف بڑھا اور بحیرۂ اڈریاٹک کے ساحلی شہر کنائے تک پہنچ گیا اور یہی وہ شہر تھا جس کا اہلِ روما نے بھرپور دفاع کیا تھا۔

شروع شروع میں فلبی کا یہ خیال تھا کہ روما کے لوگ ہینی بال کو شکست دے دیں گے لیکن نتائج برعکس نکل رہے تھے، وہ خود جنگ و جدل کا خوگر نہ تھا۔ اس نے میدانِ جنگ کی ہولناکیاں جو دیکھیں تو دل دہل گیا یہ ایلپس کی دشوار گزار راہوں سے زیادہ پُرخطر راہ تھی، اس کی وطنی عصبیت یہاں بھی جاگ اٹھی۔ اس کے لیے یہ منظر انتہائی اذیت ناک ہوتا تھا کہ قرطاجنہ کے لوگ رومیوں کو اپنے ہتھیاروں سے ہلاک کر کے گھوڑوں سے روند ڈالیں اسے ان نوجوانوں پر بھی غصّہ آ رہا تھا جو دولت کی طمع میں ہینی بال کی فوج میں شامل ہو گئے تھے اور خود اپنے ہی ہم وطنوں کو ہلاک کر رہے تھے۔

کنائے میں ہینی بال رک گیا کیونکہ یہاں رومیوں نے ان غیر ملکیوں کو خاک و خون میں ملا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

بحیرۂ اڈریاٹک سے تین میل دور ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر ہینی بال نے اپنی سپاہ کا جائزہ لیا۔ افریقیہ کے بے لگام سوار نومدی مہربال کی قیادت میں تھے اور انھوں نے اپنے ہاتھوں میں سانگیں پکڑ رکھی تھیں۔

ہینی بال کے سامنے اس کی فوج کے مقابل میلوں میں پھیلے ہوئے رومی تھے، جو اپنے بہترین ساز و سامان، تعداد اور باضابطگی اور ترتیب سے ہینی بال کی سپاہ کو متاثر کر رہے تھے، ہینی بال اپنی سپاہ کی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ان کا دل بڑھانے کے لیے ہنسی مذاق شروع کر دیا، اس نے اس جنگ میں جو تدبیر اختیار کی تھی اس کی کامیابی پر وہ کامل یقین رکھتا تھا۔ اس نے اپنے ٹیلے سے رومی سپاہ کا جائزہ لیا اور اپنے لشکر کی ترتیب اس طرح قائم کی کہ اس کا قلب بالکل کمزور رہ گیا۔

اعلانِ جنگ ہوا اور دونوں فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں، نومدیوں کی سانگیں سورج کی روشنی میں چمکیں اور رومی سپاہ کے سینوں میں پیوست ہونے لگیں۔ رومی نہایت آسانی سے ہینی بال کے کمزور قلب میں داخل ہو گئے۔ ہینی بال کا قلب خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹتا چلا گیا، ہینی بال نہایت اطمینان سے یہ تماشا دیکھتا رہا۔ اس کے دائیں بائیں بازوؤں نے اردو کے ہندسے آٹھ (۸) کی شکل میں ایک طرف سے سکڑنا اور دوسری طرف سے پھیلنا شروع کر دیا۔ ہینی بال کا کمزور قلب (۸) کے نقطۂ اتصال سے نکل کر رومی افواج کی پشت پر آ گیا اور اس کی واپسی کا راستہ بند کر دیا۔ ہینی بال نے سوچی سمجھی تدبیر کے مطابق اپنے دائیں بائیں بازوؤں کو اشاروں میں حکم دیا کہ درمیان میں گھر جانے والے رومیوں کو زنبور کی طرح اپنے قابو میں لے کر پیس دیں، اس پر حرف بہ حرف عمل ہوا اور آناً فاناً تقریباً ستر ہزار رومی موت کے گھاٹ اُتر گئے جبکہ اس جنگ میں اسّی ہزار رومیوں نے حصّہ لیا تھا۔ ہینی بال کا یہ ایک عجیب فوجی پھندا تھا اور کسی تباہی خیز جنگ کی اس سے بہتر مثال ملنا مشکل ہے جو رومی زندہ بچ گئے تھے، وہ اِدھر اُدھر پناہ کی تلاش میں چھپتے پھر رہے تھے اور ہینی بال کی سپاہ انھیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل یا گرفتار کرتی پھر رہی تھی۔ ہینی بال نے اپنے گھوڑے پر پامال میدانِ جنگ میں گشت لگایا اور اپنے فوجیوں کے نعرہ ہائے تحسین کا مسکراہٹوں اور ہاتھ کے اشاروں میں جواب دیتا ہوا اپنے خیمے میں داخل ہوا۔

فاتح سپاہیوں کی ہینی بال کی طرف سے ایک شاندار دعوت کی گئی۔ فلبی کا دل رومیوں کی شکست پر خون کے آنسو رو رہا تھا جب ہینی بال کے حکم سے رومی جنرل کی لاش میدانِ جنگ سے ڈھونڈ کر لائی گئی تو فلبی

نے اس کے سرہانے کھڑے ہو کر آنسو بہائے اس جنگ میں وہ بڑے نام نے کیا ہوا تھا۔ ہینی بال نے مقتول رومی جنرل کی لاش پر کھڑے ہو کر کہا: "میں نے بچپن میں ہِل کرت کے روبرو اپنے باپ ہمل کر بقہ کی ہدایت پر یہ قسم کھائی تھی کہ میں رومیوں کا دوست نہیں بنوں گا آج کنائے کے معرکے میں میں نے اپنا عہد پورا کر دیا ہے!" پھر فلبی سے کہا: "اس رومی جنرل کے سرہانے کھڑا تو کیا کر رہا تھا؟"

فلبی نے جواب دیا: "روما کی عظمت پر بین کر رہا تھا۔ اگر میرا یہ عمل تمھاری نظر میں مجرمانہ ہے تو میں ہر اس سزا کے لیے تیار ہوں جو تمھاری طرف سے دی جائے گی!"

ہینی بال نے پُر وقار لہجے میں کہا: "تجھے رومیوں سے محبت ہے؟ حالانکہ تو نے قرطاجنہ کا نمک کھایا ہے اور تجھے ہم سب کا شکر گزار اور احسان مند ہونا چاہیے!"

فلبی نے اپنی داستانِ حیات مختصراً سنا کے جواب دیا: "میں ایک سچا انسان ہوں اور اپنے دلی جذبات چھپانے پر قدرت نہیں رکھتا۔ ہینی بال! تم اپنے دیوتاؤں کی قسم کھا کے مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میری جگہ تم ہوتے تو اہلِ قرطاجنہ سے کیا سلوک کرتے اور ان کی بابت تم کیا سوچتے؟"

ہینی بال بات کو ٹال گیا۔ بولا: "اہلِ روما نے بھی ہم پر کچھ کم ظلم نہیں کیے!"

فلبی نے کہا: "ہل کر بقہ کے بیٹے! اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تم اس عہد کے بہت بڑے انسان ہو اور دیوتاؤں نے تمھیں بہت سے اوصاف سے نوازا ہے اس بڑائی کا یہ تقاضا ہے کہ میرے معاملے میں انصاف سے کام لو اور سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ ہی کہو کیا تمھاری قوم نے مجھ پر ظلم نہیں کیے؟ کیا بیرسا کے بڑوں نے میرے معاملے میں ناانصافی سے کام نہیں لیا؟"

ہینی بال ہنس دیا: "میری فوج میں بہت سی قومیں جمع ہو گئی ہیں اور میں ان سب سے محبت کرتا ہوں لیکن میں اپنی قومی عصبیت کو اپنی ذات سے جدا نہیں کر سکتا اور میں اہلِ قرطاجنہ کو ان سب پر فوقیت دیتا ہوں۔ قرطاجنی ان سب پر فوقیت رکھتے ہیں، میں اس عہد کا بہت بڑا انسان، قرطاجنی ہوں!"

فلبی تھوڑی دیر خاموش رہا۔ ہینی بال نے طنزاً پوچھا: "کیا تو قرطاجنہ جانا چاہتا ہے؟"

فلبی محاربات روما سے اکتایا ہوا تھا، پوچھا: "اگر میں ہاں کہوں تو کیا مجھے قرطاجنہ واپس بھیج دیا جائے گا؟"

"بالکل!" ہینی بال نے جواب دیا: "کنائے کی فتح کی خوش خبری اور رومی امرا کی مہریں لے کر میرا چھوٹا بھائی ماگو کل قرطاجنہ روانہ ہو جائے گا اگر تو جانا چاہے تو میں تجھے بھی بھیج دوں گا!" پھر اس کی ہنسی اڑاتا ہوا بولا: "کیونکہ میں نے خوب اچھی طرح یہ سمجھ لیا ہے کہ تو پنگھوڑے کا آدمی ہے جہاں پہلے تیری ماں تجھے پہلو میں لٹائے لوریاں سنایا کرتی تھی اور اب جبکہ تو جوان ہو چکا ہے تو تجھے ماں کی جگہ ایک عورت کی ضرورت محسوس ہوتی رہتی ہے اور یہ عورت بھی تقریباً وہی فرض انجام دے گی۔ یعنی تیرے پہلو میں لیٹ کر عشق و محبت کی لوریاں دیا کرے گی!"

فلبی کو ہینی بال کے طنز پر غصّہ بھی آیا اور شرمندگی بھی ہوئی لیکن ہینی بال ابھی چپ نہیں ہوا تھا۔ وہ اب بھی کچھ کہہ رہا تھا: "میں قرطاجنہ کے بڑوں کو ایک خط لکھوں گا اور اس میں تیری سفارش کروں گا کہ جس لڑکی سے تو محبت کرتا ہے وہ تیرے حوالے کر دی جائے۔ بیرسا کے بڑے لوگ کم از کم میری یہ حقیر سی درخواست رد نہیں کریں گے!"

ہینی بال کی تلخ اور طنزیہ گفتگو اسے خاصا پریشان کرتی رہی، وہ اِس مسئلے پر دیر تک سوچتا رہا اور عجیب و غریب منصوبے بناتا رہا!

دوسرے دن ایک بحری جہاز ہینی بال کے سب سے چھوٹے بھائی ماگو کی نگرانی میں قرطاجنہ روانہ ہو گیا۔

بیرسا کی مقدس چوٹی پر سرخ پردوں والے ایوان میں قرطاجنی مجلس کے ارکان سر جوڑ کے بیٹھے۔ ماگو نے ہینی بال کی فتح مندیوں کی داستان سنائی اور ثبوت میں ارکانِ مجلس کے سامنے وہ ٹوکرا اُلٹ دیا جس میں رومی اُمرا کی چھ ہزار طلائی انگوٹھیاں رکھی تھیں، مجلس کے حاسد ارکان نے اس خوش خبری کو جوش و خروش سے نہیں سنا۔ انھوں نے ماگو سے کہا: "تمھارے بقول اگر ہینی بال نے اتنی ہی کامیابیاں حاصل کر لی ہیں تو وہ وہاں اب کیا کر رہا ہے اور ہم سے کیا چاہتا ہے؟"

ماگو نے دل شکستہ لہجے میں کہا: "میرے بھائی کو چار ہزار نومدی سوار

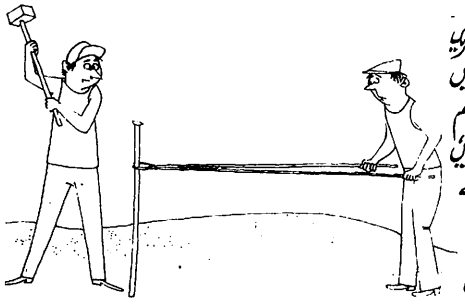

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

چالیس ہاتھی اور کئی من چاندی درکار ہے تاکہ وہ اپنا ادھورا کام تکمیل کو پہنچا سکے!"

مجلس نے بے دلی سے یہ درخواست منظور کر لی۔

اس کے بعد ماگو نے مجلس کے سامنے ہینی بال کا وہ سفارشی خط پیش کرنا چاہا جس کا قلبی سے تعلق تھا لیکن قلبی نے کچھ سوچ کر ماگو سے وہ خط لے لیا اور کہا "ماگو! ابھی اس سفارش کا وقت نہیں ہے، قرطاجنہ ایک بڑی جنگ میں اُلجھے ہوئے ہیں تم ہینی بال کی مطلوبہ امداد لے کر واپس جاؤ اور فی الحال مجھے میرے حال پر چھوڑ دو!"

قلبی کی واپسی کو زلیفو کے ماں باپ نے خوش دلی سے نہیں قبول کیا لیکن زلیفو بہت خوش تھی گو اس خوشی کا اس نے اظہار نہیں کیا ان میں سے قلبی کے علاوہ کسی کو بھی اس سفارشی خط کا علم نہیں تھا جو ہینی بال نے بیرسا کی مجلس کے نام لکھا تھا۔

قلبی اس جگہ پہنچا جہاں پنارسی بوڑھے کی ہڈیاں دفن تھیں وہ کچھ دیر اس ویران مدفن پر کھڑا رو دیا سا کچھ دیکھتا رہا اسے ایسا محسوس ہوا جیسے بوڑھے کی روح اسے یاد دلا رہی ہے کہ "آبا و اجداد کی زمین کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے، خبردار جو تو نے ان فنیقیوں کی زمین کو اپنا وطن بنایا !" اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ پنارسی اس پر یہ طعن کر رہا ہے کہ وہ ہینی بال کی فوج میں شامل اہلِ رومہ کا خون بہانے میں ان کا معاون یا خاموش تماشائی رہ چکا ہے!"

قلبی برداشت نہ کر سکا، اس نے بوڑھے کی ہڈیوں سے کہا۔ "اے میرے ہم وطن پنارسی بزرگ! کچھ تم نے سُنا قرطاجنہ کے ہمل کر برقہ کا بیٹا ہینی بال ایک بہت بڑا فاتح بن کر اُبھر رہا ہے اس نے رومہ کو اتنا ذلیل کر دیا ہے کہ کسی اور عہد میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی لیکن اپنے اس بڑے آدمی کا قرطاجنہ کے بڑوں کی مجلس نے اس طرح احترام کیا ہے کہ وہ اس کے کارناموں کو حسد اور رشک و تشبیہ سے سُنتی ہے!"

پھر وہاں سے واپس ہوتے ہوئے اس نے بوڑھے کی ہڈیوں کو آخری بار سلام کیا اور کہا "میرے بزرگ! مجھے ہمت بخشو کہ میں اپنے فیصلے پر عمل کر سکوں اور زندگی بھر اس پر قائم رہوں!"

یہاں سے وہ زلیفو کے پاس پہنچا، یہ دونوں ابھی تک ایک دوسرے سے دُور دُور اور کٹے کٹے سے رہتے تھے۔ اس نے نہایت افسوس سے زلیفو کو مخاطب کیا، بولا "زلیفو! میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے وطن پنارس واپس چلا جاؤں۔"

زلیفو کی زبان سے غیر ارادی طور پر نکل گیا "کیا تم نے میرے باپ سے اس کی اجازت لے لی ہے؟"

"نہیں!" قلبی نے جواب دیا "کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ میرے اس ارادے میں مزاحم نہیں ہوں گے!"

زلیفو جو کچھ کہہ رہی تھی اس میں اس کے سوا کوئی خواہش نہ تھی کہ وہ کسی بھی بہانے اسے روک لے وہ خود یہ درخواست نہیں کرنا چاہتی تھی، اس نے کہا "تمھیں میرے باپ نے خریدا تھا تم میرے باپ کی ملکیت ہو اس لیے اپنے جانے نہ جانے کے بارے میں تم خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے اس میں میرے باپ کی اجازت ضروری ہے!"

قلبی، زلیفو سے اس قسم کی گفتگو کی اُمید نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی رہی سہی اُمید بھی ٹوٹ گئی، سوگواری سے جواب دیا "تمھارے والدین اس فیصلے میں اس لیے مزاحم نہیں ہوں گے کہ وہ خود بھی یہی چاہتے ہیں لیکن اگر تم بھی یہی چاہتی ہو تو میں تمھاری یہ خواہش بھی پوری کر دوں گا۔"

اس کے بعد قلبی نے زلیفو کے باپ کے سامنے اپنا مدعا رکھا، اس نے نہایت خوشی سے اُسے وطن چلے جانے کی اجازت دے دی۔

قلبی زلیفو سے سرسری ملاقات کر کے قرطاجنہ کی بندرگاہ میں داخل ہوا، اس وقت اس کے تصوّر میں پنارس کی زمین تھی، جہاں اس کے بزرگوں کا قبرستان تھا، عزیز رشتے دار تھے اور جہاں کے آب و گِل سے اس نے جنم لیا تھا۔

وہ ایک تجارتی جہاز میں بیٹھ کر پنارس روانہ ہو گیا اور ہینی بال کا سفارشی خط اس نے ایک واقف کے ذریعے زلیفو کے پاس یہ کہہ کر بھیج دیا کہ "ہینی بال کا یہ سفارشی خط شکریے کے ساتھ اسے واپس کر دیا جائے اور اسے بتا دیا جائے کہ قلبی پنگھوڑے کا آدمی نہیں ہے اور یہی بات ثابت کرنے کے لیے اس نے زلیفو کی سریع الحصول آغوش کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے!"

زلیفو نے ہینی بال کا خط پڑھا اور قلبی کے زبانی پیغام کو جب خط کی عبارت سے ملا کر مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کی تو یہ سب کچھ عقدۂ لاینحل بن کر رہ گیا۔ ہاں بس ایک بات البتہ اسے کسی حد تک سکون پہنچاتی رہی کہ اُس نے محبت کا اقتدار نہ کرنے والے متعصب قلبی کے سامنے خود کو کبھی سستا نہیں ثابت کیا اور یہ کہ اس نے ہمیشہ اپنے بڑوں کے فیصلے کو بے چون و چرا تسلیم کیا ہے۔

اُردو کے مشہور ادیب احمد ندیم قاسمی کی ایک کہانی

سوئی کا ناکہ

عزت مآب ہمم بیگ کی زندگی کے چند ورق

اِس ماہ کے لیے شعور انوار' کا انتخاب

سب رنگ کی منتخب کہانیاں اُردو ادب کا عطر ہیں

وہ تھا تو منحنی سا آدمی مگر وہ بہت بڑا آدمی تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جو آدمی کروڑوں اور اربوں روپے کا مالک ہے اور جس کے سامنے ملکی حکومت کے علاوہ ملحقہ ملکوں کی حکومتیں بھی آنکھیں جھکائے دوزانوں بیٹھی رہتی ہیں، وہ اتنی خفیف سی مخلوق کیوں ہے کہ ہتھیلی پر رکھ کر پھونک مارو تو فضا ہی میں معلّق رہ جائے اور زمین کی کششِ ثقل کم سے کم پانچ منٹ کے لیے تو ضرور فیل ہو جائے۔ کہتے ہیں چیونٹی اُس کے پاؤں کے نیچے آ کر بھی چلتی رہتی ہے۔

یہ سب تو خیر مبالغے کی باتیں ہیں مگر سچی بات یہ ہے کہ وہ بڑا آدمی بہت چھوٹا سا تھا۔ کسی دُور اندیش اور جہاں دیدہ سکریٹری نے اُسے بڑی بڑی مونچھیں رکھ لینے کا مشورہ دیا تھا ورنہ اگر اُس کی مونچھیں نہ

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

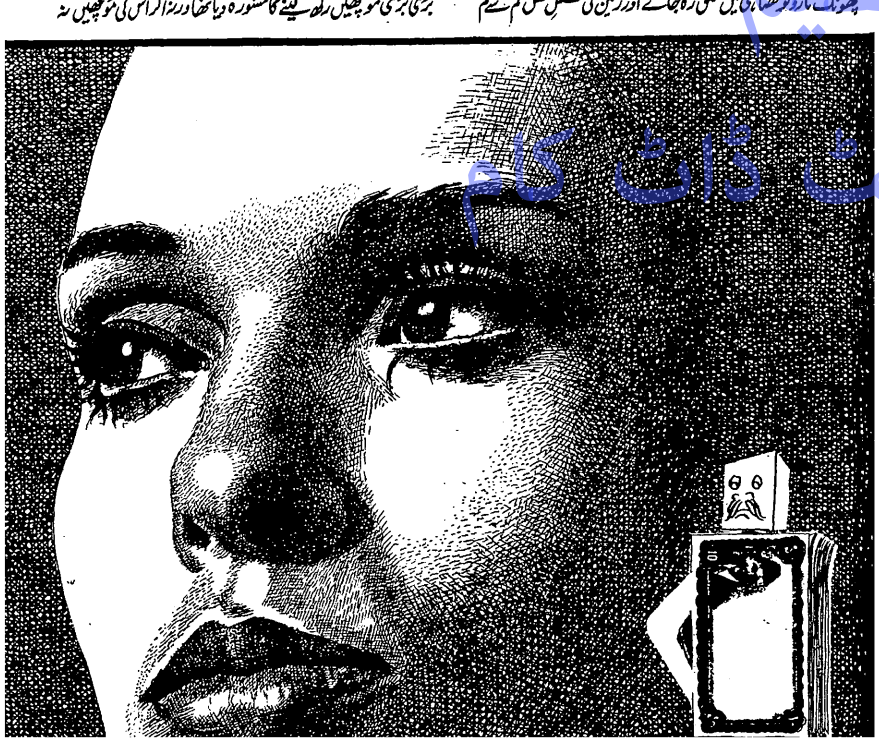

ہوتیں تو اُس کے بڑھاپے میں بھی اجنبی لوگ اُسے "برخوردار" کہہ بیٹھتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مونچھ اُس کے جسم کا ایک حصّہ نہیں معلوم ہوتی تھی، وہ پٹھانوں کے کندھے پر رکھی ہوئی چادر کی طرح بالکل فالتو چیز تھی اور ایسا لگتا تھا کہ اُسے چھینک آئی تو مونچھیں چھپکلی کی طرح چکرا کر گریں گی لیکن مونچھوں نے اُس کی شخصیت کا بھرم ضرور رکھ لیا تھا۔ بوڑھی عورت کے ہونٹوں پر اگر لپ اسٹک بُری معلوم ہوتی ہے تو ہوتی رہے۔ بڑھیا کے اِس اطمینان کی قیمت کون ادا کر سکتا ہے کہ لوگوں کی نظریں اُس کے ہونٹوں کی سیاہی تک نہیں پہنچ سکتیں۔

اس بڑے آدمی نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ چونتیس برس کے تو معمولی معمولی بڑے آدمی بھی ایک چھوڑ دو دو تین تین شادیاں کر چکے ہوتے ہیں مگر یہ بہت بڑا آدمی اپنے ملک اور پڑوسی ملکوں میں اپنے کارخانوں، دکانوں، بینکوں، بیمہ کمپنیوں، فارموں اور زمینوں کے انتظام میں کچھ یوں ڈوبا رہتا تھا کہ اپنی ماں کے سوا دنیا کی کسی عورت کو پہچانتا ہی نہ تھا۔ بڑی بڑی ضیافتوں میں بھی وہ عورتوں کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھتا تھا جیسے ہوٹل میں بیٹھا بیرے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ لوگ اُس سے اپنی بیویوں کے سہارے بیٹیوں کا تعارف کراتے تو وہ "آپ سے مِل کر خوشی ہوئی" کے الفاظ یوں ادا کرتا جیسے کہہ رہا ہے "آپ اِن کی بیٹی ہیں تو ہوتی پھریں۔ بس ٹھیک ہے، ہو گیا تعارف، اب ذرا ہٹ جائیے اور میرا راستہ چھوڑ دیجیے۔"

"شادی تو بیٹا ایک روز کرنا ہی ہوگی۔" بیگم بہرام دوسرے تیسرے مہینے یاددہانی کا فرض ادا کرتیں۔

اور ہمم بیگ غصّے میں آکر ہمیشہ یہی کہتا کہ "آخر ضرورت ہی کیا ہے؟"

بیگم بہرام آنے والے دو تین مہینے شادی کی ضرورت کو مہذب الفاظ کا لباس پہنانے کی کوشش میں گزار دیتیں مگر جب بیٹے سے بات کرتیں تو اُن کی ساری سوچیں "وہ تو کرنا ہی ہوگا بیٹا" میں سمٹ آتیں اور ظاہر ہے کہ اس تجویز کا جواب ہمم بیگ کے پاس موجود تھا۔

پھر یکایک مملکت میں افواہ پھیل گئی کہ ہمم بیگ کی شادی کے لیے ایک لڑکی کی تلاش ہے۔ یہ تاثر دراصل یوں پیدا ہوا کہ اپنے چچازاد بھائی سے ہمم بیگ کی کسی بات پر لڑائی ہو گئی اور جب شام کو وہ دفتر سے گھر آیا اور ماں کو سارا حال سنایا تو وہ بولی "اگر تم نے شادی نہ کی بیٹا تو یہی کمینے تمھارے وارث ہوں گے۔"

بیگم بہرام کے ذہن میں یہ بات پہلے بھی ہزار بار آئی تھی مگر اُسے معلوم تھا کہ یہ بیمہ ایجنٹ کا ساطرزِ استدلال ہے، اِس سے موت کا پہلو نکلتا ہے اور ہمم بیگ اگر دنیا میں کسی طاقت سے ڈرتا ہے تو وہ صرف موت ہے۔ آج بیگم بہرام کی زبان سے یہ بات کسی پیشگی تیاری کے بغیر نکل گئی

اور ہمم بیگ جو شادی کے ذکر کے بعد غصّے میں شام کا کھانا تک نہیں کھاتا تھا اُس روز ماں کی بات سُنتے ہی جیسے سناٹے میں آگیا۔

اُس وقت بغل کے کمرے میں کوئی خادمہ موجود تھی۔ اُس نے ہمم بیگ کی یہ حالت دیکھی تو وہ بھی سناٹے میں آگئی چونکہ آج شادی کے ذکر پر ہمم بیگ نے نہ تو شادی کی ضرورت کے بارے میں کچھ پوچھا تھا نہ اُس نے بچّوں کی طرح پاؤں پٹخے تھے اور نہ ٹوٹے ٹوٹے فقروں میں ماں سے کوئی احتجاج کیا تھا۔ "آخر ضرورت ہی کیا ہے؟" وہ طیش میں آکر بچّوں کی طرح منمناتے ہوئے ماں سے احتجاج کرتا تھا۔ "کہہ جو دیا کہ ہم نہیں کریں گے شادی۔ ہم کیوں کریں شادی؟ ہمیں ضرورت ہی کیا ہے شادی کی؟" وغیرہ وغیرہ مگر آج جیسے ہمم بیگ کی زبان پتھرا گئی تھی اور فرش سے ماں اور ماں سے فرش کو دیکھتا ہوا ننھے ننھے قدم اُٹھاتا دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا جہاں سے خادمہ تیسرے کمرے میں چلی آئی تھی۔ خادمہ نے یہ بات باورچی تک پہنچائی تو وہ بھی سناٹے میں آگیا۔ پھر وہ مسکرانے لگا۔ یکایک مٹھیاں بھینچ کر ہیڈ باورچی کی طرف بھاگا۔ ہیڈ باورچی پر بھی سناٹے کا مختصر سا دور گزرا اور پھر جب وہ صبح بازار گیا تو شام تک شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سناٹا کئی بار آ اور جا چکا تھا۔

بیگم بہرام کے بدلے بدلے تیوروں نے بھی اِس افواہ کے ہاتھ مضبوط کر دیے۔ اب وہ بڑی بڑی ضیافتوں میں جوان لڑکیوں کو غنڈوں کی طرح گھورتی تھی اور جب اُس کی ہم عمر بیگمات اُس سے پوچھتی تھیں کہ "بیگم بہرام کس سوچ میں مگن ہیں؟"

تو وہ جواب دیتی تھی "اپنا فرض پورا کر رہی ہوں۔"

اب ہمم بیگ کے دفتروں میں ٹائپسٹ لڑکیاں تک اُس سے شرمانے لگی تھیں اور وہ اس کی طرف یوں دیکھتی تھیں جیسے وہ انھی کی طرف دیکھ رہا ہے۔

بیگم بہرام اب بیٹے کے ساتھ خاصی بے خوفی سے شادی کا ذکر کرنے لگی تھی لیکن جس طرح پچھلے دس بارہ برس میں اُسے "کرنا ہی ہوگی" کا جواب "ضرورت ہی کیا ہے" سے ملتا تھا۔ اسی طرح ہمم بیگ اب اُس کی ہر تاکید کے جواب میں صرف اتنا کہتا "یہ تو اماں تمھارا کام ہے میرا کام نہیں ہے۔"

اور بیگم بہرام دو تین مہینے کے لیے اسی سوچ میں ڈوب جاتی کہ ہمم بیگ کو کس طرح مہذب طریقے سے یہ سمجھایا جائے کہ یہ دراصل اُسی کا کام ہے۔

تھوڑے سے وقفے کے بعد ہمم بیگ کی دُلھن کی یہ تلاش اخبارں کے ہتھے چڑھ گئی۔ وہاں سے نکل کر غیر ممالک میں جا پہنچی "مونچھوں والے

کروڑپتی" کی سُرخیوں سے ہمم بیگ کی بڑی بڑی تصویریں چھپیں۔ اُس کی زندگی کے حالات اور اُس کی امارت کے اندازے شایع ہوئے اور ایک اخبار نے تو یہ خبر بھی درج کر دی کہ مونچھوں والا کروڑپتی اپنی رفیقۂ حیات کی جستجو میں عنقریب قاہرہ اور پیرس کے شبانہ کلبوں، ہالی وڈ کے نگار خانوں اور مِس یونیورس اور مِس ورلڈ کے انتخابی مقابلوں کا بہ چشم خود مشاہدہ کرنے کے لیے اپنے ہی طیارے میں ساری دنیا کا سفر اختیار کرنے والا ہے۔

انھی دنوں ہمم بیگ نے ایک ملحقہ مملکت میں اپنے وسیع کاروبار کے معائنے کا پروگرام بنا لیا۔ اس مملکت کی حکومت شاید مالی پریشانیوں میں مبتلا تھی اِس لیے جب اُسے ہمم بیگ کے اِس ارادے کا علم ہوا تو فوراً ایک دعوت داغ دی اور ایک بہت بڑے صنعت کار اور سرمایہ کار کا یہ نجی دورہ شاہانہ حیثیت اختیار کر گیا۔

بیگم بہرام نے پڑوسی ملک کے بارے میں اپنے بیٹے کے خوب خوب کان بھرے۔ اُسے بتایا کہ بہرام بیگ مرحوم نے بھی اُس کے ساتھ صرف اِس لیے شادی کی تھی کہ اُس کی آنکھیں اس پڑوسی ملک کی لڑکیوں کی آنکھوں کی طرح سیاہ تھیں۔ "اور پھر بیٹا" بیگم بہرام نے بات ختم کرتے ہوئے کہا "طبیعت کی ایسی حلیم کہ بالکل بھیڑیں اور آواز میں ایسی لطافت جیسے رباب کے تاروں پر بوندیں گر رہی ہوں۔ میرا دل مجھ سے کہہ رہا ہے کہ تیری بہو یہاں نہیں ہے وہیں ہے۔"

"کہاں؟" ہمم بیگ نے پوچھا۔

اور بیگم بہرام اداس ہو گئی پھر فوراً سنبھل کر بولی "وہیں بیٹا جہاں تم جا رہے ہو۔"

"مگر اماں۔" ہمم بیگ نے کہا "یہ میرا کام نہیں ہے، تمھارا کام ہے۔"

"لو پھر وہی بات!" بیگم بہرام نے فریاد کی۔ "یعنی میں اِس عمر میں اپنے بیٹے کی دُلھن ڈھونڈنے اجنبی اَن دیکھے ملکوں میں گھستی پھروں! نہیں بیٹا! یہ تمھارا کام ہے اور کام صرف اتنا سا ہے کہ......"

پھر بیگم بہرام نے اپنے بیٹے کو کام کی تفصیل مہذب الفاظ میں بتانے کی کوشش شروع کر دی مگر بیٹا سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا اور مونچھوں کی نوکوں پر لگا ہوا خشک موم جھاڑتا رہا۔

ہمم بیگ جب پڑوسی ملک کے سب سے بڑے شہر کے ہوائی اڈے پر اُترا تو اُسے اتنے بہت سے لوگوں سے ہاتھ ملانا پڑا کہ اُس کا استخوانی ہاتھ دُکھنے لگا۔ پھر اُس نے ہاتھ پتلون کی جیب میں رکھ کر صرف گردن کی جنبش سے تعارف و تسلیم کا فرض ادا کرنا چاہا مگر

مُلزم

کا اصرار تھا کہ اس نے اپنے مخالف کو دستانہ کھینچ مارا تھا۔ جج نے سوال کیا "یہ کس طرح ممکن ہے کہ دستانے جیسی ملائم چیز کی چوٹ سے تمھارے مخالف کے دو دانت ٹوٹ گئے!"

ملزم نے حافظے پر زور دیتے ہوئے کہا "حضورِ والا ممکن ہے۔ میں دستانے میں سے اپنا مکا نکالنا بھول گیا ہوں گا!"

لوگوں کی عقیدت اتنے جوش میں تھی کہ انھوں نے ہمم بیگ کا ہاتھ پتلون کی جیب سے گھسیٹ کر ایک مقدّس تعویذ کی طرح اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا لیا۔ اُس کے بعد ہی ہمم بیگ کے گلے میں اتنے ہار ڈالے گئے کہ اگر اُس کے سکریٹری ساتھ ساتھ ہار اُتارتے نہ جاتے تو پھولوں کے انبار میں ہمم بیگ کو ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا۔ پھر غضب یہ ہوا کہ ہر ہار اُس کے دائیں یا بائیں مونچھ میں اٹک گیا اور اُسے مصافحے سے پہلے اپنی مونچھ ہار کی دستبرد سے یوں تواتر کے ساتھ آزاد کرنی پڑی جیسے وہ مصافحے کے لیے ہاتھ کے بجائے مونچھ پیش کرنے والا ہے۔

ہوائی اڈے سے جائے قیام تک کے تین میل طے کرنے میں تین گھنٹے صرف ہو گئے۔ مکانوں کی بالکونیوں سے اُس پر پھولوں کے ٹوکرے اُلٹ دیے گئے اور وہ اس دوران میں مونچھوں پر اُترنے والی پتیاں چننے میں لگا رہا۔ شہریوں نے مارے تالیوں کے اُس کے کانوں کے پردوں پر جیسے گھونسے برسا دیے۔ وہ جہاں سے بھی گزرا، لوگوں نے اُسے ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر دیکھا کیونکہ وہ کار کی گدگدائی سیٹ میں ڈوبا ہوا تھا اور اُس کے پہلو میں بیٹھا ہوا میزبانِ خاص جیسے اُس کے سر پر بیٹھا تھا۔ جب اُس کی کار گزر جاتی تو لوگ قہقہے مار مار کر ہنسنے لگتے اور جن کی مونچھیں تھیں، وہ اپنی مونچھیں ستوانے لگتے۔ ایک بار اُس نے پلٹ کر دیکھنے کا حوصلہ بھی کیا۔ لوگ کھلی سڑک پر بے ترتیبی سے پھیل کر ہنستے ہوئے ایک دوسرے کے ہاتھوں پر چٹاخ چٹاخ ہاتھ مار رہے تھے اور پھر پیٹیوں کو دبا دبا کر ہنسی پر قابو پانے میں کوشاں تھے۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟" اُس نے میزبانِ خاص سے پوچھا۔

میزبان بولا "عوام مارے خوشی کے ہنس رہے ہیں۔" وہ اُسے کیسے بتاتا کہ عوام دراصل کیوں ہنس رہے ہیں؟

"یہ ٹھیک ہے۔" اُس نے جائے قیام کے غسل خانے میں جا کر سوچا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ اِس ملک میں میرے آٹھ کارخانے، پانچ بینک اور دو بیمہ کمپنیاں ہیں، یہ بھی ٹھیک ہے کہ اس ملک کی لگ بھگ آدھی اقتصادی قوت کی باگیں میرے ہاتھ میں ہیں مگر ایسا استقبال بھی کیا کہ انسان کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دے۔ آخر اس زور کے استقبال کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

"آخر اس زور کے استقبال کی ضرورت ہی کیا تھی؟" اُس نے کپڑے بدلنے اور مونچھوں کی نوکوں میں سوزنی باریکی پیدا کرنے کے بعد ڈرائنگ روم میں جا کر اپنے میزبان سے پوچھا۔

میزبان تکلّف میں پڑ گئے اور کہنے لگے کہ "ابھی کہاں۔ ابھی تو آپ ہمارے ہاں کے تعلیمی اور تہذیبی اور صنعتی اداروں میں قدم رنجہ فرمائیں گے۔ ابھی تو آپ ہمارے دفاتر کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے نوازیں گے اور آپ کو سپاس نامے قبول فرمانا ہوں گے اور ضیافتوں کو رونق بخشنا ہوگی اور ....."

"بات یہ ہے صاحب!" ہمم بیگ نے میزبانِ خاص کی بات یوں کاٹ دی اور پھر کچھ اس انداز سے بولنا شروع کیا جیسے وہ اپنے وطن میں اپنے مرکزی دفتر کی گردشی کرسی پر بیٹھا کسی غیر ملکی تجارتی وفد سے سودا کر رہا ہے۔ "بات یہ ہے کہ اتنا ہی کافی ہے، میں سیاسی آدمی نہیں ہوں اور مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آپ نے اتنی محبّت کا اظہار کیا آپ کا شکریہ لیکن میں تو یہاں آپ کا ملک دیکھنے کے بجائے اپنا کاروبار دیکھنے آیا ہوں۔ ساتھ ساتھ آپ کا ملک بھی دیکھتا جاؤں گا۔"

اپنے تین درجن سکریٹریوں میں گھرے ہوئے منحنی ہمم بیگ کی ایک مستقیم بات نے چوڑی پیشانیوں اور چکنی کھوپڑیوں پر سلوٹیں پیدا کردیں۔ سب ایک دوسرے کی بغلیں جھانکنے لگے مگر میزبانِ خاص نے حالات سنبھال لیے اور آخر طے پایا کہ جب ہمم بیگ اپنے اداروں کے معائنے کے بعد واپس ہوگا تو اُسے ایک رخصتی ضیافت میں ضرور شریک ہونا ہوگا۔ "اور آج شام میرے ہاں کی ضیافت تو ہے ہی۔" میزبانِ خاص نے آخر میں کہا۔

"جی نہیں،" ہمم بیگ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "جو بات طے ہوئی ہے، اُس میں آپ اضافہ کر رہے ہیں۔ آج شام کو تو مجھے اندرونِ ملک روانہ ہو جانا ہے۔"

اور یہ اُس شام کا ذکر ہے جب کوئی ڈیڑھ مہینے بعد ہمم بیگ عازمِ وطن ہونے کے لیے اس ملک کے سب سے بڑے شہر میں واپس آیا۔ اُس کے طیّارے کو علی الصباح پرواز کرنا تھا اس لیے شام کو موعودہ ضیافت کا انتظام کیا گیا۔

ایک سے لباس والے تین درجن سکریٹریوں میں گھرے ہوئے ہمم بیگ کے ساتھ پہلے تو میزبانِ خاص موسمی حالات کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرتا رہا پھر جب اُسے کھانے کی لدی اور سجی ہوئی نہایت طویل میز پر لا کر بٹھایا گیا تو اُس کے تیور یکایک بدل گئے۔ اُس کے دائیں اور بائیں دو لڑکیاں بیٹھی تھیں جو عمر کے اُس دور سے گزر رہی تھیں جب جوانی کانٹے میں تُل جاتی ہے اور اگرچہ میزبانِ خاص اُس کے بالکل سامنے بیٹھا تھا مگر اس کے بھی دائیں بائیں نوجوان لڑکیوں کی ایک قطار دُور تک چلی گئی تھی۔ بوڑھے لوگ اور اُن کی بیویاں، یا دوسرے لفظوں میں ان لڑکیوں کے والدین میز کے پرلے سروں پر جمع تھے۔ میزبانِ خاص نے ہمم بیگ کے دائیں بائیں اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ دونوں میری بیٹیاں ہیں۔"

"خوب"۔ اُس نے کہا اور نیپکن سے کھیلنے لگا۔

دعوت کے شروع ہوتے ہی اُس کے دائیں بائیں کی لڑکیاں اُسے ڈونگے اور ڈشیں پیش کرنے لگیں۔ "یہ پسند فرمائیے گا؟" دائیں والی لڑکی نے کہا اور جیسے رباب کے تاروں پر چار بوندیں گر گئیں۔

"جی نہیں شکریہ۔" اور ہمم بیگ نے بائیں طرف کی ایک ڈش دیکھی۔

"یہ تو یقیناً ناگوارِ خاطر نہیں ہوگا۔" بائیں والی لڑکی وہی ڈش اُٹھا کر بولی اور رباب کے تاروں پر چند اور بوندیں ٹپک پڑیں۔

"جی شکریہ۔" ہمم بیگ سامنے دیکھنے لگا۔

"یہ ملاحظہ فرمائیے۔"

"نہیں شکریہ۔"

"آپ تکلّف فرما رہے ہیں۔" میزبانِ خاص نے صورتِ حال سنبھالنے کی کوشش کی۔

"جی نہیں۔" ہمم بیگ بولا۔ "تکلّف کیسا۔"

اور پھر دائیں بائیں کے علاوہ آس پاس کی لڑکیاں بھی یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ مونچھوں والے کروڑپتی نے ایک ایک کر کے وہی ڈونگے اور ڈشیں اُٹھائیں جنھیں چند ثانیے پہلے وہ قبول کرنے سے انکار کر چکا تھا۔ موقع کی نزاکت بھانپ کر میزبانِ خاص بولا۔ "آپ کو کس چیز کا شکار زیادہ پسند ہے؟"

"شکار مجھے سرے سے پسند ہی نہیں۔ مار پیٹ مجھے اچھی نہیں لگتی۔" ہمم بیگ نے جواب دیا۔

"کھیلوں میں شاید ٹینس سے آپ کے مزاج کو رغبت ہوگی؟" میزبانِ خاص نے پوچھا۔

وہ ہمم بیگ نے مونچھ سے چاول کا ایک دانہ اُڑاتے ہوئے کہا۔ "میں کوئی کھیل نہیں کھیلتا۔ وقت ضایع کرنے والا کوئی کام مجھے بھلا نہیں لگتا۔"

"بہت اچھی بات ہے۔ بہت خوبصورت بات ہے۔" میزبانِ خاص نے ہدیۂ عقیدت پیش کرنے کی کوشش کی اور پھر دائیں بائیں بیٹھی ہوئی اپنی بیٹیوں کو دیکھا جن کی گھبراہٹ اُن کے چہروں پر غازے کے پیچھے بھی دمکی پڑ رہی تھی۔

دعوت ختم ہوئی تو تقریروں اور جوابی تقریروں کا سارا پروگرام تلپٹ ہو گیا کیونکہ ہمم بیگ یکایک اُٹھ کھڑا ہوا مگر قبل اس کے کہ وہ اپنے سکریٹریوں کے جھرمٹ میں جا گھسے، میزبانِ خاص لپک کر آیا اور کہا۔ "حاضرین کا تقاضا ہے کہ آپ سے متعارف ہونے کی عزّت حاصل کریں۔ آپ کو تکلیف تو یقیناً ہوگی مگر میری درخواست ہے کہ آپ انھیں مصافحے کی سعادت ضرور بخشیے۔"

ہمم بیگ نے پلٹ کر اپنے سکریٹریوں کی طرف دیکھا اور پھر میزبانِ خاص کے قریب آ کر جب سامنے نظر دوڑائی تو حاضرین دُور ہٹ کر کھڑے تھے اور تمام حضرات نے پریڈ کے سے انداز میں اُس کے سامنے ایک صف باندھ رکھی تھی۔

ان لڑکیوں میں ایک عجیب و غریب اتحاد کارفرما تھا۔ وہ ایک دوسرے کی بے خبری میں ایک ہی مقصد کے لیے یہاں جمع ہوئی تھیں اور اُن میں سے بعض بڑی کوششوں اور سفارشوں کے بعد ہمم بیگ کی اس ضیافت میں شامل ہو پائی تھیں۔ اِس تقریب کے لیے انھوں نے اُس وقت سے تیاریاں شروع کردی تھیں جب اخباروں نے مونچھوں والے کروڑپتی کی اُن کے ملک میں آمد کی اطلاع شایع کی تھی۔ جو ذرا بھرے جسم کی تھیں انھوں نے دُبلاپے کے کورس پر عبادت کی حد تک عمل کیا تھا۔ جو دُبلی تھیں انھوں نے اپنے جسم پر گوشت کی ایک متناسب تہہ چڑھانے کے لیے ٹانکوں کے گیلن پی ڈالے تھے۔ سانولیوں نے گورا ہونے کے لیے اور گوریوں نے سانولا بننے کی خاطر راتوں کو بھی دو دو تین تین گھنٹے کے بعد اُٹھ اُٹھ کر اپنے چہروں، ہاتھوں اور بازوؤں پر کریمیں ملی تھیں اور پوڈر چھڑکے تھے۔ کوئی مونالیزا کی مسکراہٹ کی مشق کرتے کرتے اپنی مسکراہٹ بھی گنوا بیٹھی تھی۔ ور کیسی مسکراہٹ کی عادی ہو چکی تھی جسے صرف لوہار ہی گھڑ سکتے ہیں۔ کسی نے انگرڈ برگ مین کی طرح سر کو خفیف سا جھٹکا دے کر اور بالوں میں ہلکا سا تموّج پیدا کر کے بات کرنے کا اسلوب اپنایا تھا۔ کوئی نرگس کے وقار اور شہزادی مارگریٹ کی ذہانت کا خول اپنے چہرے پر چڑھائے کھڑی تھی اور کسی کو صوفیہ لارین کی سی از خود رفتگی اور بگاڑیں بناؤ کا انداز جکڑے کھڑا تھا۔ یہ سب جسموں کے اشتہار بنے ہوئے تھے ور کروڑپتی سے متعارف ہونے کے لیے

انھوں نے ہفتوں تک قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر آنکھیں نیم وا کر لینے، نچلا ہونٹ اُوپر کے ہونٹ کے مقابلے میں ذرا موٹا کر لینے، نتھنے پھُول کی پنکھڑیوں کی طرح ترڑپانے، گالوں میں ڈمپل پیدا کرنے اور گردن کی لمبائی نمایاں کرنے کی جو مشقیں کی تھیں، وہ ایک رٹے ہوئے سبق کی طرح اُن کے ذہنوں کی نوکوں پر جمع ہو گئی تھیں اِس کے باوجود ایک کو دوسری کی تمنّا کا علم نہیں تھا مگر تمنّا سب کی ایک تھی۔

"اِدھر دائیں طرف سے تعارف کی ابتدا ہو تو بہتر ہے۔" میزبانِ خاص نے تجویز پیش کی اور قطار کی دائیں طرف پہلے نمبر پر کھڑی میزبانِ خاص کی بڑی بیٹی جیسے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میزبانِ خاص نے ایک قدم دائیں طرف بڑھایا پھر مُڑ کر دیکھا تو ہمم بیگ وہیں کھڑا تھا۔ پلٹ کر وہ اُس کے قریب آ گیا۔

ہمم بیگ بولا۔ "یہ سلسلہ طویل ہو جائے گا اور مجھے جلدی جا کر سو جانا ہے کیونکہ طیّارہ علی الصباح اُڑ رہا ہے پھر میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ خواتین کو میری وجہ سے تکلیف ہو۔ میں یہیں سے سب کی خدمت میں تسلیمات عرض کیے دیتا ہوں...... تسلیمات۔" اُس نے دونوں پاؤں جوڑ کر سر ذرا سا جھکا دیا۔ قمقموں کی تیز روشنی میں اُس کی مونچھوں کا سایہ اُس کے گھٹنوں تک چلا گیا اور پھر ہمم بیگ اپنے سکریٹریوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ سنّاٹا اتنا شدید ہو گیا جیسے کوئی چاہے تو اسے چھُو لے۔

ہمم بیگ اپنے سکریٹریوں اور میزبانِ خاص کے ہمراہ دُور نکل گیا تھا۔ پھر ایک لڑکی صف سے نکل کر کچھ ایسی آواز میں بولی جیسے ڈھول کے پردے پر پتھر گر رہے ہوں۔ "ہائے کیسا چیونٹا سا ہے بے چارہ" ور اُس نے ایک قہقہہ اُگلا۔

ایک اور لڑکی صف سے ٹوٹ کر بولی۔ "آج معلوم ہوا کہ خدا نے انسان کو صرف مٹّی ہی سے نہیں بنایا۔ بعضوں کو تنکوں سے بھی بنایا ہے۔"

"مجھے تو اُس کی مونچھیں مانگے کی لگیں۔" تیسری چہکی۔

"بھئی کسی کو مونچھوں کے سوا کچھ نظر آیا ہو تو کافر ہو۔ مجھے تو صرف دو مونچھیں کھڑی نظر آئیں۔" چوتھی نے کہا۔ لڑکیوں کے قہقہوں سے ساری ضیافت گاہ گونج اُٹھی۔

کار پر سوار ہوتے ہوئے ہمم بیگ نے چونک کر میزبانِ خاص سے پوچھا۔ "یہ کیسی آواز تھی؟"

میزبانِ خاص جلدی سے بولا۔ "لڑکیاں ہنس رہی ہیں۔" وہ اُسے کیسے بتاتا کہ دراصل وہ رو رہی ہیں۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

اُردو کے ممتاز ادیب

مسعود مفتی

کی ایک تاثر انگیز تحریر

دُوسری منتخب کہانی

مصنف نے اس کہانی کا عنوان "مٹکا" رکھا تھا

اُردو کی ناقابلِ فراموش کہانیاں

ٹپ ..... ٹپ۔ شمالی سندھ کی جھلستی ہوئی صبح میں پسینے کے دو قطرے ماتھے سے چل کر ناک سے گرے اور ٹھیکری کے اوپر جمی ہوئی مٹی کی تہہ میں جذب ہو گئے۔

محمد فتح موہنجو داڑو میں دوسرے مزدوروں کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ کھدائی کا کام۔ کبھی کدال سے کبھی کھرپوں سے کبھی ہاتھوں سے اور کبھی انگلیوں کی پوروں سے۔ یہ بڑا صبر آزما اور اکتا دینے والا کام تھا مگر اُسے اپنی مزدوری سے غرض تھی۔ جب تھوڑا کام کر کے مزدوری زیادہ ملے تو اور کیا چاہیے!

محمد فتح کے ساتھ پندرہ مزدور چند روز سے ایک ٹیلے کی کھدائی کر رہے تھے جس میں سے چند اینٹوں کا ٹوٹا پھوٹا فرش، ایک دو موتی اور کچھ زیورات ملے تھے۔ مزید انکشافات کی تلاش میں وہ بڑی احتیاط سے پچھلے چار دن سے کام کر رہے تھے اور کل شام تک ایک ٹوٹے ہوئے مٹکے کی تمام ٹھیکریاں ڈھونڈ چکے تھے جو اُس کے سامنے پڑی تھیں اور وہ سر جھکائے اُن پر سے دھیرے دھیرے مٹی صاف کر رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں لوہے کی کُتری تھی جس سے مٹی اُتار رہا تھا۔ جس ٹکڑے پر بیل بوٹے نظر آتے وہ کھرچے بغیر دوسرے آدمی کو دے دیتا جو اُسے برش سے ہولے ہولے صاف کرتا۔ ساتھ ہی وہ پُرانے سندھی لوک گیت کا ایک مصرع گنگنا رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ

"جیب میں پیسہ ہو تو لاڑکانہ گھومو۔"

وہ کئی ہفتے سے یہاں کام کر رہا تھا اور جانتا تھا کہ کھدائی کے ذریعے پانچ ہزار سال پُرانے شہر کا ایک اور حصہ برآمد ہو رہا تھا چنانچہ آج مٹی کھرچتے ہوئے اُس نے سوچا کہ اِن پانچ ہزار سالوں میں یہاں کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ اِن ٹھیکریوں پر جمی ہوئی مٹی بالکل ایسی ہی ہے جیسی آج کل کی۔ یہ ٹھیکریاں بھی ایسی ہی ہیں جیسی ہمارے برتن ٹوٹنے سے بنتی ہیں۔ اُس زمانے کے کھلونوں میں جو بیل گاڑیاں اور کشتیاں برآمد ہوئی ہیں وہ بھی بالکل آج کل جیسی ہی ہیں اگر یہ سب کچھ ویسا ہی ہے تو خدا معلوم یہ لوگ کیوں اتنی محنت سے چیزیں کھودتے ہیں جبکہ ہو بہو ویسی ہی چیزیں آج بھی ڈوکری اور لاڑکانہ کے گلی کوچوں میں نظر آتی ہیں۔ کُتری زمین پر رکھ کر محمد فتح نے ماتھے پر اُنگلی پھیری اور پسینے کے قطرے اکٹھے ہو کر دھار کی شکل میں اُنگلی کے سرے سے اُس کے دامن پر گرنے لگے۔ اُس نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو ایک میل دُور دریائے سندھ کی چوڑی سطح چاندی کی طرح چمک رہی تھی اور اُس چمک سے گرمی کا احساس اور بھی گہرا ہو رہا تھا۔ اُس نے دوسرے مزدوروں پر نگاہ دوڑائی۔ دو چار کام میں مصروف تھے اور باقی گھاس کے چھپر کے نیچے سستا رہے تھے۔ دراصل وہ سب انتظار میں تھے۔ کراچی سے چند افسر خاص طور پر وہ چیزیں دیکھنے آ رہے تھے جو کھدائی میں برآمد ہوئی تھیں۔ اُن کے لیے خاص ہوائی جہاز کا انتظام کیا گیا تھا اور میوزیم کے تمام افسران انھیں لینے کے لیے موہنجو داڑو کے ہوائی اڈے پر گئے ہوئے تھے۔ جانے سے پہلے کسٹوڈین نے مزدوروں کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ لوگ خاص طور پر اِس مٹکے کے ٹکڑے دیکھیں گے اِس لیے یہ کام اُن کے آنے سے پہلے ختم ہونا چاہیے۔ وہ گیا تو بابا آچر جو سب سے بوڑھا مزدور تھا، ہنسنے لگا۔

"یہ صاحب لوگ بھی خوب ہیں۔ ایک پُرانے مٹکے کے لیے ہوائی جہاز سے آئیں گے۔ اتنا روپیہ برباد کریں گے۔"

جھکے جھکے محمد فتح کی گردن تھک گئی تھی اُس نے سر اُٹھا کر انگڑائی لی۔ اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ موہنجو داڑو کے اونچے ٹیلے سے دُور دُور تک کھیتوں میں پھیلا پانی نظر آ رہا تھا جس کے نیچے دھان کی فصل ایسے پرورش پا رہی تھی جیسے بچہ ماں کے پیٹ میں ہو۔ فضا میں سڑے ہوئے پانی کی بساند رچی ہوئی تھی اور حبس سینے پر بھاری بوجھ کی طرح ان دیکھا دباؤ ڈال رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آ گئے۔

وہ چار افسر تھے۔ سر پر موٹے موٹے ٹوپ پہنے ہوئے اور کالی عینکیں آنکھوں پر چپکائے ہوئے۔ انھوں نے ایک ایک چیز کئی کئی بار دیکھی اور مٹکے کے تو عاشق ہو گئے۔ کبھی اُن میں سے کوئی ایک ٹھیکرا اُٹھا کر دیکھتا۔ پھر دوسرے کو ایسے دیتا گویا نازک آبگینہ ہو۔ وہ بھی آنکھیں جما کر اُسے دیکھتا، معنی خیز انداز میں زور زور سے انگریزی بولتا، باقی سب بھی سر ہلاتے اور پھر وہ اگلے کو دے دیتا۔ انھوں نے مٹکے کے کئی ٹکڑے محدّب شیشے کی مدد سے بار بار دیکھے۔ پھر وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئے اور مٹکے کے ٹھیکروں کے کنارے مسالہ لگا لگا کر آپس میں جوڑنے لگے۔ محمد فتح نے آگے بڑھ کر اپنی خدمات پیش کرنا چاہیں تو انھوں نے ایسے ہٹا دیا جیسے وہ کوئی پاک جگہ ناپاک کرنے جا رہا تھا۔ مجبوراً وہ ایک طرف ہو کر تماشا دیکھنے لگا۔ ایک گھنٹے کی عرق ریزی کے بعد مٹکے کا منہ اور تھوڑا سا اُوپر والا حصہ جُڑ گیا۔ اُن افسروں میں جو سب سے بوڑھا تھا، وہ خوشی سے تالیاں بجانے لگا اور دوسرے کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "ہم نے یہ مٹکا نہیں جوڑا بلکہ پانچ ہزار برس پُرانی تہذیب جوڑی ہے۔ یہ مٹکا اُن دنوں کسی بھرے گھر کی رونق ہوگا۔"

محمد فتح پہلے تو اُن سب کو بے وقوف سمجھ رہا تھا مگر اس افسر کی بات اُس کے دل کو بہت لگی کیونکہ ٹھیکرے جُڑنے کے بعد مٹکے کی جو شکل بنی تھی وہ ہو بہو اسی مٹکے جیسی تھی جو اُس کے اپنے گھر میں تھا اور وہ جانتا تھا کہ اُس کے گھر کی ساری رونق اُسی مٹکے کے دم سے ہے۔

محمد فتح کا باپ موہنجو داڑو سے تھوڑی دُور رہتا تھا اور ایک بڑے زمیندار کا ہاری تھا۔ اُس کی تمام جائیداد دو بیل اور ایک ہل تھا۔ بالکل ویسا ہی ہل اور بیل جیسے موہنجو داڑو کے میوزیم میں کھلونے بن کر پڑے تھے۔ اُن کا مکان ایک کمرے کا تاریک سا کوٹھا تھا جس میں اُس کے ماں باپ اور دو چھوٹے بھائی رہتے تھے۔ محمد فتح کی اپنی عمر کوئی پندرہ برس کے لگ بھگ تھی اور وہ محض گھر کی آمدنی میں اضافے کے لیے کھدائی کے کام پر مزدوری کرتا تھا۔ یہ مٹکا اُن کے تاریک گھر کے تاریک ترین گوشے میں پڑا تھا اور دونوں چھوٹے بھائیوں کے قد سے اونچا تھا۔ اُس کا چوڑا منہ ہمیشہ ایک پُرانی چنگیر سے ڈھکا ہوتا تھا۔ مٹکے میں کبھی چاول ہوتے تھے اور کبھی گندم۔ نئی فصل کے دنوں میں مٹکا لبالب بھرا ہوتا اور جیسے جیسے دن گزرتے جاتے اس میں اناج کی چوٹی نیچے سرکتی جاتی۔ اُس کے گھر کی ساری رونق مٹکے کے دم سے تھی۔ رات کے وقت ماں باپ کی چارپائیاں بالکل مٹکے کے ساتھ ہوتی تھیں تاکہ چور وہاں نہ پہنچ سکے۔ چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا تو ایک پیڑھی پر پڑا رہتا تھا جو مٹکے کے پاس دھری ہوتی تھی اور سارا دن غوں غوں کرتا رہتا تھا اور دُوسرے بچے مٹکے کے اِرد گرد گھوم کر اور اُوپر چڑھ کر بھائی کو ہنسانے کی کوشش کرتے۔ گھر کے بچے ضد کرتے یا لڑتے تو ماں مٹکے میں سے مٹھی بھر اناج نکال کر انھیں دیتی کہ جا کر بھٹّی سے بھنوا لیں۔ کبھی ہمسایوں میں سے کوئی اُدھار مانگنے آتا تو ماں مٹکے میں سے ایک آدھ کٹورا اناج کا نکال کر دیتی یا اُسی میں سے پیسوں کی پوٹلی نکالتی اور کھول کر پیسے دے دیتی۔ اُس کی بڑی بہن کی شادی ہوئی تھی یا جب بھی رونق ہوتی تھی۔ ماں مٹکے کے اناج میں دبی ہوئی پوٹلی میں سے روپے نکالتی۔ باپ شہر کو جانے لگتا تو ماں اُسی مٹکے میں سے پیسے نکال کر اُسے دیتی اور محمد فتح کو یہ بھی یاد تھا کہ جن دنوں اُسے اور بھائی کو فاقے سے سونا پڑتا تھا تو ماں آہیں بھر بھر کے خالی مٹکے میں کئی بار جھانکتی تھی کہ شاید کوئی اناج کا دانہ نظر آ جائے۔ اُن کے گھر کے جتنے اُتار چڑھاؤ تھے اُن کا مظہر یہ مٹکا تھا۔ خوشحالی کا بھی تنگ دستی کا بھی اور فاقوں کا بھی۔ گھر کے کئی حادثے بھی اُس مٹکے سے وابستہ تھے ـــ ابھی پچھلے ہی دنوں وہ اپنے باپ کے ساتھ گھر واپس لوٹا تو اُس کی ماں مٹکے پر تقریباً اوندھی پڑی تھی۔ اُس کی سانس زور زور سے چل رہی

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

نظامُ الملک طوسیؒ سے کسی نے سوال کیا "جانوروں میں سب سے زیادہ خطرناک جانور کون سا ہے؟"
طوسی نے جواب دیا "وحشیوں میں ظالم بادشاہ اور پالتو جانوروں میں خوشامدی۔"

تھی، وہ پسینے میں شرابور تھی اور سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ اُن دونوں نے اُسے اُٹھایا، چارپائی پر لٹایا، وجہ پوچھی مگر وہ زار و قطار روتی گئی۔ ایک آدھ مہمل سا جملہ بولی بھی مگر فتح کے پلّے نہ پڑا لیکن اُس کا باپ سمجھ گیا اور اُس نے فتح کو باہر بھیج دیا۔ باہر تو وہ چلا آیا مگر دروازے سے کان لگا کر سُننے کی کوشش کرتا رہا۔ ساری بات تو پلّے نہ پڑی۔ صرف اتنا اندازہ ہوا کہ اُس کی ماں کو زمیں دار نے گھر بُلایا تھا، بند کمرے میں کچھ منوانے کی کوشش کی تھی مگر وہ انکار کرتی رہی اور آخر کھڑکی میں سے چھلانگ لگا کر بھاگ آئی۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ باپ کے بُلانے پر ماں کو گُڑ کا شربت پلانے لگا تو اُس کے بازوؤں اور چہرے پر کئی خراشیں نظر آئیں پھر اُس کا باپ ساری شام کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا دالان کے باہر بیٹھا رہا۔ اُس نے پوچھا بھی مگر وہ زمیں دار کو دو چار گالیاں دینے کے سوا کچھ نہ بتاتا تھا۔

زمیں دار جو بڑا جاگیر دار بھی تھا اور بڑا سیاست داں بھی، تھانے دار بھی اُس سے ڈرتا تھا اور پٹواری بھی۔ محمد فتح سوچتا رہا کہ یہ قصّہ کیا ہے اور وہ کیا کرے؟ مگر اُس کے ذہن میں ساری چیزیں گڈ مڈ تھیں اور جب دماغ بہت پریشان ہوا تو وہ اندر گیا، مٹکے میں سے مٹّھی بھر اناج لیا اور بھنوانے کے لیے بھٹّی پر چلا گیا۔

مٹکا جُڑ گیا تھا۔ افسر دوسری چیزیں دیکھنے ریسٹ ہاؤس چلے گئے تھے اور محمد فتح دِن کا کام ختم کر کے گھر روانہ ہوا۔ سارے راستے وہ اُن لوگوں کے متعلّق سوچتا رہا جو وہاں اتنی محویت اور شوق سے مٹکا جوڑتے رہے تھے۔ تین چار میل کا راستہ طے کر کے وہ گھر پہنچا تو مغرب ہونے کو تھی اور شام کی نیلگی شروع ہو گئی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا آخری موڑ مُڑا جہاں سے دو سو گز دُور اُس کا مکان تھا۔ وہ ایک دم ٹھٹھک کر رُک گیا۔ وہاں تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا!!

گھر کا سارا سامان کوٹھے سے باہر بکھرا پڑا تھا۔ بستر اور برتن وغیرہ چارپائی پر ڈھیر تھے۔ گھر کو تالا پڑا تھا۔ چند ہمسائے تھوڑے فاصلے پر کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ایسے جیسے یہ لوگ اچھوت تھے۔ وہ بھاگ کر آگے گیا تو اُسے ٹھوکر لگی، سنبھل کر دیکھا تو گھر کے اندر والا مٹکا ٹوٹا پڑا تھا۔ اُس کے ٹھیکرے بکھرے ہوئے تھے اور اُن میں سے ایک سے اُسے ٹھوکر لگی تھی۔

تب اُس کے باپ نے بڑے ہی مدھم اور بجھے ہوئے انداز میں ساری کہانی سُنائی جس کا لبِّ لُباب یہ تھا کہ زمیں دار نے اُسے بے دخل کر دیا ہے۔ اُس کے علم کے بغیر کوئی جھوٹا مقدمہ چلتا رہا جس میں یک طرفہ ڈگری ہوئی اور تحصیل دار کے آدمی آج آکر بے دخل کر گئے ہیں۔

اُس کا گلا سُوکھ گیا۔ خشک سا گولا معدے سے لپک کر حلق میں آ پھنسا۔ اُسے سمجھ نہ آئی کہ وہ کیا کہے۔ بے بسی میں فقط اتنا منہ سے نکلا "مگر..... مگر وہ یہ مٹکا کیوں توڑ گئے ہیں؟"

"مٹکا کہاں بیٹا،....." اُس کا باپ بولا "ہمارا تو گھر ہی ٹوٹ گیا۔"

بے بسی کے عالم میں محمد فتح زمین پر بیٹھ گیا اور بے چارگی سے ٹھیکرے دیکھنے لگا۔ پھر بڑی نرمی سے اُس نے ٹھیکرے اکٹھّے کیے اور یاس کے عالم میں اُن کے کنارے آپس میں ملانے لگا۔ بالکل اُسی انداز میں جس طرح صاحب لوگ صبح موہنجو داڑو میں مٹکا جوڑ رہے تھے..... اور پھر اُس کے ذہن میں ایک موہوم سا سوال اُبھرا کہ کیا پانچ ہزار سال پہلے وہ مٹکا بھی ایسے ہی ٹوٹا تھا؟؟..... ممکن ہے..... باقی چیزیں جو ویسی ہی ہیں..... اور وہ ٹوٹے ہوئے ٹھیکرے جوڑنے کی بے سود کوشش کرتا رہا مگر وہ ہر دفعہ پھر ٹوٹ جاتے۔ اُس نے آنکھ اُٹھائی تو ماں کو اپنی طرف دیکھتے پایا۔ چھوٹا بچہ اُس کے کندھے سے چپکا تھا اور آنکھوں میں آنسو اُبل رہے تھے۔ "ماں میں ابھی صاحب کے پاس یہ ٹھیکرے لے جاتا ہوں، اُن کے پاس مسالہ ہے، انھوں نے صبح ہی پانچ ہزار سال پُرانا مٹکا جوڑا ہے....."

"چل ہٹ بے وقوف" اُس کا باپ قریب آکر چلایا۔ "وہ یہ مٹکا نہیں جوڑیں گے" پھر اُس نے پیار سے بیٹے کے بال تھپکے اور نرمی سے بولا "دِل کو نہ لگاؤ بیٹا! بڑے لوگ دوسروں کے مٹکے توڑتے ہی رہتے ہیں۔ میں نے اپنے دادا کا وقت دیکھا ہے، وہ ہمیں اپنے دادا کے وقت کی باتیں سُنایا کرتا تھا۔ یہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہے۔"

محمد فتح حیران ہو کر باپ کو دیکھتا رہا پھر بولا "کمال ہیں یہ صاحب لوگ بھی۔ پُرانے مٹکے جوڑنے پر تو اتنا خرچ کرتے ہیں اور نئے مٹکے ٹوٹنے پر کوئی بندوبست نہیں کرتے!"

"ہاں بیٹا! ہمارا زمانہ ایسا ہی ہے..... شاید پانچ ہزار سال بعد کوئی ہمارے مٹکے جوڑنے والا بھی پیدا ہو جائے۔" اُس کے باپ نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے ٹھنڈی آہ بھری اور زیرِ لب بولا۔
"پانچ — ہزار — سال!!"

وقت پیما

مقدمۂ قتل کے دوران ایک ماہرِ نفسیات کی شہادت کا دِل چسپ واقعہ مختصر مختصر.....

ہربرٹ میرہ ❖ مینو یاسمین قبا

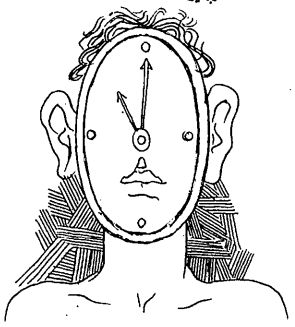

چارلس ایک ماہرِ نفسیات تھا۔ اگر وہ ماہرِ نفسیات نہ ہوتا تو بھی آسانی سے یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ نارمن اپنی خالہ کا قاتل ہے۔ نارمن کی خالہ مسز فرنڈل ایک دولت مند بیوہ تھی اور نارمن ایک فضول خرچ اور لالچی نوجوان تھا۔ بدنیتی اور بے رحمی اُس کے چہرے سے عیاں تھی۔

چارلس کی منگیتر جینی مسز فرنڈل کی سیکرٹری اور ساتھی تھی۔ چارلس نے اس سے کہا "جینی! پولیس نے نارمن کو گرفتار کر کے ٹھیک کیا ہے۔ وہ دولت کی خواہش میں اندھا ہو گیا تھا۔ اِس امر میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں ہے کہ مسز فرنڈل کو اسی نے ہلاک کیا ہے۔"

جینی نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا "ہاں، مجھے بھی یقین ہے کہ یہ حرکت اُسی نے کی ہے۔"

"تمھیں تو مسز فرنڈل سے بہت عقیدت تھی؟"

"ہاں۔ وہ ایک بے حد نرم دل اور محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ وہ نارمن پر بہت بھروسا کرتی تھیں۔ میں چاہتی ہوں کہ نارمن ضرور کیفرِ کردار کو پہنچے۔ اُسے سزا تو ضرور ملے گی نا؟"

"امکان تو یہی ہے کیونکہ نارمن کا دفاع کرنا بہت مشکل کام ہے۔" چارلس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "وکیلِ صفائی کے پاس دفاع کے لیے صرف چند معمولی نکات ہیں۔ وہ انھی نکات کے سہارے نارمن کو بچانے کی کوشش کرے گا لیکن جینی! بسا اوقات ایک غیر اہم نکتہ بھی انتہائی اہم ثابت ہوتا ہے۔"

نارمن کو اپنا کام پورا کرنے میں تین منٹ لگے تھے۔ صرف تین منٹ۔ اسی مختصر مدت میں اُس نے مسز فرنڈل کی دوا میں زہر ملا کر انھیں قتل کیا تھا۔ نارمن جس وقت قتل کے ارادے سے مسز فرنڈل کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا، وہ اِس بات سے بے خبر تھا کہ چارلس ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا جینی کا انتظار کر رہا ہے۔ جینی کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ چارلس نے نارمن کو مسز فرنڈل کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا اور باہر نکلتے ہوئے بھی۔ کمرے سے باہر نکل کے جب نارمن نے چارلس کو بیٹھے دیکھا تھا تو اس کا دِل دھک سے رہ گیا تھا جیسے اسے کوئی فوری صدمہ پہنچا ہو۔ اُس کے چہرے پر جو تأثرات اُبھرے تھے، اُن سے ایک طرح کا احساسِ جرم عیاں تھا۔ نارمن نے اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے عذر لنگ کا سہارا لیتے ہوئے کہا تھا کہ "میں ابھی ابھی اندر گیا تھا۔ بڑی بی نے شاید غلطی سے کوئی زہریلی چیز کھالی تھی۔ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں ابھی ابھی اندر گیا تھا، صرف ایک منٹ قبل۔"

مگر یہ ایک اٹل حقیقت تھی کہ وہ کمرے میں پورے تین منٹ تک رہا تھا لیکن یہ بات صرف اُسے اور چارلس کو معلوم تھی۔

نارمن کے وکیل نے بڑے جوش و خروش سے اپنا موقف پیش کیا۔ اُسے یقین تھا کہ استغاثے کے پاس اُس کے موکل کے خلاف بہت کمزور دلائل ہیں چنانچہ وہ واقعے کی تفصیلات بے حد ڈرامائی انداز میں پیش کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ "مسٹر چارلس! آپ نے عدالت کو بتایا ہے کہ ملزم اپنی خالہ کے کمرے میں تین منٹ تک رُکا تھا۔" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں، تقریباً تین منٹ یا شاید کچھ زیادہ۔" چارلس نے جواب دیا۔

"تو گویا یہ آپ کا صرف اندازہ ہے؟ آپ نے گھڑی تو نہیں دیکھی تھی نا؟"

"جی نہیں!"

وکیل جج سے مخاطب ہوا "میرے مؤکل کا بیان اس سے مختلف ہے۔ اُس کا دعوا ہے کہ وہ کمرے میں اتنے کم وقت ٹھیرا تھا کہ اس میں وہ مبیّنہ قتل کا مرتکب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ صرف ایک منٹ کے لیے کمرے میں رُکا تھا۔"

"مجھے افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ مسٹر نارمن جھوٹ بول رہے ہیں۔" چارلس نے کہا۔

"لیکن مسٹر چارلس! وقت کا اندازہ آپ بھی تو غلط لگا سکتے ہیں۔ آپ اپنی محبوبہ یا منگیتر کا انتظار کر رہے تھے۔ ایسے موقعوں پر وقت بہت آہستہ آہستہ گزرتا ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟"

"آپ کی بات ماننے کے باوجود میں پھر اصرار کروں گا کہ وہ کمرے میں تین منٹ تک رُکا تھا۔"

"مسٹر چارلس، کیا آپ یہ دعوا سنجیدگی سے کر رہے ہیں؟ کیا آپ ایک، دو اور تین منٹ جیسے مختصر وقفے کے درمیان بالکل صحیح تمیز کر سکتے ہیں؟"

"جی ہاں، میرا خیال ہے، میں ایسا کر سکتا ہوں۔"

"تو گویا آپ وقت ناپنے کی کوئی مشین ہیں؟" وکیل نے ازراہِ مذاق کہا۔ چارلس صرف مسکرا کر رہ گیا۔ حاضرین کی سرگوشیاں شور میں تبدیل ہو گئیں۔ وکیلِ صفائی نے بڑے ڈرامائی انداز میں پلٹ کر جج کی طرف دیکھا اور پُراثر آواز میں کہا "جنابِ والا! میں عدالت کی اجازت سے معزز گواہ کے اس دعوے کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں کہ وہ وقت کا بالکل صحیح اندازہ لگانے پر قادر ہیں۔"

وکیلِ استغاثہ نے چوٹ کی "میرا خیال ہے، میرے معزز دوست کو خود وقت کا صحیح اندازہ نہیں ہے اسی لیے وہ اسے اس طرح ضائع کر رہے ہیں۔"

جج نے ایک نظر وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھا اور متانت سے کہا "وکیلِ صفائی اپنے مقدمے کی مناسب پیروی کر رہے ہیں یا نہیں؟ اس بات کا فیصلہ کرنے کا حق صرف عدالت کے پاس رہنے دیا جائے تو بہتر ہو گا۔"

"میں بے حد معذرت خواہ ہوں جنابِ والا!" وکیلِ استغاثہ شرمندہ ہو گیا۔

جج نے وکیلِ صفائی سے کہا "آپ کے ذہن میں گواہ کی صلاحیت جانچنے کے لیے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

ہو گئے ہیں۔"

جو بھی طریقہ ہو، آپ شوق سے اس پر عمل کیجیے۔"

"شکریہ جناب والا!" وکیل صفائی کا چہرہ اس اُمید سے دمک رہا تھا کہ اس بار وہ استغاثے کے واحد گواہ چارلس کو مکمل طور پر غلط ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس نے ٹھیر ٹھیر کر کہا۔ "مسٹر چارلس! آپ کے پیچھے دیوار پر ایک کلاک لگا ہوا ہے۔ اسے جیوری کے ارکان دیکھ سکتے ہیں لیکن آپ کو وہ دکھائی نہیں دے گا۔ براہِ کرم آپ اپنا بایاں ہاتھ پشت کی طرف کر لیجیے تاکہ آپ کلائی کی گھڑی بھی نہ دیکھ سکیں۔ آپ اپنے اندازے کے مطابق تین منٹ کا وقفہ مکمل ہوتے ہی اپنا دایاں ہاتھ فضا میں بلند کر دیجیے گا۔"

جج نے مشورہ دیا۔ "گواہ دل ہی دل میں سیکنڈ گن سکتا ہے لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اس دوران میں وکیلِ صفائی اس پر جرح جاری رکھیں۔"

"بہتر ہے جناب والا!" پھر وکیلِ صفائی نے گواہ کی طرف رُخ کر کے کہا۔ "آپ ٹھیک اسی وقت سے تین منٹ گزرنے کا اندازہ لگائیں گے۔"

ایک لمحے کے لیے چارلس کو اپنے ذہن میں کسی گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دی لیکن دوسرے ہی لمحے وکیل نے سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ "مسٹر چارلس! کیا اس دوران میں آپ یہ بتا سکیں گے کہ ملزم نے اپنی خالہ کے کمرے سے نکلنے کے بعد آپ سے مزید کیا باتیں کی تھیں؟"

عجیب سا سکوت طاری تھا۔ سب لوگ خاموشی سے وکیلِ صفائی اور چارلس کی طرف متوجہ تھے۔ بڑے کلاک کی سیکنڈ کی سوئی کسی بہت سست رفتار مونگھے کی طرح چل رہی تھی۔

وکیلِ صفائی کے ایک خاصے پیچیدہ سوال کے دوران میں چارلس نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کرتے ہوئے تین منٹ مکمل ہونے کا اعلان کر دیا۔ "جناب والا! تین منٹ پورے ہو گئے ہیں۔"

وکیلِ صفائی نے فوراً گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ اس نے حیرت سے چارلس کی طرف دیکھا۔ چارلس بڑی معصومیت سے وکیل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں وکیلِ صفائی کا مذاق اڑا رہی تھیں۔ سکوت طاری تھا۔

جج نے میز پر رکھی ہوئی گھڑی دیکھ کر تصدیق کر لی تھی کہ چارلس کا اندازہ بالکل صحیح ہے۔ اس نے وکیلِ صفائی سے پوچھا۔ "کیا آپ گواہ پر جرح مکمل کر چکے ہیں؟"

"جی ہاں، جناب والا!" وکیل نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

جینی سے باتیں کرتے ہوئے چارلس نے اسے بتایا کہ "جب میں نے تین منٹ کہا تھا تو میرا مطلب لگ بھگ تین منٹ سے تھا کیونکہ میں وقت ناپنے کی کوئی مشین نہیں تھا۔"

"مگر کام تو تم نے مشین کی طرح درست کیا ہے۔" جینی نے اُسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔ "آخر تم نے اتنا صحیح اندازہ لگایا کیسے؟ کیا تم جرح کے دوران میں بھی سیکنڈ گن رہے تھے؟"

"نہیں۔ سوالات کی بوچھاڑ میں سیکنڈ گننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قصہ کچھ اور تھا پیاری! میں تمھیں اپنا راز بتاتا ہوں۔ یہ راز کسی ماہرِ نفسیات ہی کو معلوم ہو سکتا ہے۔ دیوار کا کلاک صرف جیوری کے ارکان دیکھ سکتے تھے۔ جیوری کے ارکان کلاک دیکھ رہے تھے۔ میں تو صرف ان کی آنکھیں دیکھ رہا تھا۔ سمجھیں؟ جب انھوں نے کلاک چھوڑ کر میری طرف دیکھنا شروع کیا تو میں سمجھ گیا کہ وقت پورا ہو گیا ہے بلکہ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے ہوں کہ تین منٹ پورے ہو گئے۔"

پرل ہاربر

پر حملہ ہو چکا تھا۔ امریکہ نے بھی اعلانِ جنگ کر دیا اور بڑے پیمانے پر فوجی بھرتی شروع ہو گئی ان میں ایک ایسا نوجوان بھی پھنس گیا جو جنگ میں نہیں شامل ہونا چاہتا تھا۔ بھرتی سے بچنے کی ایک ترکیب سمجھ آئی۔ ڈاکٹر نے جب بینائی کا امتحان لیا تو نوجوان نے نظر کی کمزوری کو اپنا سہارا بنایا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "سامنے دیوار پر لٹکا ہوا چارٹ پڑھ کر سنائیے!"

نوجوان نے بے بسی سے جواب دیا۔ "میں نہیں پڑھ سکتا!"

ڈاکٹر نے کہا "اچھا، دو قدم آگے بڑھ کر پڑھیے!"

نوجوان دو قدم آگے بڑھ گیا اور چارٹ پر نظریں جما کر بولا "جناب اب بھی نہیں!"

ڈاکٹر نے کہا۔ "دو قدم اور بڑھ جائیے۔"

نوجوان مزید دو قدم بڑھا اور کہا۔ "اب بھی نہیں۔"

ڈاکٹر نوجوان کا منشا سمجھ گیا، کاندھے سے پکڑ کر چارٹ کے اتنے قریب لے گیا کہ دونوں کے درمیان میں دو فٹ کا فاصلہ رہ گیا۔ نوجوان بھی "اب بھی نہیں، اب بھی نہیں" کی تکرار سے عاجز آ چکا تھا۔ سوچا نظر کمزور تو ثابت ہو چکی ہے۔ چارٹ پڑھ کر سنا دیا اور بولا۔ "ہاں اتنے قریب سے واقعی پڑھ سکتا ہوں۔"

ڈاکٹر نے اسے پاس کر دیا بولا "بالکل ٹھیک۔ تم دست بدست لڑائی بآسانی کر سکتے ہو!"

مقابلۂ احتیاط

ایک ہلکی پھلکی

شوخ مجرم کہانی

مجرموں کے مابین ایک

خون رنگ معرکے کی سرگزشت

جیمس روس بکوشٹ ● حسن ہاشمی

نارما سے یہ میری دسویں ملاقات تھی یہ ملاقات بھی اسی اہتمام اور احتیاط سے ہوئی تھی جو ہماری ملاقاتوں کا مخصوص انداز تھا۔ ہم دونوں ہفتے میں ایک بار شہری جھگھٹوں سے کہیں دور جا کر اپنا آشیانۂ محبت آباد کر لیتے تھے۔ آہ بے چاری نارما! اسے بیک وقت دو مردوں کو خوش کرنا پڑتا تھا۔ ایک اس کا شوہر دوسرا میں۔ لیکن نارما کے برعکس میری عادت قدرے مختلف ہے۔ میں ایک وقت میں صرف ایک لڑکی سے تعلق رکھتا ہوں۔ نارما سے پہلے بھی میری زندگی میں کئی لڑکیاں آ چکی تھیں مگر فرداً فرداً اور الگ الگ۔ میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ نارما نے مجھے میرے قریب آنے والی تمام لڑکیوں سے زیادہ متاثر کیا تھا حالانکہ میری ہر محبوبہ انتہائی حسین تھی۔ میں نے کبھی کسی کم خوبصورت لڑکی سے تعلق قائم ہی نہیں کیا مگر نارما کو پسند کرنے کی وجہ اس کی خوبصورتی یا دولت مندی نہیں تھی بلکہ میں اس کی ذہانت کا شیدائی تھا۔ وہ بلاشبہ ایک بے حد ذہین اور فطین حسینہ تھی۔ ہم دونوں کی پہلی اور اتفاقی ملاقات ایک

وقار عظیم پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

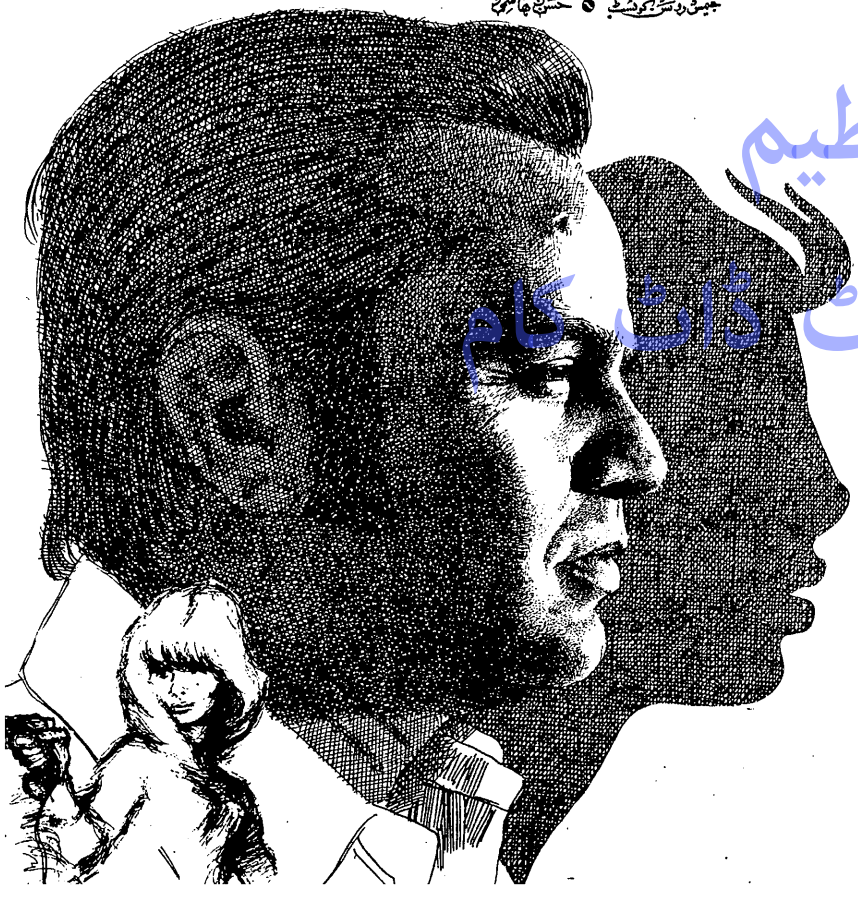

شراب خانے میں ہوئی تھی اور پہلی ہی ملاقات میں ہم دونوں ایک دوسرے کے مطلوب ہوگئے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جلد ہی تمام مرحلے طے کر لیے گئے اور ہمارے درمیان کوئی حجاب نہ رہا۔

وہ مجھ سے ملنے میں اتنی محتاط تھی اور اتنی خوبصورتی سے ملاقات کے مواقع فراہم کرتی تھی کہ کسی کو ہمارے تعلقات کا علم ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ ہفتے میں ایک مرتبہ اپنے بیمار شوہر کو نرس کے حوالے کرنے کے بعد سرِشام گھر سے نکل آتی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کی تیمارداری کے لیے مستقل طور پر ایک نرس کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ وہ نرس اس کے گھر ہی میں مقیم تھی اس کے باوجود نارما ایک رات کے سوا تمام ہفتے خود ہی اپنے شوہر کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ ہفتے میں صرف ایک مرتبہ وہ اپنے شوہر سے اجازت لے کر اپنی خوبصورت اسپورٹس کار میں سوار ہوکر گھر سے نکلتی اور شہر سے دور کسی چھوٹے سے گم نام ہوٹل میں اپنے لیے کمرہ حاصل کرتی۔ ہوٹل میں جانے سے قبل وہ اپنے چہرے کا میک اپ بالکل صاف کرلیتی اور آنکھوں پر عینک لگالیتی۔ اس طرح اُس کا حلیہ ایسا ہوجاتا تھا کہ کوئی بھی شخص اسے ایک بار دیکھ کر دوبارہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ وہ شکل سے کسی بڑے آدمی کی پرائیویٹ سکریٹری یا کوئی خشک اسکول ٹیچر نظر آنے لگتی تھی۔ ہر مرتبہ وہ مختلف ہوٹلوں میں ٹھیرتی تھی۔ کسی ایک ہوٹل میں اس نے دو مرتبہ قیام نہیں کیا تھا۔ کمرہ وہ ہمیشہ فرضی نام سے لیتی اور جب اسے کمرہ مل جاتا تو کسی پبلک بوتھ سے مجھے فون کرتی کہ وہ فلاں ہوٹل میں مقیم ہے۔ وہ مجھے یہ بھی بتادیتی تھی کہ ہوٹل میں اور کون کون سے کمرے خالی ہیں۔ کمرہ لینے سے قبل وہ اچھے سے اچھے کمرے کی فرمائش کرتی، اس طرح اسے کئی کمرے دیکھنے کو مل جاتے تھے اس کے فون کے تقریباً آدھ گھنٹے بعد میں بھی اسی ہوٹل میں پہنچ جاتا اور اپنے لیے ایک فرضی نام سے کمرہ لے لیتا اور پھر جیسے ہی موقع ملتا میں نارما کے کمرے میں چلا جاتا یا وہ میرے کمرے میں چلی آتی پھر ہم دیوانہ وار ایک دوسرے میں جذب ہوجاتے۔ ہوٹل میں عموماً کئی گھنٹے ہمارا قیام رہتا۔ ہم دونوں راز و نیاز میں کھو کر محبتوں کی شراب چھلکاتے اور جام پر جام لنڈھانے کے بعد جب ہم خوب چھک جاتے تو نارما اکیلی ہوٹل سے رخصت ہوجاتی۔ میں ہمیشہ دوسرے دن کمرہ چھوڑتا تھا تاکہ کسی کو کوئی شک نہ ہوسکے۔ بیچاری نارما جب مجھ سے بچھڑنے لگتی تو ہوٹل کے اخراجات کی رقم میرے کوٹ کی جیب میں ڈال دیا کرتی تھی۔ ان تخلیوں نے ہمیں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بنادیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم دونوں خاص ایک دوسرے کے لیے تخلیق

کیے گئے ہیں۔

نارما کی غیر معمولی احتیاطی تدابیر نے ہمارے دلوں سے افشائے راز کا اندیشہ ناپید کردیا تھا اور ہم دونوں قطعاً بے خوف ہوکر محبت کی رنگینیوں سے لذت اندوز ہوتے تھے پھر بھی نارما کا بیمار شوہر ہمارے ذہنوں پر بُری طرح چھایا ہوا تھا۔ کسی خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی بے پناہ دولت کی بنا پر۔ ہم کسی بھی صورت میں اس کی دولت سے دست بردار نہیں ہوسکتے تھے! اسے راستے سے ہٹا کر اس کی دولت پر متصرف ہونا ہمارا نصب العین تھا۔ اس مقصد کے لیے میرے ذہن میں کئی تجاویز تھیں جن پر عمل کرکے ہم جلد از جلد اپنی منزل پا سکتے تھے لیکن نارما عجلت پسند نہیں تھی۔ وہ ہر کام اطمینان سے کرنا چاہتی تھی تاکہ کوئی خطرہ پیش نہ آئے۔ اس نے ایک منصوبہ بنایا۔ اس کا منصوبہ اتنا جامع تھا کہ مجھے ایک بار پھر اس کی ذہانت کا قائل ہونا پڑا۔ واقعی اس کے منصوبے پر عمل کرنے میں کسی خطرے کا احتمال نہیں تھا۔

میں پروگرام کے مطابق بدھ کی رات کو اس سے ملا۔ مقررہ ہوٹل میں پہنچ کر میں نے بھی فرضی نام سے ایک کمرہ حاصل کرلیا۔ مسافروں کے رجسٹر پر دستخط کرتے وقت میں نے دیکھا کہ میرے نام کے اوپر ہی نارما کا فرضی نام بھی درج تھا۔ میرا کمرہ اس کے کمرے کے ساتھ ہی تھا۔ میں نے اپنا سوٹ کیس کمرے میں رکھا اور دروازے میں تالا لگائے بغیر ڈائننگ ہال میں آگیا۔ نارما نے مجھے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا لیکن ہم دونوں حسبِ معمول اجنبی بنے رہے۔ تھوڑی دیر بعد جب میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تو وہ مسہری پر میری منتظر تھی۔ میں نے خاموشی سے دروازہ بند کردیا نارما نے میرا سوٹ کیس کھولا۔ اس میں ہمیشہ کی طرح آج بھی اسکاچ کی بوتل موجود تھی اور ایک تھرماس میں برف کے ٹکڑے تھے۔

نارما نے چشمہ اتار دیا تھا اور میک اپ کرلیا تھا۔ وہ بے حد حسین نظر آرہی تھی۔ اس کے بدن سے میری پسندیدہ خوشبو کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں میرے دل و دماغ پر ایسا نشہ چھانے لگا جیسے میں نے مارٹینی کے دو جام پی لیے ہوں۔ وہ بستر پر تکیے سے ٹیک لگائے اس طرح سجی بنی بیٹھی تھی جیسے عام خواتین کسی اہم مہمان کی آمد پر تیار ہوتی ہیں۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پاکر اس نے والہانہ انداز میں ہم آغوش ہونے کے لیے باہیں پھیلادیں۔ اس کے بدن کے ہیجان انگیز نشیب و فراز اور زیادہ نمایاں ہوگئے ”آج میں ایک اوپیرا میں جانے کا بہانا کرکے گھر سے نکلی ہوں۔“ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

”بہت خوب! تو گویا آج فلم کے بجائے ثقافتی پروگرام کی باری ہے؟“ میں نے اپنے جسم کا زور ڈال کر اسے بستر پر لٹاتے ہوئے کہا۔

”اگر تمھارے بیمار شوہر نے کل صبح ناشتے کی میز پر تم سے اوپیرا کے متعلق کچھ دریافت کیا تو؟“

”اوہ اس کی فکر نہ کرو میں وہ پہلے ہی دیکھ چکی ہوں۔“ اس نے میرے سینے کے گھنے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔ ”وہ ایک ایسے آدمی کی کہانی ہے جو اپنی بدچلن بیوی کو قتل کردیتا ہے۔“

”بہت خوب۔“ کچھ توقف کے بعد میں نے کہا ”یہ بھی اچھا ہے کہ تمھارا معذور شوہر گھر سے باہر نکلنے کے قابل نہیں ہے ورنہ شاید ہم اس طرح آسانی کے ساتھ ملنے سے قاصر رہتے۔“ اس نے آہستگی سے مسکراکر اپنے رس دار ہونٹ میرے ہونٹوں میں پیوست کردیے۔

ہم دونوں تھکے ہارے بستر پر بیٹھے تھے اور بچی ہوئی شراب ختم کررہے تھے۔ نارما میری باہوں میں سمٹی مجھے بتا رہی تھی کہ آج کی شب مجھے کیا کرنا ہے۔ اس نے واقعی بڑا جامع منصوبہ بنایا تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ اتنا ماہرانہ منصوبہ میں نہیں بنا سکتا تھا۔ آج وہ اپنے ساتھ اپنے مکان کے اندرونی اور بیرونی حصوں کی تصویریں بھی لائی تھی تاکہ انھیں دیکھ کر میں مکان کا گوشہ گوشہ اپنے ذہن میں محفوظ کرلوں۔ پھر اس نے اپنے پرس سے ایک پستول نکال کر کسی ماہر نشانے باز کی طرح اُس کا چیمبر علیحدہ کیا۔ پستول کا چیمبر خالی تھا۔ بالکل خالی۔ اس میں ایک بھی گولی نہیں تھی اور یہی ہمارا منصوبہ تھا۔ میں نے اس کی ذہانت پر تعریفی انداز میں گردن ہلائی۔ اس نے اس خونیں ڈرامے کے ایک ایک پہلو پر نظر رکھی تھی۔ اس کی چالاکی دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو مجھے اس سے کچھ ڈر بھی محسوس ہوا۔ اس نے مجھ سے بار بار تفصیلات سنیں اور جب اسے یہ یقین ہوگیا کہ تمام کام اس کی مرضی کے مطابق ہوگا تو وہ مطمئن ہوگئی۔ آج مجھے اُس سے پہلے ہوٹل چھوڑنا تھا اور سیدھے اس کے گھر جانا تھا۔ ابھی رات کے گیارہ بجے تھے اور نارما کو اوپیرا ختم ہونے کے وقت یعنی ۱۲ بجے یہاں سے روانہ ہونا تھا۔

مجھے اس کے گھر پہنچ کر ایک پہلے سے کھلی ہوئی کھڑکی کے ذریعے مکان میں داخل ہونا تھا۔ اس وقت تک تیمارداری پر مامور نرس اپنے کمرے میں جاکر سوچکی ہوگی اور نارما کا مریض شوہر اپنی عادت کے مطابق بستر پر لیٹا ہوا کچھ پڑھ رہا ہوگا۔ اسے دل کی بیماری تھی۔ مجھے خاموشی سے پہلی منزل پر جانا تھا اور پھر جان بوجھ کر ایک جگہ ٹھوکر کھا کر گرنا تھا۔ اس کا

شوہر سناٹے میں کسی کے گرنے کی آواز سن کر پکارے گا کہ ”کون ہے؟“ اور اسے کوئی جواب نہیں ملتا۔ اس وقت تک اگر نرس بیدار نہ ہوئی تو نارما کا شوہر اپنے بستر کے قریب لگا ہوا برقی گھنٹی کا بٹن دباکر اسے جگانے کی کوشش کرے گا۔ گھنٹی کی آواز سن کر نیند میں ڈوبی ہوئی نرس اپنے کمرے سے نکلے گی تو اپنے سامنے ایک ایسے شخص کو پائے گی جس کا چہرہ رومال میں چھپا ہوا ہوگا اور جس کے ہاتھ میں پستول ہوگا۔ مجھے اس وقت تک کوئی حرکت نہیں کرنی تھی جب تک نرس کسی کو مدد کے لیے آواز نہ دے اس کی چیخ سن کر دل کا مریض اور بھی گھبرا جائے گا۔ پھر میں اتنی قوت سے نرس کے سر پر پستول سے ضرب لگاؤں گا کہ وہ بے ہوش ہوکر گر پڑے گی۔ پھر میں نارما کے شوہر کے کمرے کا دروازہ جھٹکے سے کھول کر دیوانوں کی طرح اندر داخل ہوجاؤں گا اور اس کی طرف رخ کرکے پستول کا ٹریگر دباؤں گا اتنی دیر میں وہ بے چارہ اتنا خوف زدہ ہوچکا ہوگا کہ ٹریگر پر میری انگلی دبتے ہی صرف گھبراہٹ میں اُس کا دم نکل جائے گا اور اگر کسی وجہ سے اس کا دم نہ نکلا تو مجبوری ہوگی کیونکہ پستول خالی ہوگا۔ ایسی صورت میں ہم کسی دوسرے موقع کے لیے کچھ دن اور انتظار کرنا پڑے گا۔ نارما نے مجھے بتایا تھا کہ اگر یہ خوف اس کی جان لینے کے لیے ناکافی ثابت ہوا تو بھی کم از کم اتنا ضرور ہوجائے گا کہ اس کا دل اور کمزور ہوجائے گا اور دوسری مرتبہ اسے قتل کرنے میں بڑی آسانی رہے گی۔

”اور پھر کیا ہوگا ڈارلنگ؟“ میں نے نارما کی خوبصورت گردن چومتے ہوئے پوچھا۔

”پھر.... پھر میں اس کی تمام دولت کی تنہا مالک ہوں گی اور میرے مالک تم ہوگے۔ ہم دونوں کہیں دور چلے جائیں گے۔ بہت دور جہاں کوئی ہمارا جاننے والا نہیں ہوگا۔“ میں نے آخری مرتبہ اُسے پیار کیا اور تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

ہر بات ہمارے منصوبے کے عین مطابق ہوئی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ مجھے پہلی منزل پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی کیونکہ نارما تصویریں دکھا چکی تھی یہ جگہ مجھے مانوس معلوم ہورہی تھی۔ ایک کمرے سے ہلکی چھن چھن کر باہر آرہی تھی یہ اس کے شوہر کا کمرہ تھا۔ میں ایک جگہ لڑکھڑا کر گرا۔ اس کے شوہر کی خوف زدہ آواز بلند ہوئی۔ پہلے تو اس نے نارما کو آواز دی پھر فوراً نرس کو پکارا لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کی آواز سے گھبراہٹ اور خوف کا پتہ چل رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت کا چہرہ دہشت سے سفید پڑگیا ہوگا اور اس کے بیمار دل کی دھڑکن

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

دم تیز ہو گئی ہوگی۔ اُسی وقت مجھے گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ میں تاریک راہداری میں کھڑا ہوا نرس کے باہر آنے کا انتظار کرتا رہا۔ چند لمحوں میں وہ آنکھیں ملتی ہوئی کمرے سے نکلی تو اس نے مجھے اپنے سامنے کھڑا ہوا دیکھ کر بے ساختہ چیخ ماری۔ میں نے تیزی سے پوری قوت کے ساتھ اس کے سر پر ریوالور رسید کر دیا۔ اس کے منہ سے ایک اور چیخ بلند ہوئی اور وہ لڑکھڑا کر دھم سے فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کے گرتے ہی نارما کے شوہر کی گھبرائی ہوئی چیخ بھی سنائی دی۔ میں نے تیزی سے اس کے کمرے کے دروازے پر ٹھوکر ماری اور دندناتا اندر گھس گیا لیکن میرا اندر جانا فضول ثابت ہوا کیونکہ نارما کا شوہر آدھے دھڑ سے اپنے بستر پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ اس کا منہ کھلا تھا اور آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ چیخ کے دوران ہی مر گیا ہو۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ نارما نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ خوف اُس کے لیے اتنا شدید تھا کہ اُس کے کمزور دل نے دھڑکنا بند کر دیا اور اُس کی جان نکل گئی۔

اسی وقت مجھے نچلی منزل سے کسی کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے آواز پہچان لی، یہ نارما تھی۔ اُس کے قدموں کی چاپ نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی، وہ بالکل ٹھیک وقت پر پہنچی تھی۔ "کیا سب کام ٹھیک ہو گیا؟" اُس نے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے سرگوشی کی۔

"سرگوشیوں کی ضرورت نہیں ہے میری جان!" میں نے کہا "اب تم ایک مالدار عورت بن چکی ہو۔" میری بات سن کر وہ دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گئی۔ خوشی سے سرشار ہو کر اُس نے میرے چہرے پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔ یکایک مجھے اپنی پشت سے ایک بارعب آواز سُنائی دی۔ "بہت ہو چکا میرے دوست! اب اپنا رُخ اس طرف کر لو۔"

میں نارما سے علیحدہ ہو کر مُڑا۔ نارما کا مُردہ شوہر ہاتھ میں پستول لیے ہوئے اپنے بستر پر بیٹھا ہمیں گھور رہا تھا۔ اسی لمحے مجھے ایک قہقہہ سُنائی دیا۔

نارما میرے عقب میں کھڑی کھِل کھِلا کر ہنس رہی تھی اور میں ہونقوں کی طرح کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پریشانی اور الجھن میری آنکھوں سے مترشح تھی۔ مجھے پریشان دیکھ کر نارما نے کہا۔ "تمام کام بالکل ٹھیک ہوا ہے مائی ڈیئر! تم نے نرس کے بجائے نارما کو قتل کر دیا ہے اور اطلاعاً عرض ہے کہ میں نارما نہیں ہوں بلکہ نرس ہوں۔" پھر وہ خوشی سے لہک لہک کر بتانے لگی۔ "دراصل میں بیمار نارما کی خدمت کے لیے یہاں بلائی گئی تھی۔ نارما دل کی مریضہ تھی۔ تم بتاؤ ایسی عورت مرد کے لیے کس کام کی؟ چنانچہ میں نے بڑی آسانی سے اُس کی جگہ لے لی۔ رفتہ رفتہ ہماری دوستی محبت میں تبدیل ہو گئی۔" اُس نے بستر پر بیٹھے ہوئے مرد کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "ہم دونوں نے مل کر نارما کو قتل کرنے کا پروگرام مرتب کیا تھا کیونکہ طلاق کی صورت میں ہمیں نارما کی کثیر دولت سے محروم ہونا پڑتا۔ نارما کے قتل کے لیے ہمیں ایک تیسرے شخص کی تلاش تھی اگر ہم خود اُسے قتل کرتے تو ہمارے پکڑے جانے کا اندیشہ تھا۔" اُس کے لہجے میں درشتی پیدا ہو گئی۔ "نارما کا قتل تم نے کیا ہے۔ دہشت زدہ نارما ضرب کی تاب نہ لا کر مر چکی ہے۔ تم ایک انجانے گھر میں چوروں کی طرح داخل ہوئے ہو اور کوئی بھی شخص اپنے گھر میں کسی چور کو قتل کر دینے کا پورا حق رکھتا ہے جبکہ اس چور نے اس کی بیوی پر قاتلانہ حملہ بھی کیا ہو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تمھارے ہاتھ میں جو پستول ہے، وہ خالی ہے۔"

میں خاموش کھڑا تھا اور وہ دونوں اپنی کامیابی اور میری بے بسی پر خوش ہو رہے تھے۔ میں نے اپنے پستول کا رُخ نارما کے شوہر کی جانب کیا۔ میری اُنگلیوں میں جنبش ہوئی اور چشم زدن میں گولی اُس کا بھیجا پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ گولی کی آواز سُنتے ہی نارما کی ہنسی ایک دم رُک گئی۔ وہ پاگلوں کی طرح مجھے گھور رہی تھی۔ اب میری باری تھی۔ میں نے پستول کا رُخ اُس کی جانب کرتے ہوئے کہا۔ "میری گڑیا! تم نے تمام کام ٹھیک کیا تھا لیکن یہ بھول گئی تھیں کہ میں ایک خاصا معقول شخص ہوں اور کسی اجنبی گھر میں غیر مسلح داخل ہونے کا خطرہ کبھی مول نہیں لے سکتا۔ میں نے ہوٹل سے نکلتے ہی پستول میں گولیاں بھر لی تھیں کیونکہ منصوبے کی ناکامی کی صورت میں مجھے اپنا دفاع بھی تو کرنا تھا۔"

وہ خوف زدہ ہو کر ٹکٹکی باندھے مجھے گھور رہی تھی۔ ممکن تھا کہ میں اُسے معاف کر دیتا لیکن دُہری چال چلنے والے شخص کو بخشنا میرے مسلک میں گناہ ہے۔ میرے پستول سے بیک وقت دو گولیاں نکلیں اور اُس کا سینہ خون کے آنسو رونے لگا۔

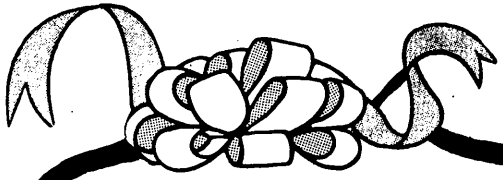

بنجمن فرینکلن

کی دکان میں ایک گاہک داخل ہوا اور کتابیں اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ سیل مین اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ گاہک کافی وقت ضائع کرنے کے بعد ایک کتاب کھول کر پڑھنے لگا۔ پھر جب اُسے وقت کی بربادی کا کچھ احساس ہوا تو کتاب کی ورق گردانی بند کر دی اور سیل مین کی طرف کتاب بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ "جناب اس کتاب کی قیمت کیا ہے؟"

سیل مین نے جواب دیا۔ "ایک ڈالر"

بے فکرے گاہک نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ایک ڈالر تو بہت ہے، کچھ کم نہیں کرو گے؟"

سیل مین نے اکتا کر جواب دیا۔ "جناب! یہ قیمت میں نے مقرر نہیں کی ہے۔ کمپنی نے رکھی ہے!"

گاہک نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ "مسٹر فرینکلن کہاں ہیں؟"

سیل مین نے اندر دفتر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہاں دفتر میں موجود ہیں!"

"میں ان سے ملنا چاہتا ہوں!"

"اس وقت وہ بہت مصروف ہیں!"

گاہک نے ملنے پر اصرار کیا تو سیل مین نے کہا۔ "اچھا آپ یہیں تشریف رکھیں، میں انھیں مطلع کرتا ہوں۔ اگر انھوں نے مُلاقات پر آمادگی کا اظہار کیا تو میں آپ کو ملا دوں گا!"

سیل مین اندر دفتر میں چلا گیا، تھوڑی دیر بعد جب واپس آیا تو مسٹر فرینکلن بھی اس کے ساتھ تھے۔ سیل مین نے گاہک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جنابِ والا! یہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں!"

فرینکلن نے سر سے پیر تک گاہک کو دیکھا لیکن وہ اسے پہچان نہیں سکے، پوچھا۔ "جناب معاف کیجیے، میں آپ کو پہچان نہیں سکا!"

گاہک نے نہایت تپاک سے ہاتھ ملایا اور کہا۔ "بے شک آپ مجھے کس طرح پہچان سکتے ہیں جبکہ ہم دونوں ایک دوسرے سے پہلی بار مل رہے ہیں!"

فرینکلن نے سوال کیا۔ "مجھ سے کوئی کام؟"

گاہک نے اپنی پسندیدہ کتاب فرینکلن کے سامنے رکھ دی اور کہا۔ "جنابِ والا! آپ کا سیل مین اس کتاب کی قیمت ایک ڈالر بتاتا ہے لیکن میں اس پر مُصر ہوں کہ یہ قیمت زیادہ ہے۔ کیا آپ اس کی قیمت میں کچھ کمی کر سکتے ہیں؟"

فرینکلن نے کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھا پھر جواب دیا۔ "اب اس کتاب کی قیمت سوا ڈالر ہو گئی ہے۔ سوا ڈالر ادا کر کے کتاب لے جائیے۔"

گاہک حیران ہو گیا، بولا۔ "واہ جناب، یہ تو ایک ہی رہی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو آپ کے سیل مین نے اس کی قیمت ایک ڈالر بتائی تھی اور اب آپ سوا ڈالر فرما رہے ہیں؟ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟"

فرینکلن نے جواب دیا۔ "اگر آپ مجھے طلب نہ فرماتے اور مجھے اپنا ضروری کام چھوڑ کے یہاں نہ آنا پڑتا تو میرا سیل مین اس کتاب کو ایک ڈالر ہی میں فروخت کر دیتا!"

گاہک ہنسنے لگا۔ "خوب! خوب! یہ خوب رہی۔ اچھا تو اب آپ یہ بتائیے کہ اس کتاب کی آپ مجھ سے کم سے کم کیا قیمت لینا پسند فرمائیں گے؟"

فرینکلن نے متانت سے جواب دیا۔ "صرف ڈیڑھ ڈالر!"

گاہک اچھل پڑا، بولا۔ "یہ کیا یہ کیا، یعنی ایک سے سوا اور سوا سے ڈیڑھ ڈالر! یعنی یہ آپ کیا فرما رہے ہیں، آخر اس کتاب میں خصوصیت کیا ہے جو آپ اس کے دام بڑھاتے چلے جا رہے ہیں؟"

فرینکلن نے جواب دیا۔ "میں کتاب کی قیمت میں اپنے وقت کی قیمت بھی شامل کرتا جا رہا ہوں۔ ذرا دیر بعد اس کی قیمت دو ڈالر ہونے والی ہے۔"

گاہک نے فوراً جیب سے ڈیڑھ ڈالر نکال کر فرینکلن کے حوالے کیے اور کتاب لے کر جاتے ہوئے بولا۔ "مسٹر فرینکلن! آپ نے اس وقت مجھے جو سبق دیا ہے اُسے میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ!"

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

ایک بے قرار عورت کی کہانی
جس کے پڑھنے سے بہتوں کو قرار آئے گا

عشق مذاب

ایوونیکا پارکر جونس ✿ ڈاکٹر مقبول حسین

الزبیتھ کوئی کام ادھورا نہیں رہنے دیتی تھی اور آج کا کام کل پر چھوڑنے کی قائل نہیں تھی' ایسا نہیں تھا کہ اسے کل کے آنے کا بھروسا نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ بے حد محتاط قسم کی عورت تھی' خاص طور پر اپنے دوستوں سے خفیہ ملاقاتیں کرنے میں وہ بے حد احتیاط سے کام لیتی تھی کیونکہ وہ مسٹر والٹر کی بیوی تھی اور مسٹر والٹر ایک ذی حیثیت آدمی تھے مسٹر والٹر کے گھر میں اسے ہر قسم کی آسائش میسر تھی' مسٹر والٹر کو اگر یہ علم ہو جاتا کہ وہ نامحرموں کے ساتھ کسی طور وابستہ رہتی ہے تو وہ اس کی اس کمزوری کی بنیاد پر آسانی کے ساتھ عدالت سے طلاق کی درخواست کر سکتے تھے۔ بیوی بے وفا ہو تو عدالت فوراً طلاق کا حکم صادر کر دیتی ہے اور بیوی کو شوہر کی جائداد میں سے نصف حصہ بھی نہیں ملتا۔ گزارا الاؤنس کے بھی لالے پڑ جاتے ہیں' ان دونوں چیزوں کی بیوی صرف اسی صورت میں حق دار ہوتی ہے کہ قصور شوہر کا ہو اور طلاق کے لیے عدالت کا دروازہ بیوی کھٹکھٹائے۔

الزبیتھ کو معلوم تھا کہ اس کا شوہر اپنی سکریٹری مینرل کی جانب ملتفت ہے لیکن وہ اس کا ثبوت کس طرح حاصل کرتی؟ اس کے علاوہ اسے اپنے شوہر سے طلاق لینے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ جہاں اس کا شوہر اپنی سکریٹری سے دوستی استوار کر رہا تھا، وہاں الزبیتھ اس کی سکریٹری کے شوہر سے دوستی بڑھا چکی تھی۔ اس طرح حساب برابر ہو جاتا تھا۔ شادی کے بعد سے اب تک یہ اس کی چوتھی دوستی تھی۔

الزبیتھ نے شادی سے پہلے بھی کئی دوستیاں کی تھیں جن کا تھوڑا بہت اندازہ اس کے شوہر کو تھا لیکن شبِ عروسی کو اس کے شوہر نے اسے معاف کر دیا تھا۔ شادی کے بعد وہ ایک عرصے تک صرف شوہر سے متعلق رہی تھی لیکن پھر اپنے شوہر کی شدید مصروفیت' اپنے مزاج کے تلوّن' تفریحِ طبع' موقع کی موجودگی اور یونہی کچھ زندگی میں رنگ ترنگ کے لیے جلد ہی وہ اپنے شوہر سے اکتا گئی' پھر یہ سلسلہ بڑھتا رہا۔ وہ اپنے پہلے دوست سے بیزار ہوئی پھر دوسرے سے' پھر تیسرے سے' اور اب وہ اپنے چوتھے دوست ریمنڈ سے بھی اکتا گئی تھی۔

ریمنڈ سے اس کی ملاقات چار مہینے قبل ہوئی تھی' اس زمانے میں اس کا کوئی دوست نہ تھا اور وہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ادھر ادھر ڈولتی پھر رہی تھی' ایک روز ریمنڈ نے اسے ٹیلیفون کیا۔ "میرا نام ریمنڈ ہے مادام۔" اس نے کہا۔ "میں آپ کے شوہر کی سکریٹری مینرل کا شوہر ہوں۔ کیا کل آپ کے شوہر اپنی سکریٹری یعنی میری بیوی کے ساتھ شہر سے باہر گئے ہیں؟"

"جی ہاں تشریف لے گئے ہیں۔ کاروباری سلسلے میں۔" الزبیتھ نے جواب دیا۔

"کاروباری سلسلہ! خوب' مسز والٹر! میں دراصل اسی سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں' میں آپ کو بتاؤں گا کہ اس کاروباری سلسلے کی تہہ میں کیا راز پوشیدہ ہے' کیا آپ مجھ سے ملاقات کرنا پسند کریں گی؟" ریمنڈ نے دریافت کیا۔

الزبیتھ کے لیے یہ اطلاع بہت دلچسپ تھی' وہ کبھی اپنے شوہر کی سکریٹری سے نہیں ملی تھی' البتہ والٹر اس کے سامنے عادت کے مطابق اپنی سکریٹری کا ذکر کرتا رہتا تھا کہ وہ کس قدر ہوشیار' ذہین اور محنتی ہے اب مینرل کے شوہر کی زبانی یہ خبر سن کر الزبیتھ کو اس کی قابلیت پر شبہ ہونے لگا تھا کہ مینرل کو ٹائپ کرنا بھی آتا ہے یا نہیں؟ یہ بالکل فطری بات ہے کہ وہ اس سلسلے میں اور کچھ بھی جاننا چاہتی تھی' اس نے مینرل کے شوہر کو فوراً اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی۔

آدھے گھنٹے بعد ریمنڈ اس کے گھر میں موجود تھا۔ "آہ مسز والٹر!" ریمنڈ نے حیرت سے کہا۔ "آپ اپنی تصویروں سے کہیں زیادہ خوبصورت ہیں' میں نے کل اخبار میں آپ کی وہ تصویر دیکھی تھی جس میں آپ ایک خیراتی شو کی صدارت کر رہی تھیں۔"

الزبیتھ اکثر خیراتی اداروں کے جلسوں اور ورائٹی پروگراموں کی صدارت کرتی رہتی تھی' خیراتی اداروں کی امداد کے لیے اسے عطیات بھی دینے پڑتے تھے' والٹر نے کبھی اس کے ان اخراجات پر اعتراض نہیں کیا تھا اسے خود ان کاموں کے لیے فرصت نہیں ملتی تھی' اس لیے وہ اپنی بیوی کا ممنون تھا کہ وہ اس کی طرف سے سماجی اور معاشرتی سرگرمیوں میں حصہ لے کر اسے ایک بڑے دردِ سر سے بچا لیتی ہے۔ الزبیتھ کی تصویریں اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتی رہتی تھیں' والٹر سے شادی کے بعد معاشرے میں اسے ایک بلند مقام مل گیا تھا' یہی وجہ تھی کہ وہ والٹر سے طلاق لینے کے بارے میں کبھی سوچتی بھی نہیں تھی جب ریمنڈ نے اسے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

ٹیلیفون پر یہ بتایا تھا کہ والٹر اپنی سکریٹری سے عشق لڑا رہا ہے اُس وقت بھی الزبیتھ کے ذہن میں والٹر سے طلاق لینے کا خیال نہیں آیا تھا۔ آخر وہ اُس سے طلاق لے کر ایک بلند مقام اور عیش و عشرت کی زندگی کو کیوں ٹھوکر مارے؟ رہا شوہر کی بے وفائی کا معاملہ تو وہ خود کب شوہر کی وفادار تھی؟ اس نے ریمنڈ کو اپنے گھر آنے کی صرف اس لیے دعوت دی تھی کہ عورتوں میں تجسس کا مادّہ بہت ہوتا ہے اور وہ ایک عورت تھی۔

ریمنڈ، ہینرل اور والٹر کی دوستی پر زیادہ روشنی نہیں ڈال سکا مگر اسی روز سے الزبیتھ کا دوست ضرور بن گیا۔ بعد میں الزبیتھ کو شبہ ہوا کہ کہیں ریمنڈ نے صرف اُس سے ملاقات کرنے کے لیے تو یہ افسانہ نہیں تراشا تھا لیکن جلد ہی اس نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ ریمنڈ ایک عمدہ پرستار ثابت ہوا تھا اس لیے الزبیتھ نے اس کی بیوی اور اپنے شوہر کے درمیان غیر کاروباری تعلقات کی موجودگی کا کوئی اثر نہیں لیا۔

دوسرے روز اس نے اپنی ایک ملازمہ کو نکال دیا کیونکہ وہ ملازمہ ریمنڈ کو اس کے گھر آتا ہوا دیکھ چکی تھی۔ وہ کسی بھی وقت والٹر سے اس امر کا تذکرہ کر سکتی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں ایک غیر مرد اس کے گھر آیا تھا۔ ویسے بھی وہ ملازمہ نکمّی تھی۔ الزبیتھ اس کی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھی، خود وہ ملازمہ بھی الزبیتھ سے خوش نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی الزبیتھ کئی ملازماؤں کو نکال چکی تھی۔ اس کے شوہر کی نظر میں اس کا ملازمائیں رکھنا اور نکالنا ایک مشغلے کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ وہ کبھی اس کے معاملات میں دخل نہیں دیتا تھا۔

صرف چار مہینوں میں اس کا دل ریمنڈ سے اکتا گیا لیکن ریمنڈ تو جونک کی طرح اس سے چپک کر رہ گیا تھا۔ غسل کے ٹب میں وہ گرم گرم پانی سے نہاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اسے اب اپنے اس چوتھے محبوب سے بھی چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیے۔ جب وہ نرم تولیے سے اپنی نرم خوبصورت جلد صاف کر رہی تھی تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آج ہی ریمنڈ سے نجات حاصل کر لے گی اور ریمنڈ کو اُس کی کڑوی باتیں میٹھی گولیوں کی طرح نگلنی پڑیں گی۔ وہ آج ہی ریمنڈ کو صاف صاف بتا دے گی کہ اب وہ اُس سے اُکتا چکی ہے اور ریمنڈ آئندہ کبھی اس سے ملنے کی کوشش نہ کرے۔

ریمنڈ سے نجات حاصل کرنی اس لیے بھی ضروری تھی کہ وہ اس معاملے میں بہت مخلص ہو گیا تھا۔ وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنی بیوی سے طلاق لینے کے متعلق غور کر رہا تھا اور الزبیتھ کو مجبور کر رہا تھا کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ ظاہر ہے الزبیتھ اتنی بیوقوف نہیں تھی کہ وہ والٹر سے طلاق لے کر اس قلاّش آدمی سے شادی کر لیتی؟ وہ ریمنڈ کی خاطر ٹھاٹ باٹ کی زندگی سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ احمق اتنا دیوانہ ہو گیا تھا کہ ایک ہفتے سے اپنے گھر بھی نہیں گیا تھا۔ اس نے ہینرل سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور اس کمرے میں رہ رہا تھا جو اس نے الزبیتھ سے خفیہ ملاقاتوں کے لیے ایک گھٹیا سی عمارت میں کرائے پر لیا تھا۔ الزبیتھ بے وقوف نہیں تھی، اس نے اپنے نام سے کوئی گوشۂ عافیت لینے کے بجائے ریمنڈ کو مجبور کیا تھا کہ وہ اپنے نام سے ایک کمرہ کرائے پر لے لے۔ کمرے کا کرایہ الزبیتھ ہی برداشت کرتی تھی لیکن وہ خود اپنے ہاتھ سے کرایہ کبھی نہیں دیتی تھی، وہ ہر مہینے ریمنڈ کو پیسے دے دیا کرتی تھی۔ ریمنڈ مالک مکان کو اپنے ہاتھ سے کرایہ ادا کرتا تھا۔ وہ ریمنڈ سے ہر ملاقات بے حد احتیاط کے ساتھ کرتی تھی، ان معاملات کا اسے خوب تجربہ تھا، اس لیے اس کی احتیاطی تدابیر قطعاً کامیاب تھیں، اس صورت میں اگر اس کے شوہر کو اس کی بے وفائی کا شک ہو بھی جاتا تو وہ اس کے خلاف کسی قسم کا کوئی ثبوت حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس قدر احتیاط اس لیے ضروری تھی کہ اگر کبھی والٹر اسے طلاق دینے کی کوشش کرے تو کوئی معقول ثبوت نہ ہونے کے باعث ایسا کرنے سے قاصر رہے۔

رات کا اندھیرا اور دوپہر کی روشنی ایسی ملاقاتوں کے لیے موزوں ترین وقت تھے، دوپہر کے وقت مرد عموماً روزی کے چکر میں گھروں سے باہر ہوتے ہیں، اس نے جس عمارت میں کمرہ کرائے پر لیا تھا اُس کی کوٹھریوں میں زیادہ تر کنوارے لوگ رہتے تھے۔ وہ سب نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے صبح اپنے کاموں پر چلے جاتے تھے۔ اور رات گئے جوان لڑکیوں کے ساتھ اپنے اپنے کمروں میں واپس آتے تھے، صبح سے شام تک سنّاٹا رہتا تھا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ابھی لباس تبدیل کر کے ریمنڈ سے ملنے جائے گی تاکہ دو ٹوک گفتگو کر کے اُس کی ہر توقع اور ہر غلط فہمی دُور کر دے۔ ریمنڈ گھر چھوڑنے کے بعد تقریباً ہر وقت اسی کمرے میں رہتا تھا۔

"الزبیتھ! الزبیتھ!" اسے اچانک اپنے شوہر کی آواز سنائی دی۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کہ والٹر دوپہر کے وقت گھر کیوں لوٹ آیا؟ "تم! اس وقت؟ میری قسمت کا تارہ آج دوپہر کو کیسے چمک گیا؟" الزبیتھ نے غسل خانے سے چلّا کر پوچھا۔

"ایک چھوٹا سا حادثہ ہو گیا ہے ڈارلنگ! کوئی خاص بات نہیں ہے کیا تم نہا چکیں؟" والٹر نے بلند آواز سے کہا۔

"ابھی آئی۔" الزبیتھ جلدی سے گاؤن پہن کر باہر آ گئی۔

والٹر بستر پر دراز تھا۔ اس کے ایک پاؤں میں جوتا تھا اور دوسرا پاؤں سفید پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ الزبیتھ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ والٹر اندر تک کس طرح آیا ہو گا؟ اس نے اپنے شوہر سے سوال کیا تو جواب ملا "اوہ۔ دفتر سے ہینرل، میری سکریٹری مجھے یہاں لائی ہے۔ وہ باورچی خانے میں میرے لیے کافی بنا رہی ہے۔ یہ ملازمہ کہاں گئی؟" والٹر نے پوچھا۔

"آج اس کی چھٹی کا دن ہے! تمھیں کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔" الزبیتھ نے جواب دیا۔ "کیا تمھاری سکریٹری۔ کیا نام ہے اُس کا۔ ہاں ہینرل کھانا پکانا بھی جانتی ہے؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں، وہ بہت عمدہ کھانے پکاتی ہے۔"

"آخر یہ حادثہ ہوا کیسے؟"

"میں لنچ کے لیے دفتر سے نکلا تھا، تمھیں معلوم ہے میں ہوٹل تانیا میں کھانا کھاتا ہوں وہاں کا کھانا بہت عمدہ ہوتا ہے، میں ہمیشہ دفتر سے ہوٹل تک پچھلی گلی سے جاتا ہوں، وہ سنسان پڑی رہتی ہے۔ پتہ نہیں وہ کون احمق تھا۔ بالکل اناڑی معلوم ہوتا تھا۔ وہ زنّاٹے سے گاڑی دوڑاتا ہوا آیا تھا، اگر مجھے آدھے سیکنڈ کی دیر ہو جاتی تو میں زندہ نہ بچتا۔ قسمت اچھی تھی۔ میں اُچھل کر پیچھے ہٹا پھر بھی گاڑی کا پہیا میرا پاؤں روندتا ہوا چلا گیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ گاڑی چوری کی تھی اور اسے چلانے والا ڈاکوؤں کا کوئی ساتھی تھا۔ اس نے سنسان گلی میں گاڑی کھڑی کی تھی تاکہ جب اس کے ساتھی کوئی دکان یا بینک لوٹ کر بھاگتے ہوئے آئیں تو فوراً اس میں فرار ہو سکیں، میں دفتر سے نکل کر اس گاڑی کے قریب سے گزرا تھا تو میری اور اس کے ڈرائیور کی نظریں چار ہوئی تھیں اس وقت بھی گاڑی کا انجن متحرک تھا، میرا خیال ہے کہ چونکہ میں نے اسے اس حالت میں دیکھ لیا تھا اس لیے وہ خوف زدہ ہو کر اپنے ساتھیوں کو اطلاع دیے بغیر وہاں سے بھاگا، اس نے سوچا ہو گا کہ چونکہ میں نے اسے دیکھ لیا ہے اس لیے میں ڈاکے کے بعد نہ صرف اس کا حلیہ پولیس کو بتا دوں گا بلکہ پکڑے جانے پر اس کی شناخت بھی کر لوں گا۔"

"کیا تم اسے شناخت کر سکو گے؟" الزبیتھ نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ نہیں۔ کیونکہ جب میری اور اس کی نظریں ملی تھیں تو اس وقت میرا ذہن کسی اور طرف تھا، میں نے گاڑی اچھی طرح نہیں دیکھی، ممکن ہے سامنے آنے پر میں اسے پہچان لوں۔" والٹر نے جواب دیا۔

"تم نے گاڑی کا نمبر نوٹ کیا ہے والٹر؟"

جالینوس

نہ صرف ایک بہت بڑا طبیب تھا بلکہ اتنا ہی بڑا فلسفی بھی تھا، لوگ اس کے پاس صرف علاج ہی کی غرض سے نہیں آتے تھے بلکہ علم و دانش کی پیاس بھی بجھانے آتے تھے۔ اس کے آس پاس سوال کرنے والوں کی قطاریں تھیں اور جالینوس دونوں قطاروں کے درمیان آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا اور کبھی رُکتا ہُوا سوالات کرنے والوں کے جوابات دے رہا تھا۔

سوال کرنے والوں میں ایک عُمر رسیدہ عبادت گزار بھی کھڑا تھا، جب جالینوس اس کے قریب پہنچا تو بوڑھے زاہد نے سوال کیا۔ "جالینوس کیا ایسا ممکن ہے کہ ایک فانی انسان دیوتاؤں کا مرتبہ حاصل کر لے؟"

جالینوس نے جواب دیا "ایسا بالکل ممکن ہے۔"

بوڑھے نے پوچھا "وہ کس طرح؟"

جالینوس نے کہا "اگر کوئی فانی انسان اپنی ذات میں بچّوں کی چار عادتیں پیدا کر لے تو یہ دیوتاؤں کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔"

۱۔ بچّوں جیسی کھانے کی طرف سے بے فکری۔

۲۔ جو شے بھی ملے اسے دُوسرے دن کے لیے بچا کر نہ رکھنے کی عادت۔

۳۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے کے بعد بغض و عناد نہ رکھنے کی عادت۔

۴۔ کسی سے تکلیف اٹھانے پر اس کی شکایت نہ کرنے کی طینت۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

والٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر بتانے لگا " ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ ایک ہفتے میں میرا پاؤں ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ایک ہفتے تک دفتر نہیں جا سکوں گا ڈارلنگ! ہیزل روزانہ یہاں چند گھنٹوں کے لیے آیا کرے گی تاکہ میں ضروری ڈاک دیکھ کر اسے جوابات وغیرہ لکھوا سکوں تم فکر نہ کرو، ہم لوگ زیادہ شور وغیرہ نہیں کریں گے۔" والٹر نے کہا۔

اسی وقت والٹر کی سکریٹری کافی کی ٹرے ہاتھ میں اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ الزبیتھ نے پہلی مرتبہ ہیزل کو دیکھا۔ اس نے بہت غور سے اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آخر ہیزل میں ایسی کون سی خاص بات ہے کہ والٹر اس پر فریفتہ ہو گیا ہے اور ایسی کون سی کمی ہے کہ اس کا شوہر اس سے بیزار ہو کر میرے لیے دیوانہ بنا ہوا ہے اور ایک ہفتے سے گھر چھوڑے بیٹھا ہے۔ والٹر نے دونوں عورتوں کا تعارف کرایا۔ پھر الزبیتھ معذرت کر کے لباس تبدیل کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں آگئی۔ چونکہ ہیزل کھانا پکانا جانتی تھی اس لیے اب اسے والٹر کے کھانے کی فکر نہیں تھی اور اپنے پروگرام کے مطابق وہ اطمینان کے ساتھ ہیزل کے شوہر ریمنڈ سے ملاقات کر سکتی تھی۔

♣

جب الزبیتھ اپنی احتیاطی تدابیر پر عمل کرتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تو کمرے کی حالت بہت خراب تھی۔ ہر چیز اوندھی سیدھی پڑی تھی۔ ریمنڈ گزشتہ جمعے سے اسی کمرے میں قیام پذیر تھا۔ اس نے الزبیتھ سے مشورہ کیے بغیر اپنی بیوی کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ اگر وہ یہ قدم اٹھانے سے پہلے الزبیتھ سے مشورہ کرتا تو الزبیتھ بڑی سختی سے اس اقدام کی مخالفت کرتی۔ اس نے یہ احمقانہ قدم اُٹھانے کے بعد اسے اس کی اطلاع دی تھی۔ الزبیتھ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اب بھی اس نے احمق اور خوش فہم ریمنڈ کی آنکھیں نہ کھولیں تو اس سے گلو خلاصی محال ہو جائے گی۔ آج وہ اسی بات کا تہیہ کر کے آئی تھی۔ ریمنڈ اپنے خیالات میں اتنا غرق تھا کہ اسے الزبیتھ کی آمد کا احساس تک نہیں ہوا۔ الزبیتھ نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے دو انگلیاں منہ میں رکھ کر سیٹی کی تیز آواز نکالی۔ ریمنڈ چونک پڑا۔ الزبیتھ نے کچھ دیر تک اس سے غیر رسمی قسم کی باتیں کیں اور جب فضا تیار ہو گئی تو اس نے صاف طور پہ کہا کہ " ریمنڈ! تم ایک اذیت ناک بات سننے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں تم سے کہنے آئی ہوں کہ میں اب تم سے محبت نہیں کرتی۔"

" کیا!" ریمنڈ حیرت زدہ رہ گیا۔ " کیا تم ہوش و حواس میں ہو لز؟"

" ہاں۔ میں پورے ہوش میں ہوں ـــــــــــ

ـــــــ میں اب تم سے محبت نہیں کرتی۔ میری فطرت ہی کچھ ایسی ہے۔ میں کبھی ٹوٹ کر کسی سے پیار کرتی ہوں اور کبھی اس سے بالکل محبت محسوس نہیں کرتی میری مانو۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم اپنی بیوی ہیزل کے پاس واپس چلے جاؤ۔"

" خوب۔ یہ مشورہ تم ایک ایسے شخص کو دے رہی ہو جس نے آج اپنی جان پر کھیل کر تمہیں ایک دولت مند بیوہ بنانے کی کوشش کی تھی۔" ریمنڈ نے کہا۔

الزبیتھ وہ تمام مکالمے بھول گئی جو اس نے اس موقع کے لیے سوچ کر رکھے تھے۔ " وہ ــــ وہ تم تھے ریمنڈ؟" الزبیتھ نے حیرت سے پوچھا۔ " اُس گاڑی میں؟ اس سنسان گلی میں؟ تم ہی نے والٹر کو کچلنے کی کوشش کی تھی؟"

" ہاں" ریمنڈ نے فخر سے اعتراف کیا۔ " میں ہیزل سے بات کرنے تمہارے شوہر کے دفتر گیا تھا۔ میں چند ضروری چیزیں گھر بھول آیا ہوں، مجھے ان کی شدید ضرورت تھی، ہیزل نے دفتر میں مجھ سے گفتگو کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے مجھے گھر کی چابی دینے سے بھی انکار کر دیا اور کہا کہ میں کسی روز شام کے وقت گھر پہنچ کر اس سے تفصیلی گفتگو کروں۔ میں سمجھ گیا۔ وہ چاہتی ہے کہ کسی قسم کی مصالحت ہو جائے اور ہم دوبارہ گھر میں رہنے لگیں۔ میں نے اُس سے کہا کہ اسے جو بات کرنی ہے یہیں کرے لیکن اس نے جواب دیا کہ وہ اس وقت بہت مصروف ہے کیونکہ مسٹر والٹر اسے چند خطوط کے جواب لکھوانا چاہتے ہیں، یہ کہہ کر وہ تمہارے شوہر کے کمرے میں چلی گئی۔ اسی وقت اچانک مجھے وہ باتیں یاد آئیں جو تم نے مجھے اپنے شوہر کے بارے میں بتائی تھیں کہ وہ کس ہوٹل میں کھانا کھاتا ہے اور ہوٹل پہنچنے کے لیے کس گلی سے گزرتا ہے۔ پھر اچانک میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اگر تمہارا شوہر مر جائے تو اس کے تمام اثاثوں کی وارث تم قرار پاؤ گی اور والٹر کی موت کے بعد جب تمہارے پاس دولت آ جائے گی اور تم آزاد ہو جاؤ گی تو ہم آسانی سے شادی کر لیں گے۔"

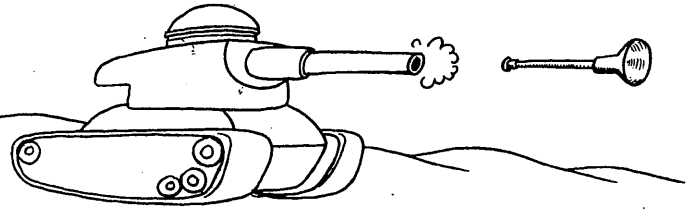

" تم ـ تم احمق، گدھے۔" الزبیتھ چلاّئی۔ " تمہیں اتنا بڑا خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر کوئی تمہیں والٹر کو کچلتے ہوئے دیکھ لیتا تو؟"

ریمنڈ نے اٹھ کر خالی گلاسوں میں وھسکی بھری۔ ایک گلاس اس نے الزبیتھ کو دیا اور دوسرا اپنے ہاتھ میں لے کر کرسی پہ بیٹھ گیا۔

" تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے" ریمنڈ نے چُسکی لیتے ہوئے کہا۔ " کہ واقعی مجھے کسی نے یہ حرکت کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے اور مجھے یہ بھی اُمید ہے کہ اس نے مجھے پہچان بھی لیا تھا اور اگر وہ مجھے نہیں پہچان سکا ہے تو یہ اس صدی کا سب سے بڑا معجزہ ہو گا کیونکہ وہ تمہارے شوہر کے دفتر میں چپراسی ہے اور اس واقعے سے صرف تھوڑی دیر پہلے مجھے دفتر میں ہیزل سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ وہ نہ جانے کب اس گلی میں آیا۔ میں نے تو اسے اس وقت دیکھا جب میں تمہارے شوہر کا پاؤں کچلتا ہوا تیزی کے ساتھ گلی سے نکل رہا تھا۔ وہ لڑکا مخالف سمت سے تمہارے شوہر کی چیخ پکار سُن کر بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ میں بالکل اس کے قریب سے گزرا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ فوراً مجھے پہچان گیا ہو گا۔"

گلاس الزبیتھ کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ " وہ تمہیں پہچان گیا ہے؟" الزبیتھ نے سرگوشی کی پھر سناٹے کے عالم میں چند لمحوں تک فرش پر گلاس کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے گھورتی رہی۔ " والٹر کا کہنا ہے کہ وہ لڑکا بہت تیز ہے۔ میں شرط لگا سکتی ہوں کہ اس نے رپورٹ کر دی ہو گی اور اس وقت پولیس تمہاری اور تمہاری گاڑی کی تلاش میں مصروف ہو گی۔"

ریمنڈ نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ " چھوڑو بھی لز! تم تو اس طرح فکرمند ہو رہی ہو جیسے والٹر کی موت تمہیں پاگل بنا دیتی۔ کہیں تم اس سے دوبارہ تو محبت نہیں کرنے لگیں؟"

" تم احمق ہو۔" الزبیتھ نے ریمنڈ کا ہاتھ جھٹک دیا۔ " مجھے والٹر کی ذرا بھی پرواہ نہیں ہے۔ مجھے تو اپنی فکر ہے۔ اگر پولیس کو ہم دونوں کے خفیہ تعلقات کا علم ہو گیا تو غضب ہو جائے گا؟ مجھے اخبار والوں سے بڑا ڈر لگتا ہے، وہ فوراً اسکینڈل بنا دیں گے اور پھر والٹر یقیناً مجھے طلاق دے دے گا۔"

" لز کیا تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تمہارا نام بیچ میں لاؤں گا؟ کیا تم مجھے اتنا نیچ سمجھتی ہو۔" ریمنڈ نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

الزبیتھ نے غور سے اپنے محبوب کی طرف دیکھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ ریمنڈ دانستہ طور پہ واقعی اس کا نام درمیان میں نہیں لائے گا لیکن وہ طبعاً بے وقوف ہے اس لیے پولیس کی جرح کا مقابلہ نہیں کر سکے گا اور غیر شعوری طور پر کہیں نہ کہیں اس کا نام اس کی زبان سے نکل جائے گا۔ خیر اس نے سوچا یہ بھی ایک اچھا سبق ہے۔ آئندہ میں اپنے محبوب کا انتخاب کرتے وقت یہ ضرور دیکھ لوں گی کہ وہ بے وقوف تو نہیں ہے؟ میں خوب جانچ لوں گی کہ وہ ذہین، تیز و طرار اور حاضر جواب ہے یا نہیں؟ الزبیتھ خود بہت ذہین تیز و طرار اور حاضر جواب تھی۔ پولیس اگر دس سال بھی اس کا ماضی کُریدتی تو وہ اس کے شادی کے بعد کے معاشقوں کا ثبوت حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

" اچھا ریمنڈ۔" اس نے اچانک کہا۔ " میں اپنے زخمی شوہر کو زیادہ دیر تک اپنا انتظار نہیں کرا سکتی۔ میں تمہیں یہی مشورہ دوں گی کہ تم اپنے گھر واپس چلے جاؤ۔ اگر تم اپنے گھر میں موجود ملے تو پولیس تم سے زیادہ سوالات نہیں کرے گی۔"

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

"شاید تم یہ کہنا چاہتی ہو لِز کہ آیندہ تم مجھ سے نہیں ملو گی؟"

"بے شک تم ٹھیک سمجھے۔"

"لیکن میں اب ہیزل کے پاس ہرگز واپس نہیں جاؤں گا۔" ریمنڈ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں اُس سے تنگ آ چکا ہوں، وہ ہر وقت مجھے بے کاری کے طعنے دیتی رہتی ہے۔ اب میں اس کے طعنے برداشت نہیں کر سکتا۔"

"تمھاری مرضی۔" الزبیتھ نے شانے اُچکاتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔ "لیکن اب مجھ سے ملنے کی کوشش کبھی نہ کرنا۔ اس مہینے کا کرایہ دیا جا چکا ہے۔ یہاں تم مہینے کے اختتام تک ٹھیر سکتے ہو۔"

"میں اس کمرے میں ٹھیرنا نہیں چاہتا لِز! یہ کمرہ ہے یا مرغیوں کا ڈربا؟"

الزبیتھ کو اس سے پورا اتفاق تھا۔ اس کمرے کو مرغی کے ڈربے کے علاوہ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اسے خود یہاں آ کر بہت اُلجھن ہوتی تھی۔

"میں فلوریڈا جانا چاہتا ہوں لِز!" ریمنڈ نے کہا۔ "مجھے سورج کی روشنی بہت پسند ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ہم شادی کے بعد ہنی مون منانے کے لیے فلوریڈا جائیں۔ خیر۔ وہ ایک خواب تھا۔ مشکل یہ ہے کہ فلوریڈا جانے کے لیے میرے پاس پیسے بالکل نہیں ہیں، آج کل میری جیب خالی ہے۔"

'بلیک میل!' الزبیتھ نے سوچا۔ "میں کل صبح بینک جاؤں گی، ممکن ہے میرے اکاؤنٹ میں کچھ پیسے پڑے ہوں۔" الزبیتھ نے کہا۔

"شکریہ لِزا!" اس نے کہا۔ "میں کل تمھارا انتظار کروں گا۔"

الزبیتھ نے سوچا کہ اسے ریمنڈ کو چند سو ڈالر تو دینے پڑیں گے لیکن موجودہ حالات میں اس کی اس شہر سے غیر موجودگی بہت ضروری ہے اور چند سو ڈالر کے عوض یہ سودا بُرا نہیں ہے۔

دوسرے روز صبح گیارہ بجے جب الزبیتھ ناشتہ کر رہی تھی تو ہیزل کمرے میں داخل ہوئی، وہ کچھ پریشان نظر آ رہی تھی، اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں جیسے رونے کی وجہ سے سُرخ ہو گئی ہوں۔

"مسٹر والٹر ابھی سو رہے ہیں۔" الزبیتھ نے اسے اطلاع دی۔ "انھوں نے کہا تھا کہ تمھارے پہنچتے ہی انھیں جگا دوں، تم کانپ رہی ہو، پیاری ہیزل!"

"جی۔ جی ہاں۔" ہیزل کرسی پر ڈھیر ہو گئی اور فوراً سسکیاں لے کر رونے لگی۔ روتے روتے اس نے کہا۔ "مسز والٹر! میرا خیال ہے مجھے آپ کو اور مسٹر والٹر کو سب کچھ بتا دینا چاہیے کیونکہ بہت جلد آپ دونوں کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

"تم کیا بتانا چاہتی ہو ہیزل؟" الزبیتھ نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"پیٹر!" ہیزل نے کہا۔ "آپ پیٹر کو جانتی ہیں، وہ ہمارے دفتر میں چپراسی ہے، وہ طرح طرح کی افواہیں اڑا رہا ہے، میں آج صبح ڈاک لینے کے لیے دفتر گئی تھی۔ وہاں مجھے معلوم ہوا کہ وہ کیسی کیسی باتیں کر رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کل جس آدمی نے اپنی موٹر سے مسٹر والٹر کو کچلنے کی کوشش کی تھی، وہ میرا شوہر تھا۔ وہ کہتا ہے کہ وہ گلی کے نکڑ پر کھڑا تھا اور اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس نے دعوا کیا ہے کہ میرے شوہر نے مسٹر والٹر کو جان بوجھ کر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"جان بوجھ کر؟" الزبیتھ کا سانس رُک گیا۔ "لیکن کیوں؟ میرا مطلب ہے کہ بھلا تمھارا شوہر میرے شوہر کو ہلاک کرنے کی کوشش کیوں کرنے لگا؟"

"آپ۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا مسز والٹر! اس ذلیل لڑکے پیٹر کا کہنا ہے کہ" ہیزل کا چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا۔ "کہ میرے اور مسٹر والٹر کے درمیان کاروباری تعلقات کے علاوہ بھی کوئی تعلق ہے جس کا علم میرے شوہر کو ہو گیا تھا۔ میرا شوہر بہت حاسد قسم کا آدمی ہے۔"

"اوہ؟" الزبیتھ نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ اس نے اس زاویے سے تو سوچا ہی نہیں تھا۔ یہ خیال بُرا نہیں ہے، الزبیتھ نے سوچا۔ اگر کبھی پولیس نے ریمنڈ کو پکڑا بھی تو ریمنڈ کا یہی بیان اسے مطمئن کر دے گا کہ اس کی بیوی کا اپنے باس سے معاشقہ چل رہا تھا۔ اس لیے اس نے رقابت میں اپنی بیوی کے باس کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ بلاشبہ ریمنڈ سے یہ بیان دلوانے کے لیے مجھے ریمنڈ کو خاصی بڑی رقم دینی پڑے گی لیکن ابھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ فی الحال ریمنڈ فلوریڈا فرار ہو رہا ہے۔

"اوہ ہیزل! مجھے ان افواہوں پر ذرا بھی یقین نہیں ہے۔" الزبیتھ نے بڑے میٹھے لہجے میں کہا۔

"شکریہ مسز والٹر! پیٹر نے کل ہی پولیس کو یہ اطلاع دے دی تھی کہ جس گاڑی نے مسٹر والٹر کو کچلنے کی کوشش کی تھی، اس کا مالک اور ڈرائیور میرا شوہر تھا۔ پولیس رات میرے گھر آئی تھی۔ اس نے مجھ سے ریمنڈ کے متعلق مختلف سوالات کیے۔ میں نے بتا دیا کہ وہ ایک ہفتے سے گھر نہیں آیا ہے اور مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ٹھیرا ہوا ہے۔ البتہ مجھے اس کار کا نمبر بتانا پڑا جو میرے شوہر کے استعمال میں ہے اس لیے میرا خیال ہے کہ وہ اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔ شاید مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن میرے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ پولیس نے مجھ سے پیٹر کے بیان کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ ممکن ہے پیٹر نے یہ بات ظاہر نہ کی ہو کہ میرے شوہر نے ارادی طور پر مسٹر والٹر کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی یا ممکن ہے کہ پیٹر نے یہ بات کہی ہو مگر پولیس نے یقین نہ کیا ہو۔ مجھے یقین ہے مسز والٹر! کہ وہ ایک حادثہ تھا۔ آپ ریمنڈ کو نہیں جانتیں۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر بالکل دیوانہ ہو جاتا ہے اور پاگلوں کی طرح گاڑی چلاتا ہے، مجھے ہمیشہ یہی ڈر رہتا ہے کہ وہ اس تیز رفتاری کے باعث کسی روز خود کو ہلاک نہ کر لے۔"

"معاف کرنا ہیزل!" الزبیتھ اچانک کھڑی ہو گئی۔ "مجھے اس وقت ایک ضروری ملاقات کرنی ہے۔ میں مسٹر والٹر کو بیدار کر کے تمھارے آنے کی اطلاع دے دیتی ہوں۔"

الزبیتھ نے غسل کرنے کی زحمت بھی نہیں کی، اسے بہت

فوٹوگرافی سیکھئے بذریعہ ڈاک

آسان اُردو میں چار ماہ کا باتصویر کورس

جس میں فوٹو کھینچنا، دھونا، پرنٹ کرنا، انلارج کرنا، ڈارک رُوم بنانا، اسٹوڈیو بنانا، سینما سلائیڈ بنانا، منٹ فوٹوگرافی، واٹرکلر، آئل فوٹو پینٹنگ، پریس، موی، پولارائیڈ فوٹوگرافی سکھائی جاتی ہے، یہ کورس کر کے آپ اپنا اسٹوڈیو بھی کھول سکتے ہیں۔

کورس ختم کرنے پر لندن انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنیکل ایجوکیشن کی جانب سے ڈپلوما آف پروفیشن دیا جاتا ہے۔ ماہانہ فیس پندرہ روپے

پراسپکٹس و رجسٹریشن فارم منگائیں،
یا لیکچرز کا پہلا سیٹ بذریعہ وی پی طلب فرمائیے

پاکستان سے باہر مقیم طلبا کو پورا کورس ایک ساتھ بھیجا جاتا ہے اور ان سے پورے کورس کی فیس ساڑھے پانچ پونڈ لی جاتی ہے۔

امتحانات ریڈیو سروسنگ

فوٹوگرافی سکھانے کے علاوہ لندن انسٹیٹیوٹ میں ریڈیو کا کام جاننے والے حضرات کا بذریعہ ڈاک امتحان لیا جاتا ہے جس کو پاس کرنے پر ریڈیو سروسنگ میں ڈپلوما دیا جاتا ہے۔ شرکت کے خواہش مند حضرات اطلاع دیں۔

پرنسپل : زیڈ اے نقوی ایم اے

لندن انسٹیٹیوٹ

۳۵۶۔ اے نیشنل ہائی وے، ملیر کالونی، کراچی ۳۷

جلدی تھی۔ اسے فوراً ہی کسی نہ کسی طرح اس لڑکے پیٹر سے گفتگو کرنی تھی جو اس کے شوہر کے دفتر میں چپراسی تھا۔ اس نے اس مسئلے پر بہت غور کیا۔ پیٹر کو ہموار کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ اگر پیٹر نے اب تک پولیس کو یہ بیان نہیں دیا تھا کہ ریمنڈ نے والٹر کو ارادی طور پر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی تو وہ اس لڑکے سے مل کر اور اسے کچھ دے دلا کر اس بات کے لیے راضی کر لے گی کہ وہ اس نکتے پر اپنی زبان بند رکھے۔ اس نے کوٹ پہنا اور لمبا چوڑا پرس لے کر گھر سے نکل گئی۔ پھر اس نے ایک ٹیلیفون بوتھ سے اپنے شوہر کے دفتر ٹیلیفون کر کے پیٹر سے بات کی۔ "پیٹر!" الزبتھ نے کہا۔ "دیکھو میرا نام نہ دُہرانا۔ میں مسز والٹر بول رہی ہوں تم سمجھ گئے ؟"

"جی ہاں۔" پیٹر نے مؤدبانہ جواب دیا۔

"سنو۔ مجھے تم سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں، تم ملاقات کے لیے کسی مناسب جگہ کا پتہ دے سکتے ہو ؟ میں وہاں پہنچ کر تمھارا انتظار کروں گی۔"

پیٹر نے اسے ایک ڈرگ اسٹور کا نام اور پتہ لکھوا دیا۔ الزبتھ نے پرس کھول کر اندر سے ایک پیڈ نکالا، پیڈ کے ایک کونے میں سنہرے حروف سے اس کے نام کا مونوگرام چھپا ہوا تھا۔ وہ یہ پیڈ ہمیشہ اپنے پرس میں رکھتی تھی۔ اس نے پیڈ پر ڈرگ اسٹور کا نام اور پتہ لکھا اور پیٹر کو بتایا کہ "میں نارنجی رنگ کا ہیٹ اور سفید رنگ کا کوٹ پہنے ہوتے ہوں۔ تم فوراً ڈرگ اسٹور کی طرف روانہ ہو جاؤ۔"

پیٹر ایک نوجوان لڑکا تھا۔ اس کی نظریں دیکھ کر الزبتھ کو بہت اطمینان ہوا۔ پیٹر کی نظریں کسی بھی چیز پر رُکتی نہیں تھیں۔ الزبتھ کا خیال تھا کہ ایسے لوگ صد فیصد بے ایمان اور لالچی ہوتے ہیں۔

وہ دونوں ڈرگ اسٹور کے کاؤنٹر پر کونے کے اسٹولوں پر بیٹھ گئے۔ "سنو پیٹر!" الزبتھ نے کہا۔ "میں نے وہ افواہیں سن لی ہیں جو تم میرے شوہر اور ہیزل کے بارے میں اُڑا رہے ہو۔"

"میں — وہ — وہ میرا صرف اندازہ تھا مادام۔" پیٹر نے گھبرا کر خفیف لہجے میں کہا۔

"افسوس۔ تمھارا اندازہ بالکل درست ہے پیٹر۔" الزبتھ نے افسردگی سے کہا۔ "چند ماہ قبل ہیزل کے شوہر مسٹر ریمنڈ نے مجھے فون پر اس معاملے کی اطلاع دی تھی۔ ہم دونوں نے اس سلسلے میں مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ اس بارے میں زبان بند رکھی جائے۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ معاملہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اگر ہم کچھ کہتے تو اس سے بڑی بدنامی ہوتی اور تمھارے مالک مسٹر والٹر کے کاروبار پر بُرا اثر پڑتا۔ ہیزل کی نوکری بھی چھوٹ جاتی، پھر اسے آیندہ بھی کہیں نوکری نہ ملتی لیکن تم نے یہ افواہیں اُڑا کر ہماری کوششوں پر پانی پھیر دیا ہے پیٹر!"

"مجھے — مجھے بہت افسوس ہے مادام، مجھے معاف کر دیجیے۔"

"اس کے علاوہ تم نے جو دوسری قطعاً بے بنیاد باتیں کہی ہیں، ان سے مسٹر ریمنڈ بہت پریشان ہیں، تم سب سے یہ کہتے پھر رہے ہو کہ مسٹر ریمنڈ نے جان بوجھ کر مسٹر والٹر پر گاڑی چڑھائی تھی، وہ ایک حادثہ تھا پیٹر۔ شاید تمھیں معلوم نہیں ہے کہ مسٹر ریمنڈ کی موٹر میں کچھ خرابی ہے، اسے جب اسٹارٹ کیا جاتا ہے تو وہ ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ آگے کی طرف بڑھتی ہے۔"

پیٹر کے چہرے کی ہڈیاں اُبھر آئیں، اس نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو مسٹر ریمنڈ کو اپنی گاڑی ٹھیک کروانی چاہیے، میں گلی کے نکڑ پر کھڑا تھا۔ میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے مادام۔ ان کی گاڑی سیدھی مسٹر والٹر کی طرف آ رہی تھی۔"

"خیر ممکن ہے۔" الزبتھ نے جلدی سے کہا۔ "لیکن مسٹر ریمنڈ نے شعوری طور پر ایسا نہیں کیا۔ تم نے جو کچھ دیکھا ہے، اگر اسے بھول جانے کا وعدہ کرو تو مسٹر ریمنڈ تمھیں اس کے عوض بہت ساری رقم دے سکتے ہیں لیکن تمھیں اپنے دفتر میں لوگوں سے یہ کہنا پڑے گا کہ جو کچھ تم نے پہلے کہا تھا وہ صرف ایک مذاق تھا۔ ہاں، تم نے پولیس سے تو اس کا ذکر نہیں کیا ؟"

"نہیں مادام!" پیٹر نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے حرص عیاں تھی۔ "ابھی نہیں۔"

"ٹھیک ہے پیٹر! تم بہت اچھے لڑکے ہو، ذہین اور ہوشیار بھی نظر آتے ہو، تم بہت ترقی کر سکتے ہو لیکن ترقی کے لیے تعلیم ضروری ہے۔ تم رات کے اسکول میں داخلہ کیوں نہیں لے لیتے ؟"

"اس کے لیے پیسوں کی ضرورت پڑتی ہے مادام!"

"کتنے پیسوں کی ؟"

پیٹر نے بے ہودگی سے اپنا گال کھجایا۔ "تقریباً ایک ہزار ڈالر کی مادام!"

"ٹھیک ہے۔" الزبتھ نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر کہا۔ "میں مسٹر ریمنڈ کو بتا دوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمھاری مدد کر کے بہت خوش ہوں گے اور ضرور تمھاری مدد کریں گے۔ کیا تم آج رات مسٹر ریمنڈ سے ملاقات کر سکتے ہو ؟ آٹھ بجے ؟"

الزبتھ کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ آج رات ریمنڈ فلوریڈا فرار ہو رہا ہے۔ آج رات کے بعد اس کمرے میں تالا لگ جائے گا اور اس کی اُس زندگی کا بھی خاتمہ ہو جائے گا جو اس نے اس کمرے میں ریمنڈ کے ساتھ گزاری تھی۔ پیٹر کو اس کمرے کا پتہ دینا مناسب نہیں تھا۔ ہاں اُس عمارت کے نزدیک ایک واہیات سا ریستوراں تھا جس میں وہ کبھی نہیں گئی تھی۔ وہ گریک ریستوراں کے نام سے مشہور تھا، اس میں متوسط طبقے کے لوگ کھانا کھاتے تھے۔ ریمنڈ بھی کبھی کبھی اس ریستوراں سے کھانا لاتا تھا۔ کھانا ہمیشہ گرم اور عمدہ ہوتا تھا۔

"ضرور مادام۔" پیٹر نے جواب دیا۔

الزبتھ نے پرس کھول کر پیڈ نکالا اور بڑی نفاست سے گریک ریستوراں کا نام اور پتہ لکھ دیا۔ پھر اس نے دو ڈالر نکال کر پیٹر کو دیے۔ "یہ دو ڈالر ٹیکسی کا کرایہ ہے۔ تم اس پتے پر آج رات آٹھ بجے پہنچ جانا۔ مسٹر ریمنڈ وہاں تمھارے منتظر ہوں گے، ہوٹل کے اندر نہیں بلکہ باہر۔"

پیٹر سے گفتگو کرنے کے بعد الزبتھ سیدھی بینک گئی، اس نے پندرہ سو ڈالر کا چیک کیش کرایا۔ چیک بک وہ ہمیشہ اپنے پرس میں رکھتی تھی۔ پندرہ سو ڈالر پرس میں ڈال کر وہ سیدھی ڈبے نما کمرے میں گئی۔ ریمنڈ حسبِ معمول بستر پر اوندھا سو رہا تھا۔ الزبتھ نے اپنے پیر زور زور سے زمین پر پٹکے، ریمنڈ ہڑبڑا کر جاگ گیا۔

اس رات الزبتھ بڑے اطمینان کی نیند سوئی۔ تمام معاملات حسبِ منشا طے ہو گئے تھے۔ صبح اس کی آنکھ ٹیلیفون کی گھنٹی سے کھلی۔ الزبتھ نے غنودگی کے عالم میں ریسیور اُٹھایا۔ اس کے شوہر کے دفتر سے کال آئی تھی، اس نے ریسیور اپنے شوہر کی طرف بڑھا دیا۔

"کیا ؟ میرے خدا!" اس نے اپنے شوہر کی آواز سنی۔ وہ چند لمحے اسی قسم کے غیر مربوط جملے ادا کرتا رہا پھر اس نے فون بند کر دیا۔

سے رونے پیٹنے کی آوازیں سُنائی دیں تو لوگ جمع ہونے لگے انھی میں ایک حاجت مند زندہ دل بھی شامل تھا۔ اس نے لوگوں سے پوچھا۔ "کیا ہوا، یہ لوگ رو کیوں رہے ہیں ؟"

کسی نے جواب دیا۔ "صاحبِ خانہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اُسی کے غم میں لوگ رو رہے ہیں!"

اس شخص نے کہا۔ "میں اسے زندہ کر سکتا ہوں کیونکہ مجھے بعض ایسی دعائیں یاد ہیں، جن سے مُردے جی اُٹھتے ہیں۔"

لوگوں نے اس مسیحا نفس کو گھر والوں سے ملا دیا۔ اس نے گھر والوں سے کہا۔ "پہلے میں کھانا کھاؤں گا، اس کے بعد زندہ کروں گا۔"

لوگوں نے اُسے پیٹ بھر کے کھانا کھلایا، کھانا کھانے کے بعد اُس نے زوردار ڈکار لی اور پوچھا۔ "مرنے والے کا نام اور پیشہ کیا تھا ؟"

کسی نے بتایا۔ "لالہ تجوری لال، کام مہاجنی۔ لوگوں کو سُود پر رُپے دیا کرتا تھا!"

مسخرے پیٹ بھرے نے بناوٹی غصے سے کہا۔ "لاحول ولا قوۃ، میں تو سمجھتا تھا مرنے والا کوئی شریف انسان ہوگا۔ یہ تو ایک بدنامِ زمانہ شخص تھا، اس ذلیل کا مر جانا ہی بہتر ہوا، میں اسے کسی قیمت پر بھی نہ جلاؤں گا!"

"بیچاری ہیزل۔" مسٹر والٹر نے فون بند کر کے الزبتھ سے کہا۔ "اس کی قسمت ہی خراب ہے، اس کا شوہر رات ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا۔"

"کیا ؟" الزبتھ کی نیند اُڑ گئی۔ وہ اُچھل کر بستر پر بیٹھ گئی۔ "کیا ہیزل کا شوہر حادثے میں مر گیا ؟" اس کے چہرے پر ایک پُراسرار مُسکراہٹ پھیل گئی۔ ریمنڈ کی موت نے اس کے لیے اور بھی آسانیاں پیدا کر دی تھیں، اب مستقبل میں بھی کبھی کوئی خطرہ پیش آنے کا امکان نہیں رہا تھا۔

"اور یہ دیکھو ڈارلنگ!" مسٹر والٹر نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔ "اگر ہیزل کی جگہ کوئی دوسری عورت ہوتی تو کئی روز تک صدمے سے نڈھال رہتی لیکن ہیزل — وہ آج بھی دفتر پہنچی ہے، اسی نے مجھے فون پر یہ اطلاع دی ہے اور اب وہ ڈاک لے کر یہاں آ رہی ہے۔"

"یہ حادثہ کہاں پیش آیا والٹر ؟" الزبتھ نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"ہائی وے پر — وہ ہائی وے جو نیو جرسی جاتا ہے، شہر سے تقریباً ساٹھ میل دور۔"

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

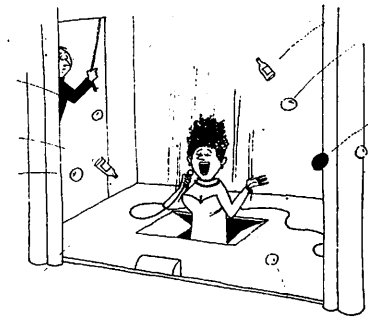

الزبیتھ نے گھنٹی بجا کر ملازمہ کو طلب کیا اور اسے ناشتہ لانے کا حکم دیا۔ ملازمہ ناشتے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوئی تو اس کے پیچھے پیچھے ہیزل بھی آ گئی۔ اس کے چہرے سے حزن و ملال ضرور ظاہر ہو رہا تھا لیکن وہ اب بھی پہلے کی طرح مستعد کھڑی تھی۔ الزبیتھ نے ہاتھ کے اشارے سے ہیزل کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ہیزل نے آگے بڑھ کر مسٹر والٹر کی خدمت میں تازہ ڈاک پیش کی۔ "ہیزل!" مسٹر والٹر نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ہم دونوں کو تمھارے شوہر کی حادثاتی موت پر بہت صدمہ ہوا۔ اگر ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو تم بے جھجک کہہ سکتی ہو۔ کیا تمھیں اتفاقی اخراجات کے لیے کچھ رقم کی ضرورت ہے؟ ظاہر ہے، تمھارے شوہر کی تدفین پر کافی رقم صرف ہو گی۔"

"نہیں مسٹر والٹر۔ میں آپ کی پیش کش کی بے حد ممنون ہوں۔" ہیزل نے کہا۔ "مگر اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ پولیس کو ریمنڈ کی جیب سے پندرہ سو ڈالر ملے تھے۔ وہ رقم میرے حوالے کر دی گئی ہے اس لیے مجھے اخراجات کے بارے میں کوئی پریشانی نہیں ہے۔ البتہ مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ ریمنڈ کے پاس پندرہ سو ڈالر آئے کہاں سے؟"

الزبیتھ کا کافی والا ہاتھ بہت زور سے کانپا۔ اگر ہیزل کی اطلاع درست ہے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ ریمنڈ نے کل رات پیٹر کو ایک ہزار ڈالر ادا نہیں کیے بلکہ پورے پندرہ سو ڈالر لے کر فرار ہو رہا تھا مگر حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ ظاہر ہے اب مجھے نئے سرے سے پیٹر کے ساتھ بات کرنی ہو گی۔ ممکن ہے پیٹر اس وعدہ خلافی کی وجہ سے غصے میں آ کر زیادہ رقم کا مطالبہ کر دے۔

"ہم دونوں کو بے حد افسوس ہے ہیزل!" مسٹر والٹر کہہ رہے تھے۔ "ہم تمھارے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ میں تمھیں اپنی سکریٹری ہونے کی حیثیت سے حکم دیتا ہوں کہ تم اپنی پسند سے اپنے شوہر کی قبر پر چڑھانے کے لیے پھولوں کی ایک چادر کا آرڈر دے دو۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے جناب۔" ہیزل نے کہا۔ "البتہ پیٹر کی ماں کے پاس ایک گلدستہ بھیجا جا سکتا ہے۔ آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ کل رات کسی نے پیٹر غریب کو چاقو مار کر ہلاک کر دیا ہے۔"

کافی کا کپ الزبیتھ کے ہاتھ میں اتنے زور سے اچھلا کہ بہت ساری کافی چھلک کر اس کے لباس پر گر گئی۔

"کیا کہا؟ پیٹر کو؟ تمھارا مطلب ہے کہ پچھلی رات پیٹر کو کسی نے چاقو مار کر قتل کر دیا؟" مسٹر والٹر نے حیرت زدہ انداز میں پوچھا۔

"جی ہاں مسٹر والٹر! آج کے تمام اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی ہے۔ شاید آپ نے ابھی تک صبح کا اخبار نہیں پڑھا۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں پیٹر کی موت کا تذکرہ یہیں ختم کر دینا چاہیے۔" الزبیتھ نے تیز آواز میں پہلی مرتبہ مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "ہم سب جانتے ہیں کہ پیٹر کا قاتل کون ہو سکتا ہے۔"

"میں سمجھی نہیں مادام!" ہیزل نے بڑی معصومیت سے کہا۔

الزبیتھ کا دل چاہا کہ اس حرافہ کے منہ پر کافی کا کپ دے مارے۔

"پیٹر کا قاتل صرف تمھارا شوہر ہو سکتا ہے۔" الزبیتھ نے تلخ لہجے میں کہا۔ "کسی اور کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ اس غریب لڑکے کو قتل کرے؟ پیٹر نے لوگوں سے یہ کہہ کر زبردست غلطی کی تھی کہ تمھارا شوہر ارادی طور پر والٹر کو ہلاک کرنا چاہتا تھا۔" ہیزل نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"الزبیتھ!" مسٹر والٹر نے سخت لہجے میں اپنی بیوی کو سرزنش کی۔ "تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ کیا شوہر کی موت کا صدمہ کچھ کم تھا کہ اب تم نے..."

ہیزل نے بھی خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "مادام! آپ کو مرے ہوئے لوگوں کے متعلق اس قسم کی گفتگو نہیں کرنی چاہیے، ان کی روح کو تکلیف ہوتی ہے۔ جہاں تک پیٹر کے قاتل کا سوال ہے تو میں آپ کو بتا دوں کہ اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کے مطابق پولیس اس وقت ایک ایسی عورت کی تلاش میں ہے جو نارنجی رنگ کے ہیٹ اور سفید کوٹ میں ملبوس تھی۔ پولیس آج صبح دفتر آئی تھی۔ اس سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ کل دوپہر سے پہلے پیٹر کو اس عورت کے ساتھ ایک ڈرگ اسٹور میں کوکا کولا پیتے ہوئے اور دھیمے لہجے میں باتیں کرتے دیکھا گیا تھا اور کل ہی رات پیٹر کو قتل کر دیا گیا۔ چونکہ پیٹر اس ڈرگ اسٹور میں اکثر کافی وغیرہ پینے جاتا تھا اس لیے دکان کا مالک پیٹر کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اسے پیٹر کے ساتھ اس مال دار اور بے حد خوبصورت عورت کو دیکھ کر بہت تعجب ہوا تھا۔ اس کے علاوہ پولیس کو پیٹر کی جیب سے ایک کاغذ بھی ملا ہے جس پر نسوانی تحریر میں اس جگہ کا پتہ لکھا ہوا ہے جہاں کل پیٹر کی لاش پائی گئی تھی — اس جگہ کا نام شاید گریک ریستوراں ہے۔" ہیزل نے اخبار کھول کر چوتھا صفحہ نکالا اور ایک تصویر کی طرف اشارہ کر کے اخبار مسٹر والٹر کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ دیکھیے مسٹر والٹر! اخبار میں اس کاغذ کی تصویر شائع ہوئی ہے جس پر مذکورہ عورت نے پیٹر کو گریک ریستوراں کا پتہ لکھ کر دیا تھا۔ پولیس نے عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ اس کاغذ پر چھپا ہوا سنہرا مونوگرام دیکھ کر عورت کی شناخت میں مدد دیں۔"

مسٹر والٹر نے اخبار بینی کے لیے استعمال ہونے والا چشمہ نکال کر پہنا۔ الزبیتھ نے کافی کی پیالی ناشتے کی ٹرے میں رکھ دی اور بھری ہوئی ناشتے کی میز پیروں سے کھسکا کر خواب گاہ سے بھاگنے لگی۔

الزبیتھ کو اب اپنی اس حماقت پر افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے پیٹر کو پتہ دینے کے لیے اپنا پیڈ کیوں استعمال کیا۔ یہ پیڈ خود مسٹر والٹر نے چھپوا کر اسے دیے تھے اس لیے وہ اخبار دیکھتے ہی اس میں چھپا ہوا مونوگرام اور اس کی تحریر پہچان سکتے تھے۔ مسٹر والٹر آنکھیں پھاڑے حیرت سے اخبار دیکھ رہے تھے۔ "الزبیتھ!" انھوں نے چلا کر کہا۔ "تم نے پیٹر کو اس جگہ کیوں بھیجا تھا؟ مجھے بتاؤ اس سے تمھارا کیا مقصد تھا؟ کیا تم اس سے بھی عشق لڑا رہی تھیں؟ میرے خدا شادی کے بعد تو تم نے توبہ کر لی تھی، مجھے..."

"نہیں والٹر نہیں۔" الزبیتھ نے چیخ کر کہا۔ اور واپس آ کر بستر کے کونے میں بیٹھ گئی۔ الزبیتھ کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ کیا وہ والٹر کو سب کچھ سچ سچ بتا دے؟ لیکن سچائی کا علم ہونے پر اس کا شوہر اسے طلاق دے دے گا۔

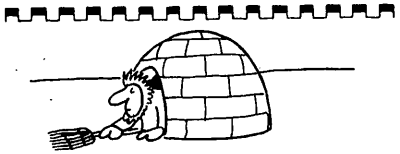

ہیزل حالات کی اس کروٹ سے مبہوت سی ہو گئی تھی، وہ نظریں نیچی کیے اپنے ہاتھ دیکھ رہی تھی۔ مسٹر والٹر نے اس سے کہا۔ "ہیزل! بہتر ہو گا کہ تم اپنے گھر چلی جاؤ۔ میں نہیں سمجھتا کہ تمھیں میرے گھریلو معاملات سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے۔ ان خطوط کا جواب کل بھی لکھا جا سکتا ہے۔"

ہیزل دبی زبان سے شکریہ ادا کر کے جانے لگی۔

"ٹھیر جاؤ ہیزل!" اچانک الزبیتھ نے بلند آواز سے کہا۔ "جو کچھ میں کہنا چاہتی ہوں، مجھے امید ہے کہ اس سے تمھیں بھی دلچسپی ہو گی۔"

الزبیتھ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے تمام حالات پوری سچائی سے بیان کر دینے چاہئیں ورنہ ریمنڈ کی موت کے بعد موجودہ حالات میں پیٹر کے قتل کا سارا الزام اس کے سر آ سکتا ہے۔ جیل کی کوٹھری اور پھانسی کے تختے سے طلاق بدرجہا بہتر تھی، اس کا شوہر سب کچھ جاننے کے بعد اسے طلاق دے دے گا مگر جان تو بچ جائے گی۔ ابھی وہ جوان اور خوبصورت ہے وہ آسانی سے کسی دوسرے مالدار مرد کو پھانس لے گی خواہ وہ کوئی بوڑھا ہی کیوں نہ ہو۔ الزبیتھ کے سامنے حقیقت کے اظہار کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ "ہیزل!" الزبیتھ نے کہا۔ "تمھارا شوہر ریمنڈ میرا دوست تھا۔ وہ کئی ماہ قبل یہاں اس گھر میں آیا تھا۔ پھر اس نے مجھے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

گناہ کی جانب مائل کرنے کی کوشش کی۔ میں نے حتی الامکان اس کی حوصلہ شکنی کی لیکن ایک روز ایک کمزور لمحے میں ریمنڈ نے مجھ پر غلبہ پا ہی لیا۔ کل اس نے مجھے ٹیلیفون پر دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے پیٹر سے مل کر اسے اس سے ملاقات کرنے پر آمادہ نہیں کیا تو وہ میرے شوہر پر میری بے وفائی کا راز افشا کر دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں بادل ناخواستہ پیٹر سے ملی تھی۔ میرا خیال تھا کہ تمھارا شوہر پیٹر سے اس لیے ملنا چاہتا ہے کہ وہ اسے لالچ وغیرہ کے ذریعے زبان بند رکھنے پر آمادہ کرے گا۔ اگر مجھے یہ گمان بھی ہوتا کہ اس کا ارادہ پیٹر کو قتل کر کے خاموش کرنے کا ہے تو میں ہرگز۔۔۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو الزبیتھ!" مسٹر والٹر نے اپنی بیوی کی بات کاٹتے ہوئے کہا "تم مسٹر ریمنڈ کی حادثاتی موت سے فائدہ اُٹھانا چاہتی ہو اور چونکہ وہ تمھاری کسی بات کی تردید نہیں کر سکتے اس لیے تم بے جھجک سفید جھوٹ بول رہی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ ریمنڈ کا پیٹر کے قتل سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے اپنی زندگی میں کبھی مسٹر ریمنڈ کو دیکھا بھی نہیں ہوگا۔"

"میں ثابت کر سکتی ہوں کہ ریمنڈ میرا دوست تھا اور ہم کئی ماہ سے۔۔۔" الزبیتھ نے اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ اسے پہلی مرتبہ حالات کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے محبوب سے خفیہ ملاقاتوں کے لیے جو احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں، ان کی وجہ سے تو وہ خود بھی یہ ثابت نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے ریمنڈ سے تعلقات تھے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے احتیاطاً اپنی ملازمہ کو بھی نکال دیا تھا۔ وہ نہ جانے اب کہاں ملازمت کر رہی ہوگی۔ وہ ملازمہ البتہ یہ گواہی دے سکتی ہے کہ اس نے سبکدوشی سے ایک روز قبل ریمنڈ کو یہاں آتے ہوئے دیکھا تھا۔ خفیہ ملاقاتوں کے لیے کمرہ بھی ریمنڈ نے اپنے نام سے کرائے پر لیا تھا اور کرایہ بھی وہ اپنے ہاتھ سے ادا کرتا تھا۔ الزبیتھ کو ان چار مہینوں کے دوران اس کی مخصوص احتیاطی تدبیروں کے باعث کسی نے بھی اس عمارت میں جاتے ہوئے یا وہاں سے باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ کسی طرح بھی یہ ثابت نہیں کر سکتی تھی کہ ریمنڈ سے اس کے تعلقات تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنی بات کی صداقت کسی طرح ثابت نہیں کر سکتی۔ اس کی شہادت صرف دو آدمی دے سکتے تھے اور وہ دونوں کل رات ہلاک ہو گئے۔ پیٹر کو ریمنڈ نے قتل کر دیا اور خود حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا کہ ممکن ہے ہیزل اس کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ ممکن ہے۔ "ہیزل!" الزبیتھ نے اپنے شوہر کی سکریٹری کو پُرامید نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "تم بتاؤ۔ تم تو اپنے شوہر کو اچھی طرح جانتی تھیں، میں جو کچھ کہہ رہی ہوں کیا وہ سچ نہیں ہو سکتا؟ کیا تمھارا شوہر تم سے بے وفائی نہیں کر رہا تھا؟"

ہیزل چند لمحے خاموش رہی۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے اور پھر اس کا چہرہ سپاٹ ہو گیا "نہیں مادام!" ہیزل نے جواب دیا "میرا شوہر مجھ سے بے وفائی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی فطرت میں بے وفائی تھی ہی نہیں اور اس نے پیٹر کو قتل بھی نہیں کیا تھا۔ جس جگہ پیٹر کی لاش پائی گئی ہے میرے شوہر کو اُس جگہ سے ساٹھ میل دور حادثہ پیش آیا ہے اور ان دونوں واقعات کے درمیان ایک گھنٹے سے بھی کم کا وقفہ ہے۔ پیٹر کی موت آٹھ بجے واقع ہوئی ہے اور میرے شوہر کو آٹھ بج کر پچپن منٹ پر حادثہ پیش آیا ہے اس لیے ریمنڈ پیٹر کو قتل کر ہی نہیں سکتا تھا۔ جس وقت اس لڑکے کو قتل کیا گیا ہے، وہ جائے واردات سے میلوں دُور ہائی وے پر اپنی گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔"

"لیکن۔۔۔ لیکن ریمنڈ تو بہت تیز گاڑی چلاتا تھا۔ ہیزل تم نے کل خود مجھے بتایا تھا کہ وہ بالکل دیوانوں کی طرح گاڑی چلاتا ہے!"

"آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے مادام!" ہیزل نے معصومیت سے کہا "میرا شوہر ہائی وے پر بھی کبھی چالیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے زیادہ تیز گاڑی نہیں چلاتا تھا۔ وہ اس معاملے میں بہت محتاط رہتا تھا۔"

"کیا! کیا تم قسم کھانے کے لیے تیار ہو؟"

"ہاں۔ اگر ضرورت پڑی تو۔۔۔" ہیزل نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

الزبیتھ ہذیانی انداز میں چیختی ہوئی دیواروں پر گھونسے مارنے لگی۔ دیواریں اسے اپنی طرف لپکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

ضیاء تسنیم بلگرامی

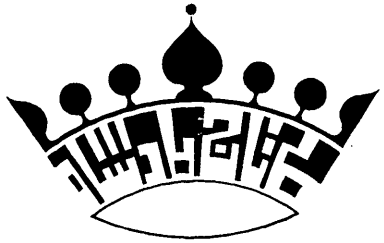

سہارنپور کے قصبے نانوتہ میں ۲ جنوری ۱۸۱۸ء میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ باپ نے اس کا نام امداد حسین رکھ دیا۔ ابھی یہ سات سال کے تھے کہ ماں نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ نزع کے وقت ماں نے اپنی دوسری اولادوں کے مقابلے میں امداد حسین کو زیادہ اہمیت دی۔ انھوں نے خاندان کے ذمہ دار حضرات کو آبدیدہ نظروں سے دیکھا اور نحیف اور غمزدہ آواز میں وصیت کی "لوگو! میں جا رہی ہوں، ہمیشہ کے لیے۔ مرنے سے پہلے ایک وصیت کرنا چاہتی ہوں، کیا آپ لوگ میرے بعد اس پر عمل پیرا ہونے کا وعدہ فرمائیں گے؟"

ایک بزرگ عورت روتی ہوئی جاں بہ لب مریضہ کے پاس پہنچی اور وعدہ کیا "میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمھاری وصیت پر حرف بہ حرف عمل کیا جائے گا، اپنی وصیت سے مجھے آگاہ کر دو۔"

مریضہ نے اپنے بیٹے امداد حسین کا ہاتھ اس عورت کے ہاتھ میں دے دیا اور سوگوار لہجے میں کہا "میرے اس بچے کا بطورِ خاص خیال رکھا جائے۔ اس کی غلطیوں اور خطاؤں کو نظر انداز کیا جاتا رہے، اسے مار تو مار جھڑکیوں تک سے بچایا جائے۔"

بزرگ عورت نے امداد حسین کو اپنے سینے سے لگا لیا اور روتے ہوئے وعدہ کیا "تمھاری وصیت پر پوری طرح عمل کیا جائے گا بہن، تم بے فکر رہو، کس کی مجال ہے کہ تمھارے امداد حسین کو ترچھی نظروں سے دیکھنے کی جرأت کرے۔"

ماں کا انتقال ہو گیا اور بیٹا اس ناز و نعم سے پرورش پانے لگا کہ زندگی کے ہر معاملے میں اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا۔ وہ کچھ بھی کرے کوئی اسے ٹوک نہ سکتا تھا۔ یہاں تک کہ بہت سے ایسے کام جن کا اختیار کرنا یا انجام دینا ضروری ہوتا، کوئی زبان تک لاتے ہوئے گھبراتا تھا۔ بچے کی دل جوئی کے شدید احساس اور پاسِ خاطر کے بے پناہ خیال نے لوگوں میں ایک طرح کی بے نیازی پیدا کر دی اور امداد حسین کو لوگوں کی عدم توجہی اور تغافل کا شکار ہو جانا پڑا۔ لوگوں نے ان کی تعلیم و تربیت پر بھی خاص توجہ نہ دی کیونکہ اس میں یہ امکان موجود تھا کہ کہیں کسی جگہ جبر سے کام نہ لینا پڑ جائے جس سے امداد حسین کی دل آزاری ہو اور ان کی ماں کی رُوح کرب میں مبتلا ہو جائے۔ انھیں خود ہی پڑھنے لکھنے کا شوق ہوا اور مختلف اساتذہ سے تحصیل علم کرتے رہے۔ سنِ شعور میں پہنچ کے دہلی گئے اور مولانا نصیر الدین دہلوی کے حلقۂ درس میں بیٹھ گئے۔ مولانا کا تعلق سید احمد شہیدؒ کی تحریک سے رہ چکا تھا اور یہ اپنی ذات میں بہت ساری خوبیاں رکھتے تھے۔ عالمِ دین، صوفی اور لائق سیاست داں۔ یہ اپنے طلبہ کو وہی درس دیا کرتے تھے جو تقریباً ایک سو سال پہلے شاہ ولی اللہ دہلویؒ پوری قوم کو دے چکے تھے اور ۱۸۳۱ء تک سید احمد شہیدؒ دیتے رہے تھے۔

نوجوان امداد حسین گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ صبح قریب تھی۔ کاروانِ شب کے آخری مسافر رخصت ہونے کو تھے، اس وقت امداد حسین رسُولِ مقبولؐ کے دربار میں حاضر تھے۔ رسُول اللہؐ کے آس پاس ان کے اصحاب موجود تھے۔ امداد حسین پر اتنا رعب طاری تھا کہ پاؤں سو سو من کے ہو گئے تھے۔ گردن جھک گئی اور آنکھوں میں تابِ نظارہ باقی نہ رہی۔ اسی عالم میں کسی نے امداد حسین کا ہاتھ پکڑ لیا اور حکم دیا "یہاں کیوں کھڑا ہے آگے بڑھ، ہوش میں آ۔"

یہ آواز کسی آشنا کی تھی، گردن اُوپر جو اٹھائی تو دیکھا دادا سامنے کھڑے ہیں۔ امداد حسین نے گڑگڑا کے سوال کیا "دادا جان! اِس وقت میں اپنے آپ میں نہیں ہوں اور میری ہمت جواب دے گئی ہے۔"

"تو میرا ہاتھ پکڑ!" دادا نے کہا "میرے ساتھ چل، میں تجھے رسُول اللہؐ

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

انوارِ اولیا (رئیس احمد جعفری) * انوارِ اصفیا (شیخ غلام علی اینڈ سنز) * علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد دوم چہارم (مولانا سید محمد میاں) * حکایاتِ اولیا (مولانا اشرف علی تھانوی) * کارل مارکس (...)

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

کے پاس لیے چلتا ہوں، ان سے تیری ملاقات کراتا ہوں، پریشان نہ ہونا۔"

دادا جان نے امداد حسین کی انگلی پکڑی اور رسول اللہؐ کے رُوبرو پہنچا دیا۔ دادا جان نے امداد حسین کا ہاتھ رسول اللہؐ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "حضور! اسے میں آپ کے حوالے کرتا ہوں، آپ جیسا بھی مناسب سمجھیں اس کے لیے......"

رسول اللہؐ نے امداد حسین کا ہاتھ ایک دوسرے شخص کے حوالے کردیا اور فرمایا "یہ امداد حسین ہے، اس کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔"

امداد حسین نے ان بزرگ کو غور سے دیکھا اور ان کی شکل و صورت حافظے میں محفوظ کرلی۔ جب بیدار ہوئے تو ان پر عجیب حیرت و انتشار کی کیفیت طاری تھی۔ لاکھ حافظے پر زور دے کر پہچاننے کی کوشش کرتے لیکن پہچانے نہ جاتے۔ اسی حیرت و انتشار میں کچھ دن گزر گئے۔ امداد حسین نے مشکوٰۃ شریف کا کچھ حصہ مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی سے پڑھا تھا۔ اس پریشانی اور انتشار میں ان کی ملاقات اپنے اُستاد محدث جلال آبادی سے ہوگئی۔ اُستاد نے پریشان اور کھوئے کھوئے چہرے کو بغور دیکھ کر سوال کیا "امداد حسین! تم پریشان کیوں ہو؟ وجہ؟"

امداد حسین نے آبدیدہ نظروں سے استاد کو دیکھا اور رقت زدہ لہجے میں اپنا خواب بیان کردیا۔ بولے "جب سے یہ خواب دیکھا ہے میں ان بزرگ کی تلاش میں ہوں جن کے ہاتھ میں رسول اللہؐ نے میرا ہاتھ دیا تھا۔"

محدث جلال آبادی مسکرا دیے، بولے "تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟"

امداد حسین نے آزردگی سے جواب دیا "جب تک ان بزرگ سے میری ملاقات نہیں ہوجاتی۔ میں خود کو ناقص و نامکمل محسوس کرتا رہوں گا، اپنی ذات میں ایک کمی محسوس کرتا رہوں گا۔"

اُستاد نے کہا "موضع لوہاری یہاں سے قریب ہی واقع ہے وہاں چلے جاؤ، لوہاری میں کسی سے بھی میاں جی نور محمد کا پتہ معلوم کرلینا جاکر ان سے مل لو۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ تمہاری پریشانی اور انتشار کا حتمی علاج کردیں گے۔"

امداد حسین نے اُستاد کو متشکرانہ نظروں سے دیکھا اور اسی وقت پا پیادہ لوہاری روانہ ہوگئے۔ منزلِ مقصود تک پہنچتے پہنچتے ان کے پیروں میں آبلے پڑگئے۔ وہ پھوٹنے لگے اور ان سے پانی جاری ہوگیا۔ لوہاری پہنچ کر لوگوں سے میاں جی نور محمد کا پتہ پوچھا تو انھوں نے امداد حسین کو اس مشہور بزرگ کے آستانے پر پہنچا دیا۔ آستانے میں داخل ہوتے ہی کسی نے میاں جی نور محمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ ہیں حضرت میاں جی نور محمد مدظلہٗ۔"

امداد حسین نے انھیں دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہی وہ بزرگ ہیں رسول اللہؐ نے جن کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ دیا تھا۔ یہ فوراً آگے بڑھے اور انھیں پُرشوق نظروں سے دیکھنے لگے پھر خود رفتگی سے آگے بڑھے اور میاں جی نور محمد کے قدموں میں گر گئے۔ میاں جی نے انھیں قدموں سے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا اور پوچھا "کیا تمھیں اپنے خواب پر یقین کامل اور اعتبارِ واثق ہے؟"

امداد حسین نے جواب دیا "حضرت! ایک ایسا خواب جس میں رسولِ مقبولؐ موجود ہوں شک و شبے سے بالا ہوتا ہے۔ میں اپنے خواب پر شک کس طرح کرسکتا ہوں، اس کی صداقت پر مجھے پہلے بھی یقین تھا، اب بھی یقین ہے۔"

میاں جی نور محمد نے پوچھا "رسول اللہؐ نے تمھارا ہاتھ کس کے ہاتھ میں دیا تھا؟"

"آپ کے ہاتھ میں!" امداد حسین نے جواب دیا "اپنے خواب کی صداقت پر یقین تو تھا ہی لیکن آپ نے جس طرح میرے خواب کا ذکر کیا ہے اس سے مجھے خود آپ کی ذات بابرکات میں فیوض و کمالات کا بھی یقین ہوگیا ہے ورنہ ایک ایسا خواب جس کا آپ کو کوئی علم نہیں ہونا چاہیے آپ اس سے واقف ہیں اور میرے بتائے بغیر آپ بتا رہے ہیں۔ یہ ایک ایسی کرامت ہے کہ اس کا انکار ناممکن ہے۔"

میاں جی نے کہا "اچھا تم میرے پاس ہی رہو۔ میں رسول اللہؐ کا ادنا غلام ہوں۔ میں تمھاری مادّی اور روحانی تعلیم و تربیت کی ذمّہ داری قبول کرتا ہوں۔"

امداد حسین میاں جی کے ساتھ رہنے لگے اور ایک مدّت بعد خرقۂ خلافت حاصل کرلیا۔ اس موقع پر میاں جی نے پوچھا "اب بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟"

امداد حسین نے جواب دیا "وہی جو خدا پسند کرتا ہے۔"

میاں جی نے کہا "جواب واضح ہونا چاہیے، تسخیر کے طالب ہو یا کیمیا چاہتے ہو؟ جو چاہو طلب کرلو، تمھیں بخش دیا جائے گا۔"

امداد حسین رونے لگے۔ کہا "میں نے دُنیا کے لیے آپ کا دامن نہیں پکڑا ہے، میں خدا کو چاہتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ خدا مجھ سے عظیم خدمات لے، اتنی عظیم کہ ان سے خدا کی مخلوق فیض یاب ہو، فائدہ اٹھائے۔"

میاں جی نے انھیں سینے سے لگا لیا۔ بولے "میں تمھاری ہمّت کی داد دیتا ہوں، جاؤ میری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں اور خدا تمھیں مایوس نہیں کرے گا، جو چاہتے ہو وہی ملے گا۔"

امداد حسین یہاں سے رخصت ہوکر گھر پہنچے تو اللہ اللہ کرنے لگے۔ ایک رات پھر خواب میں دیکھا کہ رسول اللہؐ انھیں یاد فرما رہے ہیں۔ امداد حسین نے پوچھا "اب اس ناچیز کے لیے کیا حکم ہے؟"

رسول اللہؐ نے فرمایا "تم ہمارے پاس کیوں نہیں آئے؟ ہمیں تمھارا انتظار ہے۔"

جب یہ جاگے تو فوراً سفر کی تیّاری کردی اور مکہ معظمہ روانہ ہوگئے وہاں ان کی ملاقات مولانا شاہ محمد اسحاق سے ہوگئی۔ یہ شاہ ولی اللہ دہلوی کے صاحبزادے حضرت عبدالعزیز محدّث دہلوی کے نواسے تھے۔ انھوں نے شاہ ولی اللہ کی تحریک چلانے کی بھرپور کوشش کی تھی اور پورے برصغیر میں ایک ہلچل مچا دی تھی لیکن اپنوں اور غیروں کی مخالفت اور ریشہ دوانیوں نے انھیں ناکام بنا دیا تھا۔ اسی جدوجہد میں سیّد احمد شہید ہوگئے تھے۔ شاہ محمد اسحاق تحریک کی ناکامی کے بعد مکہ معظمہ ہجرت کرگئے اور وہیں مستقل اقامت اختیار کرلی۔ وہ وہیں سے برصغیر کی تحریک کی قیادت فرما رہے تھے۔

انھوں نے نوجوان امداد حسین سے دریافت کیا "تمھارا نام کیا ہے؟"

جواب ملا "امداد حسین!"

شاہ اسحاق نے کہا "نہیں! آج سے تم امداد حسین نہیں رہے، امداد اللہ کہلاؤ گے۔"

انھوں نے جواب دیا "بسر و چشم، مجھے منظور ہے۔"

شاہ اسحاق کی صحبت نے تو ان کی کایا ہی پلٹ دی۔ انھیں یہاں سے جو تعلیمات ملیں وہ نہایت عجیب و غریب اور منفرد تھیں۔

شاہ اسحاق نے دریافت کیا "برصغیر کی کیا حالت ہے؟"

امداد اللہ نے جواب دیا "بہت بُری حالت ہے۔ مغل بادشاہ کی برائے نام حکومت ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سفید فام تاجر آہستہ آہستہ پورے ہندوستان پر قابض ہوتے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اب گلی کوچوں اور بازاروں میں شاہی منادیوں آواز لگاتا ہے "خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا۔" فسق و فجور عام ہے، ہر طرف بے عملی کا دور دورہ ہے کفار چاق و چوبند ہیں اور مسلمان تغافل اور تفاخر میں مبتلا ہیں۔"

شاہ اسحاق نے کہا "تم ہندوستان واپس جاؤ گے اور شاہ ولی اللہ کی تحریک کو آگے بڑھاؤ گے!"

امداد اللہ نے پوچھا "شاہ ولی اللہ کی تحریک کا نصب العین کیا ہے اور وہ ہندوستان میں کیسا انقلاب برپا کرنا چاہتی ہے؟"

شاہ اسحاق نے جواب دیا "ہم تمھیں شاہ صاحب کی تحریک کے نصب العین سے اچھی طرح باخبر کردیں گے اور یہ تحریک کس طرح کامیاب ہوسکتی ہے ان تدابیر پر بھی روشنی ڈالیں گے۔"

امداد اللہ شاہ اسحاق کے پاس رہنے لگے۔ انھیں یہ خیال بھی ستاتا رہتا تھا کہ رسول اللہؐ نے انھیں طلب فرمایا ہے اور وہاں حاضری دینا ضروری ہے لیکن انھوں نے سوچا کہ پہلے شاہ صاحب کی تحریک اور اس کا نصب العین سمجھ لیا جائے کیونکہ اس تحریک کا تعلق بھی رسول اللہؐ کی منشا اور غایت ہی سے ہوگا۔

★

شاہ اسحاق نے ہندوستان کی بربادی اور تباہی کے دو سبب بتاتے ہوئے کہا "شاہ ولی اللہ نے ہندوستان کی زبوں حالی کے دو بنیادی سبب معلوم کرلیے تھے۔ پہلا سبب یہ ہے کہ ملک میں خاص خاص طبقے اس بات کے عادی ہوگئے ہیں کہ کچھ کیے دھرے بغیر اپنے کسی خاص امتیاز کی بنا پر مراعاتِ حقوق کے مستحق قرار پائیں۔ یہ لوگ قاری، عالم، شاعر اور وہ سجادہ نشین درویش ہوتے ہیں جو بادشاہوں کی طرف سے عطیے اور وظیفے پاتے ہیں۔ ان کا مطمحِ نظر ملک اور قوم کی خدمت کرنا نہیں محض دریوزہ گری ہوتا ہے۔ یہ حضرات بھیک کے نئے نئے ڈھنگ نکالتے ہیں۔ مختلف حیلے بہانوں سے بادشاہ اور امرا سے رقمیں وصول کرنا اور اپنا ذریعہ معیشت فراہم کرنا ان کا نصب العین ہوتا ہے۔ ان مہذب دریوزہ گروں کا ایک گروہ جاتا ہے تو دوسرا نازل ہوجاتا ہے۔ یہ لوگ ملکی باشندوں کی زندگی تنگ کر رہے ہیں اور ملک اور قوم پر بارِ گراں بنتے جا رہے ہیں۔

خرابی اور بربادی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ کاشت کاروں، سوداگروں اور دست کاروں پر بھاری بھاری محصول لگائے گئے ہیں اور ان کی وصولیابی میں انتہائی سختی سے کام لیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جبر و تشدد اور بھوک اور افلاس میں مبتلا وفادار رعایا بھی بغاوت پر اُتر آتی ہے۔ اس بغاوت کو دبانے کے لیے غیر معمولی فوجی طاقت کی ضرورت پڑتی ہے اور اس غیر معمولی فوجی قوت کے مصارف بھی رعایا ہی سے جبر و تشدّد سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ مہذب دریوزہ گروں کی پرورش اور فوجی قوت کے غیر معمولی مصارف نے ملک اور قوم کو کھوکھلا کرکے رکھ دیا ہے۔"

امداد اللہ نے ملکی اور قومی تباہی اور بربادی کا یہ دل نشیں اور پُراثر تجزیہ سُنا تو جذباتی ہوگئے، پوچھا "پھر ملک اور قوم کی فلاح و بہبود کن باتوں پر منحصر ہے؟"

شاہ اسحاق نے جواب دیا "ملک کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے کہ ملک میں محصول کم سے کم ہوں اور دفاع پر بقدرِ ضرورت صرف کیا جائے اور حالات ایسے پیدا کیے جائیں کہ اندرونی بغاوت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔"

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

یہ اتنا بڑا انکشاف تھا کہ اس کے بوجھ نے امداد اللہ کو گم صُم کر دیا اور وہ اس مختصر تقریر پر گھنٹوں غور کرتے رہے۔ اُس وقت پورا ہندوستان ان کے سامنے تھا۔ پورا ہندوستان اور اس کا گھن لگا معاشرہ اپنے طبقات کے ساتھ ایک ایک کر کے ان کے عرصۂ خیال سے گزرنے لگا۔ امرا، شعرا، دُنیا دار سجادہ نشین، خانقاہوں کے مجاور، خود غرض اور زمانہ ساز علما، یہ سب گِدھوں کی طرح ملک اور قوم کے نیم جاں جسم سے چمٹے ہوئے نوچنے کھانے میں مصروف دکھائی دیے۔ ملک اور قوم کا نیم جاں جسم کاشت کاروں، دست کاروں، تاجروں اور مزدوروں کا تھا۔ امداد اللہ نے سوچا کہ وہ تو ایک ایسی سمت میں جانے والے تھے جہاں دُنیا اور اہلِ دُنیا کی نفی ہو جاتی تھی لیکن خدا انھیں دنیا والوں کی طرف لیے جا رہا تھا۔ پھر انھیں یاد آیا کہ انھوں نے اپنے پیر و مرشد حضرت میاں جی نور محمد سے طلب بھی تو یہی چیزیں کی تھیں۔ انھوں نے حضرت میاں جی سے کہا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ خدا مجھ سے کوئی عظیم کام لے۔ اپنی عظیم خدمات، اتنی عظیم کہ ان سے خدا کی مخلوق فیض یاب ہو، فائدہ اٹھائے۔ انھوں نے خیال کیا کہ ان کی خواہش پوری کی جا چکی ہے اور خدا ان سے جس نوع کی خدمات لینا چاہتا ہے وہ وہی ہیں جن سے خدا کی خوشنودی حاصل ہو گی اور جن سے خدا کی مخلوق عظیم فائدے اٹھائے گی۔ اب ان کا شاہ اسحاق کی صحبت میں رہنے اور ان کی تقریریں سُننے میں اتنا جی لگنے لگا کہ ہر وقت یہی جی چاہتا کہ شاہ اسحاق بولتے رہیں اور وہ سُنتے رہیں۔

ایک دن شاہ اسحاق نے کہا "کیا تم واقف ہو کہ رسُول اللہ؀ اس دنیا میں کیوں تشریف لائے تھے؟"

امداد اللہ نے جواب دیا "واقف ہوں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ جو غرض و غایت آپ بتائیں گے وہ زیادہ حقیقی اور اعلا و ارفع ہوں گی اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ میرے جواب کے بجائے خود ہی اس سوال کا مفصل اور مشرح جواب عنایت فرما دیں۔"

شاہ اسحاق نے جواب دیا "رسُول اللہ؀ کی تشریف آوری کے وقت دنیا کی یہ حالت تھی کہ دُنیا عیش و عشرت میں بُری طرح مبتلا تھی اور شاہانہ تکلفات کا مرض اقتصادی توازن کو دیمک کی طرح چاٹ چکا تھا ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے دل میں القا کیا کہ وہ اس کا ایسا علاج کریں کہ مرض بھی ختم ہو جائے اور اس کا زہریلا مادہ بھی فنا ہو جائے چنانچہ آپ نے ان اسباب و وجوہ پر غور فرمایا جن سے اس مرض کے جراثیم نشو و نما پا رہے تھے۔ پھر آپ نے ان کا علاج کیا اور ایک صالح گروہ پیدا کر دیا۔"

امداد اللہ نے بے بسی سے کہا "حضرت! آپ جو کچھ فرماتے ہیں اس میں معیشت اور اقتصادیات پیش پیش ہیں، آپ روحانیات کا ذکر بھی تو فرمائیں۔"

شاہ اسحاق نے جواب دیا "تباہ حال معیشت اور بُری اقتصادی حالت جسم اور روح دونوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہے اس لیے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کسی حال میں اور کسی وقت بھی۔"

اس دن شاہ اسحاق نے انھیں جو تعلیم دی اور تقاریر کے ذریعے جو کچھ بتایا وہ شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ سے لیا گیا تھا۔ شاہ اسحاق نے شاہ ولی اللہ کی کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا۔

"ارباب حکومت کا ٹھاٹھ اور تفاخر (ایک کا دوسرے سے بڑھ چڑھ کر رہنے کا مرض) معاشرے کا مزاج بگاڑ دیتا ہے۔ اس کا اثر یوں ظاہر ہوتا ہے کہ ہر صاحبِ اقتدار اپنے ماتحت کو لوٹنے لگتا ہے زمیندار اور جاگیر دار کاشت کاروں کا خون چوسنے لگتے ہیں اور جنھیں غریب مزدوروں اور دست کاروں پر اختیار ہوتا ہے وہ ان کے استحصال میں لگ جاتے ہیں اور بالآخر ماتحت طبقے اتنے گر جاتے ہیں کہ ان کی زندگی اور معیارِ زندگی کھیت جوتنے والے بیلوں اور بوجھ اٹھانے والے گدھوں اور گھوڑوں کے مانند ہو جاتی ہے۔ زر کشی اور زر اندوزی کے نئے نئے قانون بننے لگتے ہیں۔ انسان کی پیدائش کا حقیقی مقصد انسانوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ایک طبقہ حد سے بڑھی ہوئی عیش اور دولت کی ہوس میں مبتلا ہو کر عقل و فکر کی چمک سے محروم ہو جاتا ہے اور دُوسرا طبقہ پیٹ کی فکر میں ایسا سرگرداں رہتا ہے کہ فکرِ فردا نام کی کوئی شے اس کے سامنے باقی نہیں رہتی اور اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ملک اور قوم کی تمام دولت سمٹ کر چند افراد کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے اور ان چند افراد کا سربراہ بادشاہ ہوتا ہے!"

امداد اللہ حیرت زدہ اور مبہوت پلک جھپکائے بغیر شاہ اسحاق کی تقریر سُنتے رہے۔ یہ عجیب و غریب علم تھا۔ عجیب انکشافات تھے۔ ان کے دل و دماغ پر افکار کا بوجھ کسی پہاڑ کی طرح گر رہا تھا اور وہ خود کو اس میں دبتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ شاہ اسحاق کی تقریر جاری تھی، وہ کہہ رہے تھے "اقتصادی عدم توازن اور طبقۂ اعلا کی شان و شوکت اور عیش پرستی نے ایک تیسرا طبقہ پیدا کر دیا۔ یہ طبقہ تن آسان، آرام طلب، سرکار پرست خوشامدیوں کا طبقہ ہے جو بادشاہ اور شاہ پرستوں کے گرد جمع ہو گیا ہے اور مختلف طریقوں سے رقمیں وصول کرتا رہتا ہے۔ ان میں خانقاہ نشین اور شعرا بھی شامل ہیں۔ بھانڈ اور مسخرے بھی انھی میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ کے لوگ بھی انھی میں شامل ہیں۔ فنونِ لطیفہ اور ادب اور شاعری کے لوگ بادشاہ کو ہمیشہ یہ باور کراتے رہتے ہیں کہ شانِ خسروانہ کا اظہار اسی طرح ہوتا ہے کہ بادشاہ ان کی سرپرستی کرتے رہیں۔"

امداد اللہ نے سہم کر دریافت کیا "حضرت! اور کچھ؟"

شاہ اسحاق نے کہا "ایسے تمام لوگ جنھیں لازمۂ تمدن مانا جاتا ہے درحقیقت مفت خورے ہیں۔ اپنے فن یا خوش گپیوں سے بادشاہ کو خوش کرنا کوئی مقصد نہیں یہ مٹھی بھر لوگ مزدوروں اور کسانوں پر بار بن گئے ہیں اور اس طرح خدا کی بیشتر مخلوق روز بروز افلاس، فلاکت اور تباہ حالی میں مبتلا ہو کر مادّی اور رُوحانی فلاح و بہبود سے محروم ہوتی جا رہی ہے اور پورے ملک میں تمھیں ایک انسان بھی ایسا نہ ملے گا جسے عاقبت کی فکر ہو۔ امداد اللہ! ذرا اس قوم کا تصور تو کرو جس کی گردن پر ملوکیت، شاہ پرستی اور سرمایہ داری کا بھوت سوار ہو چکا ہو۔ اس کے ہوش و حواس گم ہو چکے ہوں گے اور وہ انسانی شرف و عظمت سے گر کر چوپایوں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہو چکی ہو گی، جسے دن رات پیٹ کی فکر رہتی ہو اور یہ جہنم ہے کہ بھرنے کا نام ہی نہ لے۔"

اسی طرح شاہ اسحاق انھیں ہر روز تعلیم دیتے رہے اور امداد اللہ اسے ذہن و طبیعت میں محفوظ کرتے رہے۔ جب وہ ان امراضِ مزمنہ کے پیشِ نظر تحریک اور اس کی کامیابی پر غور کرتے تو دل اُلجھ جاتا۔ کام بہت بڑا تھا اور اسے کامیابی سے چلانا نہایت غیر معمولی کام تھا کیونکہ اتنے بہت سارے امراض کا علاج کرنا کوئی معمولی کام نہیں تھا، قوم اور ملک کے جسم میں جو امراض موجود تھے۔ ان میں بہت تو ایسے تھے جو دو مرضوں یا کئی مرضوں کے عمل اور ردِ عمل سے پیدا ہوئے تھے اور ان میں ایک مرض کا علاج دُوسرے کے لیے زہر تھا۔ ان پیچیدہ امراض کے علاج میں وہی مشکل درپیش تھی جو ایک معالج کو اس وقت پیش آتی ہے جب وہ مالیخولیا اور بخار میں مبتلا کسی مریض کا علاج کرتا ہے، اگر معالج بخار کے فساد سے بچنے کے لیے ترکِ غذا کا حکم دیتا ہے تو ترکِ غذا سے مالیخولیا میں شدت پیدا ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح مالیخولیا کو زائل کرنے کے لیے اگر مریض کو اچھی اچھی غذائیں کھانے کا مشورہ دیتا ہے تو بخار سے نقصان پہنچنے کا احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔

شاہ اسحاق کی صحبت اور تقریروں نے امداد اللہ کے دل میں ایک آگ لگا دی تھی۔ وہ جلد از جلد مدینہ منورہ جانے کے لیے بے چین تھے۔ راستے مخدوش تھے اور راہ میں لُٹ جانے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ امداد اللہ نے خوف و خطر کو دل سے دُور کیا اور مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔ مدینے میں رسُول اللہ؀ کے آستانے پر حاضری دی اور جو ذمہ داریاں اور فرائض انھیں سونپے جا رہے تھے، ان سے عہدہ برآ ہونے کی دُعا مانگی۔

اس کے بعد آپ ہندوستان واپس گئے۔ اب ان کے

ایک مصلح

کے بارے میں سُنا گیا کہ وہ جھوٹ بولنے لگا ہے، ایک دن چند آدمیوں نے اس کا راستہ روک لیا اور کہا "تم لوگوں کو گمراہ کر رہے ہو!"

مصلح نے جواب دیا "اگر میں گمراہ کر رہا ہوں تو یہ گمراہی عارضی ہو گی کیونکہ مجھے اس بات پر یقین ہے کہ جس جھوٹ کو تم میری ذات سے منسوب کر رہے ہو، وہ شیطان تک نہیں بولتا!"

لوگوں نے حیرت سے سوال کیا "کیا کہا، شیطان جھوٹ نہیں بولتا؟"

"ہاں شیطان جھوٹ نہیں بولتا!"

"وہ کس طرح؟ ہم تمھاری بات پر کس طرح یقین کر لیں؟"

مصلح نے جواب دیا "میرے سادہ لوح دوستو! یاد رکھو۔ اگر شیطان جھوٹ بولتا تو کب کا مر چکا ہوتا لیکن وہ تمھارے بقول ابھی زندہ ہے اور اس کا زندہ ہونا ہی اس کے سچے ہونے کی دلیل ہے کیونکہ حیاتِ جاوداں کے لیے صداقت لازمی اور ضروری ہے۔"

زیرِ مطالعہ شاہ ولی اللہ دہلوی کی حجۃ اللہ البالغہ تھی جس میں وہی تعلیمات بالتفصیل موجود تھیں جو شاہ اسحاق تقاریر کی شکل میں دے چکے تھے۔ اس کتاب میں 'فک کل نظام' کی دعوت دی گئی تھی۔ فک کل نظام کا مطلب تھا ہمہ گیر انقلاب۔ سماجی اور سیاسی زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب اور اس انقلاب کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا تھا کہ فوجی طاقت سے برپا کیا جائے۔ آپ نے جس جگہ قیام کیا تھا وہاں حسن علی شاہ نامی ایک بزرگ بیٹھا کرتے تھے۔ امداد اللہ کو دیکھتے ہی انھوں نے وہ جگہ چھوڑ دی اور دُوسری جگہ چلے گئے۔ امداد اللہ کو یہاں یکسوئی سے بیٹھ کر ایک عظیم الشان منصوبہ بنانا تھا۔ امداد اللہ کی تیز نظریں اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں۔ معاشرتی اور سیاسی زندگی کا ہر شعبہ اتنا داغدار تھا کہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں کہاں پھایا رکھا جائے۔ امداد اللہ جس جگہ قیام فرما تھے، حضرت میاں جی نور محمد ملاقات کو پہنچے اور مل کر بہت خوش ہوئے۔ پڑوس میں ایک ایسا خاندان بھی رہتا تھا جو اس جگہ کی ملکیت کا دعوے دار تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ یہ جگہ حکومت اسے دے دے۔ میاں جی نور محمد کی بزرگی کا بڑا شہرہ تھا۔ وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی "حضرت! آپ خدا سے دُعا کریں کہ یہ جگہ سرکار میرے نام کر دے۔ آپ مستجاب الدعوات ہیں، خدا آپ کی دُعا رد نہیں کرے گا۔"

میاں جی نے فرمایا "ہم ایک شرط پر دُعا کرنے کو تیار ہیں۔"

اُس شخص نے کہا "ارشاد، میں ہر ممکنہ شرط پوری کرنے کو تیار ہوں۔"

میاں جی نے کہا "ہمارے امداد کو بیٹھنے کی تکلیف ہے۔ اگر تم بعدِ قبضہ اس جگہ ایک سہ دری بنوانے کا وعدہ کرو تو ہم تمھارے حق میں دُعا کر دیں گے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

اور اس سہ دری میں امداد اللہ رہیں گے۔"

اس شخص نے وعدہ کر لیا۔ "مجھے منظور ہے، آپ دُعا فرمائیں۔"

میاں جی نے جاتے جاتے کہا۔ "ہم دُعا کرتے ہیں، تم سہ دری کی تعمیر کا بندوبست کرو!"

کچھ عرصے بعد یہ شخص میاں جی کے پاس پہنچا اور انھیں حکومت کا وہ پروانہ دکھایا جس میں سرسری طور پر یہ اطلاع دی گئی تھی کہ حکومت نے اس کے حقِ ملکیت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اس شخص نے خوش ہو کر کہا۔ "یہ سب کچھ آپ کی دُعا سے ہوا ہے۔"

میاں جی نے پوچھا۔ "لیکن تمھیں اپنا وعدہ بھی یاد ہے؟"

اس شخص نے ذرا منّہ بنا کے جواب دیا۔ "جی ہاں مجھے اپنا وعدہ یاد ہے لیکن ایک مشکل پیش آگئی ہے جس نے مجھے تشویش میں ڈال دیا ہے۔"

میاں جی نے پوچھا۔ "کیسی مشکل؟ کچھ ہمیں بھی بتاؤ۔"

اس شخص نے جواب دیا۔ "حضرت آپ سے کیا چھپانا، بات دراصل یہ ہے کہ میری مالی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ اُس وقت میں نے آپ سے سہ دری بنانے کا جوش میں آکے وعدہ تو کر لیا تھا لیکن اب جو اپنی مالی حالت پر غور کرتا ہوں تو خود کو اس کا اہل نہیں پاتا۔"

میاں جی نے بے نیازی سے پوچھا۔ "پھر اب کیا ارادہ ہے؟"

جواب ملا۔ "میں جزوی وعدہ پورا کر دوں گا، یعنی پوری سہ دری کی جگہ نصف تعمیر کرا دوں گا۔"

میاں جی نے لاپروائی سے کہا۔ "اچھا آدھی ہی سہی، جیسی تمھاری مرضی۔"

یہ شخص واپس گیا اور کچھ ہی عرصہ بعد دوبارہ حاضر ہوا، اب اس کے ہاتھ میں حکومت کا ایک اور کاغذ تھا۔ اس نے یہ کاغذ میاں جی کی طرف بڑھا دیا۔ بولا۔ "حضرت غضب ہو گیا، ستم ہو گیا، ذرا اسے ملاحظہ تو فرمائیے!"

میاں جی نے یہ کاغذ لے لیا اور اسے پڑھنے لگے۔ اس میں حکومت نے اس شخص کو اپنے فیصلے سے مطلع کیا تھا کہ "حکومت نے اس زمین کے بارے میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ جب تک تم زندہ رہو گے اس زمین کے مالک رہو گے لیکن مرنے کے بعد اس کا حقِ ملکیت حکومت کو واپس چلا جائے گا وہ جسے مناسب سمجھے گی دے دے گی۔"

میاں جی نے پوچھا۔ "تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

اس شخص نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔ "حضرت! آدمی جو محنت و مشقت کر کے جائداد بناتا ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ اس کی اولاد یا متعلقین اس سے محروم رہیں۔ آپ کو میرے معاملے میں ایک بار اور دُعا کرنا پڑے گی۔"

میاں جی نے جواب دیا۔ "ہم دُعا کیا خاک کریں، تو نے تو خود ہی آدھا کر دیا تھا۔ اب یہ شکایت کس بات کی؟"

اس شخص کی سمجھ میں معاملہ آگیا، بولا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ پوری سہ دری بنا دوں گا، میں قول سے پھر جانے پر نادم ہوں۔"

میاں جی نے کہا۔ "اچھا اب واپس جاؤ اور امداد اللہ کے لیے سہ دری بنوانے کی تیاری کرو۔"

چند دنوں بعد اس شخص کو حکومت کی طرف سے یہ اطلاع موصول ہوئی کہ زمین کی ملکیت موروثی قرار پائی۔ اس نے خوش ہو کے امداد اللہ کے لیے سہ دری تعمیر کرا دی۔

♥

امداد اللہ نے اپنے حصّے کی جائداد بھی بھائیوں کو دے دی اور خود عسرت اور تنگ دستی میں گزر کرنے لگے۔ آنے جانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان میں نہایت پڑھے لکھے لوگ بھی شامل تھے۔ ان پڑھے لکھے لوگوں سے ایک ایسی فہرست تیار ہونے لگی جو ہمہ گیر انقلاب میں ان کے ساتھی بننے والے تھے۔ ان میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولوی محمّد ضامن اور مولانا رشید احمد گنگوہی سرِفہرست تھے۔ ہمہ گیر انقلاب برپا کرنے کے موضوع پر گھنٹوں بحثیں ہوتیں اور ایک شاندار فوجی انقلاب لانے کی تدابیر زیرِ بحث آتیں۔ آنے والوں میں ایک میر عبدالغنی بھی تھے۔ ان کی آمد و رفت اچانک موقوف ہو گئی۔ امداد اللہ نے کسی سے دریافت کیا۔ "کیا بات ہے، کئی دن سے میر عبدالغنی نظر نہیں آئے۔"

کسی نے جواب دیا۔ "حضرت، ان کا نہایت حسین و جمیل لڑکا انتقال کر گیا ہے۔ اس صدمے نے انھیں پاگل کر دیا ہے، وہ اپنے ہوش و حواس ہی میں نہیں۔ مخبوط الحواس ہو گئے ہیں۔ آئیں تو کیونکر آئیں۔"

آپ نے کہا۔ "بھئی انھیں ایک بار ہمارے پاس تو لاؤ، ہم انھیں درست کر دیں گے۔"

جواب ملا۔ "کوشش کریں گے۔ اگر آگئے تو آگئے ورنہ زبردستی لانا بہت مشکل ہے۔"

"بہر حال لانے کی کوشش کرو۔"

انتظار میں کئی دن گزر گئے اور میر عبدالغنی کو نہیں لایا جا سکا ایک دن راہ میں امداد اللہ کی ان سے ملاقات ہو گئی۔ آپ نے مخبوط الحواس میر عبدالغنی کا ہاتھ پکڑ لیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ارشاد فرمایا۔

"عشق بر مُردہ نباشد پائیدار۔"

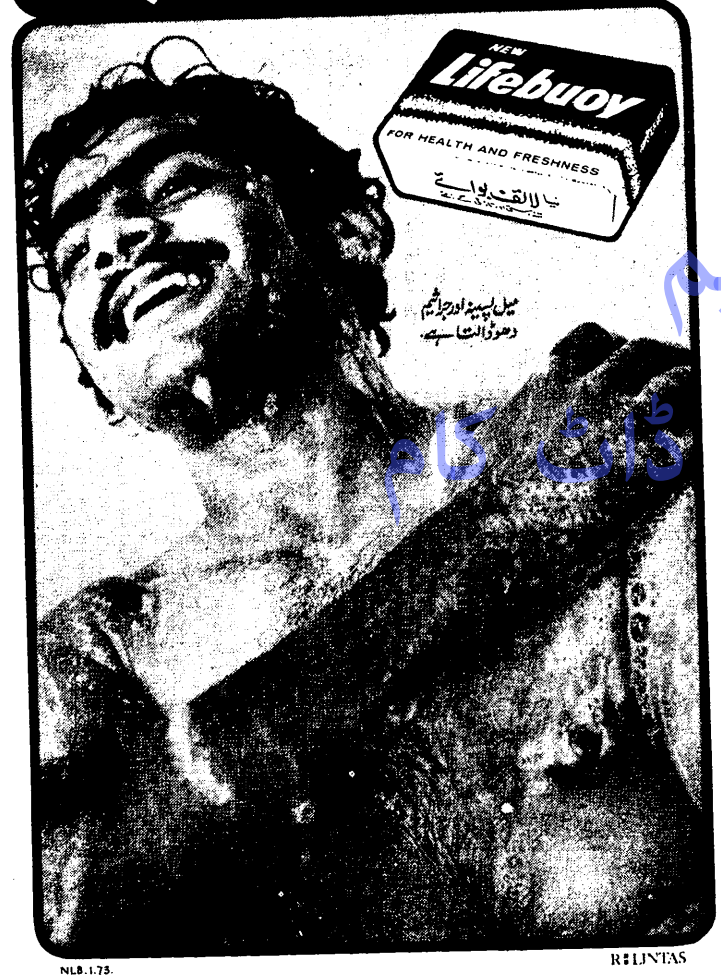

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

میر عبدالغنی نے جھرجھری لی اور ہوش میں آگئے۔ بے اختیار سینے سے لگ کر رونے لگے۔

اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے۔ ان کا یہی کام رہ گیا تھا کہ وہ سماجی اور سیاسی احوال کا جائزہ لیتے رہیں۔ اس دوران شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصنیف نے کچھ اور انکشافات کیے، ایسے انکشافات جن سے دل و دماغ لرز جائیں اور جن کی صداقت ابدی تھی۔ شاہ ولی اللہ اپنی کتاب میں یہ اصرار کر رہے تھے "زمین کا حقیقی مالک اللہ ہے لیکن ظاہری نظام کے لحاظ سے مملکت ہے، باشندگانِ ملک کی حیثیت کسی مسافر خانے میں ٹھہرے ہوئے مسافروں جیسی ہے۔

سارے انسان برابر ہیں اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچ سکتا کہ وہ خود کو دوسرے انسانوں کی گردنوں کا مالک تصوّر کرے۔

ملک کے سربراہ کی وہ حیثیت ہے جو کسی وقف کے متولی کی ہوتی ہے۔ سربراہ وقف کے متولی کی طرح اتنا وظیفہ لے سکتا ہے کہ ملک کے عام باشندے کی طرح زندگی گزار سکے۔"

شاہ ولی اللہ کی اس کتاب میں اقتصادی اصُول بھی موجود تھے۔ یہ بھی اپنی نوعیت اور تعریف کے اعتبار سے منفرد اور عجیب و غریب تھے۔ ان میں وہ حقائق بیان کیے گئے تھے جو عام فہم نہ تھے اور قبل از وقت تھے جن کے رواج کے لیے یہ ضروری تھا کہ پہلے انسانوں میں ذہنی انقلاب برپا کیا جاتا اور جو مستقبل کی قسمت تھے۔ مزدُور اور کاشت کار جن کا معاشرے میں کوئی مقام نہ تھا، ان کے لیے شاہ ولی اللہ نے یہ لکھا تھا۔

"دولت کی اصل بنیاد محنت ہے۔ مزدور اور کاشت کار قوتِ کاسبہ ہیں۔ جب تک کوئی شخص ملک اور قوم کے لیے کام نہ کرے ملک کی دولت میں اُس کا کوئی حصّہ نہیں۔

مزدور اور کاشت کار اور وہ لوگ جو ملک اور قوم کے لیے دماغی کام کریں، دولت کے اصل مستحق ہیں، ان کی ترقی اور خوش حالی ملک اور قوم کی ترقی اور خوش حالی ہے۔ جو نظام ان قوتوں کو دبائے وہ ملک کے لیے خطرہ ہے اور اس کو ختم ہو جانا چاہیے۔

جو سماج محنت کی صحیح قیمت نہ ادا کرے، مزدوروں اور کاشت کاروں پر بھاری محصول لگائے قوم کا دشمن ہے۔ اس کو ختم ہو جانا چاہیے۔

ضرورت مند مزدُور کی رضامندی قابلِ اعتبار نہیں جب تک اس کی محنت کی وہ قیمت نہ ادا کی جائے جو امداد باہمی کے اصُول پر لازم آتی ہے۔

کام کے اوقات محدود کیے جائیں اور مزدُوروں کو اتنا وقت ضرور ملنا چاہیے کہ وہ اخلاقی اور روحانی اصلاح کر سکیں اور ان کے اندر مستقبل کے متعلق غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔

وہ کاروبار جو دولت کی گردش کو کسی خاص طبقے میں محصور کر دے، ملک کے لیے تباہ کن ہے۔

روٹی، کپڑا اور مکان اور ایسی استطاعت کہ آدمی شادی کر سکے اور بچوں کو تعلیم و تربیت دے سکے، بلا لحاظ مذہب و نسل ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔

وہ شاہانہ نظامِ زندگی جس میں چند اشخاص یا چند خاندانوں کے عیش و عشرت کی وجہ سے دولت کی صحیح تقسیم میں خلل واقع ہو رہا ہو، اس کا مستحق ہے کہ اس کو جلد از جلد ختم کر دیا جائے تاکہ عوام کی مصیبت ختم ہو جائے اور ان کو مساویانہ نظامِ زندگی کا موقع ملے۔"

فوجی تیاریوں کو جہاد کا نام دیا گیا اور طے یہ پایا کہ پہلے مغل فرماں روا کو حمایت و تائید میں لیا جائے۔ اس کے بعد ملک کی سب سے بڑی قوت انگریز کے خلاف جنگ چھیڑ دی جائے اور انھیں ملک سے نکال باہر کیا جائے۔ ایک فوجی تنظیم قائم کی گئی اور اس تنظیم کا امیر امداد اللہ کو بنا دیا گیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، حافظ ضامن اور مولانا محمد منیر کو فوج، حفاظت، عدل و قانون وغیرہ کے شعبے دیے گئے اور یہ طے پایا کہ مغل تاجدار کو بھی اس تنظیم میں شامل کر لیا جائے بادشاہ کے منہ چڑھے نواب شبیر علی مراد آبادی کو بادشاہ کے پاس روانہ کر دیا گیا تاکہ وہ اُس انقلابی تنظیم کے اغراض و مقاصد سے بادشاہ کو اچھی طرح آگاہ کر دیں۔ انگریز بھی اس تنظیم سے غافل نہیں تھے۔ اسی دوران رئیس تھانہ بھون قاضی عنایت علی کے بھائی عبدالرحیم سہارنپور ہاتھی خریدنے تشریف لے گئے۔ سہارنپور کے انگریز مجسٹریٹ (اسپنکی) نے انھیں گرفتار کر لیا اور پھانسی پر لٹکا دیا۔

جنرل بخت خان دہلی میں فوجوں کی قیادت کر رہے تھے اور جنرل بخت خان کی نگرانی مولانا سردار علی کر رہے تھے۔ یہ مولانا بھی اسی تنظیم کے آدمی تھے۔ اسی دوران امداد اللہ بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دہلی پہنچ گئے۔ انھوں نے جامع مسجد میں بادشاہ سے ملاقات کی اور اسے اپنے اغراض و مقاصد سے آگاہ کیا۔ بادشاہ میں اتنا دم ہی نہ تھا کہ وہ ان کی مخالفت کرتا۔ ایک طرف تو وہ انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا، دوسری طرف وہ امداد اللہ کی تنظیم کا ساتھ دینے پر آمادہ تھا۔ بادشاہ میں قوتِ فیصلہ تھی ہی نہیں۔ جو سامنے آتا وہ اسی کے ساتھ ہو جاتا۔ اس کمزور دل

اور مرغِ باد نما کی طرح سمتیں بدلنے والے بادشاہ کی تائید سے اس انقلابی تنظیم کو یہ خوش فہمی پیدا ہو گئی کہ دہلی میں صالح نظام کے قیام کی راہ ہموار ہو گئی ہے۔ علمائے کرام نے اپنی طرف سے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ صادر کر دیا اور امیرِ تنظیم امداد اللہ پر دباؤ ڈالنے لگے کہ وہ بھی فتوے کی توثیق کر دیں۔ اس مقصد کے لیے ایک مجلس بیٹھی اور معاملات مذکور زیرِ بحث آئے۔ اس مجلس کا ایجنڈا تھا "اعلانِ جہاد"۔

اجلاسِ شوریٰ میں تمام حاضر ارکان نے اقدام (جہاد) کا فیصلہ کیا۔ صرف ایک بزرگ مولانا شیخ محمد تھانوی نے مخالفت کی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے شیخ محمد کو مخاطب کرتے ہوئے ادب سے عرض کیا۔ "حضرت! کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنانِ دین (انگریزوں) پر جہاد کو فرض بلکہ جائز تک نہیں قرار دے رہے ہیں؟"

مولانا محمد محدث نے جواب دیا "اس لیے کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلاتِ جہاد موجود نہیں ہیں۔ ہم بالکل بے سر و سامان ہیں۔"

مولانا قاسم نانوتوی نے کہا "کیا ہمارے پاس اتنا سامان بھی موجود نہیں جتنا کہ غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے پاس موجود تھا۔"

مولانا محمد محدث نے کہا "اگر آپ کی تمام حجتیں اور باتیں مان لی جائیں تو سب سے بڑی شرطِ جہاد نصبِ امام کی ہے۔ وہ شخص کہاں ہے جسے امام بنا کر اس کی قیادت میں جہاد کیا جائے؟"

مولانا قاسم، امداد اللہ کی طرف بڑھتے ہوئے بولے "نصبِ امام میں کتنی دیر لگتی ہے، مرشدِ برحق حضرت حاجی امداد اللہ ہم میں موجود ہیں انھیں کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی جائے۔"

شریکِ مجلس اور جنگی امُور کے نگراں مولانا ضامن نے کہا "مولانا بس کیجیے، بات سمجھ میں آگئی۔"

اس کے بعد مجلس کے سبھی حضرات، امداد اللہ کی طرف بڑھے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے۔ اس کے بعد سرفروشوں کا قافلہ شاملی (مظفر نگر) کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہاں کا راجا پہلے ہی سے انگریزوں کے خلاف تھا۔ اب صُورتِ حال یہ تھی کہ حاجی امداد اللہ تو امام تھے اور مولانا قاسم نانوتوی سپہ سالار۔ مولانا رشید احمد گنگوہی قاضی۔ مولانا منیر اور حافظ ضامن میمنہ اور میسرہ کے افسر تھے۔ ان لوگوں کے آس پاس لوگ جمع ہونے لگے اور بہت جلد اتنی طاقت ہو گئی کہ تھانہ بھون کے آس پاس سے انگریزوں کے ماتحت حکام نکال دیے گئے اور ان حضرات نے یہاں کا نظم و نسق سنبھال لیا۔ اسی دوران میں انھیں خبر ملی کہ انگریزی توپ خانہ حرکت میں آچکا ہے۔ انگریزی توپ خانہ جدید اسلحہ سے لیس تھا اس کے برعکس ان حضرات کے پاس تلواریں

مولانا رُومیؒ

کی صحبت میں عقل و دانش کی باتیں چھڑی ہوُئی تھیں، دورانِ گفتگو کسی شخص نے مولانا سے سوال کیا "حضرت! جب خدا کسی کو اس کے اعمال کی پاداش میں رُسوا کرنا چاہتا ہے تو اس سے کس قسم کے اعمال سرزد کراتا ہے؟"

مولانا رُومی نے جواب دیا "اسے اپنے بزرگوں پر لعن طعن کرنے پر مائل کر دیتا ہے"

تھیں۔ توڑے دار بندوقیں تھیں اور برچھے تھے۔ توپ کسی کے پاس بھی نہ تھی۔ جب انگریزی توپ خانہ ایک باغ کے کنارے سے گزر رہا تھا۔ تو باغ میں چھپی ہوئی جمعیت نے اس پر اچانک حملہ کر دیا اور سراسیمہ اور بدحواس انگریزی توپ خانے والوں کو شکست دے کر سامان پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد شاملی پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ یہ مقابلے جاری ہی تھے کہ حافظ ضامن شہید ہو گئے۔ کہتے ہیں انگریزوں کے خلاف معرکہ آرائی میں مشہور بزرگ حضرت فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی بھی شریک تھے عین جنگ کے دوران یہ انگریزوں کے مقابلے سے ہٹ گئے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ایک طرف روانہ ہو گئے، کسی نے ان سے سوال کیا "حضرت! آپ کہاں تشریف لیے جاتے ہیں؟"

مولانا فضل الرحمٰن نے جواب دیا "انگریزوں سے جنگ کرنے کا فائدہ؟ میں نے ان کی صفوں میں خواجہ خضر کو دیکھا ہے، تم لوگ ناکام رہو گے۔"

اسی عالم میں یہ معلوم ہوا کہ دہلی پر انگریز قابض ہو گئے اور مغل بادشاہ گرفتار کر لیا گیا۔ دہلی کے تسلط کے بعد انگریزوں نے قرب و جوار کو سر کرنا شروع کر دیا۔ شاملی، سہارنپور اور مظفر نگر کی باری بھی آگئی۔ حاجی امداد اللہ کی جماعت نے انگریزوں کو روکنے کی بھرپور کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ تحریک کے بنیادی ارکان ادھر اُدھر روپوش ہو گئے۔ انگریزی حکومت نے ان کے نام وارنٹ جاری کر دیے۔ حاجی امداد اللہ پنجلاسہ (انبالہ) پہنچ گئے۔ یہاں کا رئیس راؤ عبداللہ خاں آپ کا بہت معتقد تھا۔ انگریزوں کا وفادار لیکن آپ کا ارادت مند۔ کوئی دوسرا ہوتا تو حاجی امداد اللہ جیسے باغی کو اپنے گھر میں ہرگز پناہ نہ دیتا۔

راؤ عبداللہ خان آپ کو تخلیے میں لے گیا اور آہستہ سے سوال

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

کیا۔ "حضرت! رات کی تاریکی میں یہاں تک آتے ہوئے آپ کو کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "راؤ عبداللہ! تم گھبراتے کیوں ہو؟ ہم تمھارے گھر میں نہیں رہیں گے۔"

راؤ نے عقیدت سے کہا۔ "پنجلاسہ میری جاگیر ہے، اس جاگیر میں میرے ہوتے ہوئے آپ کہیں اور نہیں ٹھیر سکتے۔"

آپ نے فرمایا۔ "ہم نے یہ کہا ہے کہ تمھارے گھر میں نہیں رہیں گے کیونکہ افرنگی ہمیں، ہمارے نقشِ پا کے سہارے ڈھونڈتے چلے آرہے ہیں۔"

راؤ ان کی باتیں نہیں سمجھ سکا، بولا۔ "حضرت! میں آپ کا اشارہ نہیں سمجھا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "ہم تمھارے اصطبل کی اس کوٹھری میں رہ لیں گے جس میں تم اپنے مویشیوں کا چارہ وغیرہ رکھا کرتے ہو۔"

راؤ کو آپ کی بات سے دکھ پہنچا، بولا۔ "یہ میں کس طرح گوارا کرسکتا ہوں کہ آپ میری موجودگی، علم اور جاگیرداری میں ایسی بری جگہ اقامت فرمائیں۔"

آپ نے متبسم ہوکر فرمایا۔ "جو ہم کہتے ہیں اس میں تم دخل مت دو کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری اور تمھاری بہتری اسی میں ہے۔"

راؤ نے ہر طرح یہ کوشش کی کہ حاجی امداد اللہ اپنی اقامت کے لیے کوئی اور جگہ پسند فرمالیں لیکن یہ نہیں مانے اور مجبوراً آپ کی جائے نماز، لوٹا اور ایک چوکی مویشیوں کے چارے اور گھاس کی کوٹھری میں پہنچا دی گئیں۔

⦿

فجر کی نماز سے فارغ ہوکر راؤ عبداللہ خان لوگوں کی نظروں سے بچتے ہوئے حاجی صاحب کی کوٹھری میں پہنچا۔ اس وقت تک سورج طلوع ہوچکا تھا اور حاجی صاحب نمازِ اشراق ادا فرمارہے تھے۔ راؤ عبداللہ خان انھیں نماز میں مشغول دیکھ کر واپس آگئے۔ یہ ابھی اپنی حویلی کے دروازے پر پہنچے ہی تھے کہ سامنے سے انگریزی سپاہ کی ایک گارد آتی دکھائی دی۔ انگریز کلکٹر آگے آگے تھا۔ یہ کلکٹر ہونے کے ساتھ ہی مجسٹریٹ ضلع بھی تھا۔ راؤ عبداللہ خان اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر سنکا اور خطرے کی بو محسوس کرنے لگا۔ پھر یہ سوچ کر کہ جو ہونا ہے ہو کر رہے گا عاجز اور بے بس انسان کا مشیتِ ایزدی میں کیا دخل، ہمت کرکے مجسٹریٹ کے استقبال کو آگے بڑھا اور سلام دعا کے بعد نہایت تپاک سے ہاتھ ملایا اور کہا۔ "جناب والا! زہے نصیب کہ آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ خوش قسمتی۔ بلند طالعی، آیئے تشریف لائیے، اس وقت صبح صبح زحمت فرمائی کا کوئی تو مقصد ہوگا، براہِ کرم اس سے مطلع فرماکر اس ناچیز کو خدمت گزاری کا موقع عطا فرمائیں۔"

مجسٹریٹ راؤ کی خوش اخلاقی سے متاثر ہوا۔ کہاں تو یہ ارادہ کرکے آیا تھا کہ اچانک چھاپہ مار کر حاجی امداد اللہ کو برآمد کرے گا لیکن راؤ کے اطمینان، اعتماد اور خوش اخلاقی نے اسے مذبذب کردیا۔ اسے جس مخبر نے خبر دی تھی اس نے یہاں تک بتا دیا تھا کہ حاجی صاحب اصطبل یا اس کے آس پاس موجود کوٹھریوں میں سے کسی ایک میں روپوش ہیں۔ مجسٹریٹ کو یقین تھا کہ وہ حاجی صاحب کو یہیں کہیں سے برآمد کرلے گا۔ راؤ عبداللہ خان کی خوش اخلاقی کا پُرجوش خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ "راؤ صاحب! ہم نے یہ سن رکھا ہے کہ آپ کے اصطبل میں بڑے اچھے اچھے اور اعلا نسل کے گھوڑے موجود ہیں اور ان میں ایک ایسا گھوڑا بھی موجود ہے جس کی دور دور تک کوئی مثال نہیں ملتی، ہم تمھارا اصطبل دیکھنا چاہتے ہیں اور خاص کر وہ گھوڑا بھی جس کا دور دور شہرہ ہے۔"

راؤ عبداللہ خان سناٹے میں آگیا لیکن اندر کی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ آپ نے سنا ہے، ممکن ہے سچ ہی ہو۔ اگر آپ کو ہمارے اصطبل کا کوئی گھوڑا پسند آگیا تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی اور ہم وہ گھوڑا بخوشی آپ کی نذر کردیں گے، آیئے ہمارے ساتھ تشریف لائیے اور اصطبل کے گھوڑے ملاحظہ فرمالیجیے۔"

مجسٹریٹ، راؤ عبداللہ خان کے ساتھ اس کے اصطبل میں داخل ہوگیا۔ راؤ عبداللہ خان نے ایک ایک کرکے اصطبل کے تمام گھوڑے دکھادیے۔ مجسٹریٹ گھوڑوں کے ساتھ ساتھ راؤ کے چہرے کا بھی جائزہ لیتا جارہا تھا۔ وہ راؤ کے چہرے پر خوف یا تشویش کے آثار دیکھنا چاہتا تھا لیکن راؤ میں ذرا بھی گھبراہٹ نہ پائی جاتی تھی۔ مجسٹریٹ کو اس مخبر پر غصہ آنے لگا جس نے اسے یہ جھوٹی خبر دی تھی کہ حاجی امداد اللہ، راؤ عبداللہ خان کے اصطبل وغیرہ میں کہیں روپوش ہیں۔ مجسٹریٹ اصطبل کے گھوڑوں کو دیکھتا بھالتا اس کوٹھری کے دروازے پر بھی پہنچ گیا جہاں حاجی صاحب واقعی روپوش تھے۔

مجسٹریٹ نے راؤ سے پوچھا۔ "اور اس میں کیا ہے؟"

راؤ نے جواب دیا۔ "یہ اصطبل نہیں ہے، اس میں گھاس اور مویشیوں کا دوسرا چارا رکھا جاتا ہے۔"

مجسٹریٹ نے پیشانی پر تردد کی شکنیں ڈالیں۔ بولا۔ "گھاس اور مویشیوں کا دوسرا چارا؟ کیا مطلب؟ کیا مویشی گھاس کے علاوہ بھی کچھ کھاتے ہیں؟"

راؤ نے جواب دیا۔ "جی ہاں، دالیں، کھلی، چوکر، کربی، اسی طرح کی اور بہت ساری چیزیں۔"

مجسٹریٹ نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ "ذرا کھلوانا تو، ہم بھی تو دیکھیں کہ مویشی کون کون سی چیزیں اور کھاتے ہیں۔"

راؤ کا دل دھک دھک کرنے لگا، اللہ کا نام لے کر یہ کوٹھری بھی کھلوادی۔ جب کوٹھری کے دونوں پٹ کھل رہے تھے تو راؤ کے دل کی کچھ عجیب سی کیفیت تھی۔ کوٹھری کے دونوں پٹ کھل گئے۔ خالی چوکی، چوکی پر بچھا ہوا مصلا، کنارے لوٹا رکھا تھا اور چوکی کے نیچے کی زمین تر تھی گویا ابھی ابھی وضو کیا گیا تھا۔ یہ تمام چیزیں موجود تھیں لیکن حاجی امداد اللہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔

مجسٹریٹ نے اپنے آدمیوں کی مدد سے کوٹھری کا کونا کونا چھان مارا لیکن حاجی امداد اللہ کا وہاں کہیں پتہ نہ تھا۔ مجسٹریٹ چوکی، مصلے اور لوٹے کی موجودگی کو کس طرح نظر انداز کرسکتا تھا۔ دریافت کیا۔ "راؤ صاحب یہ سامان یہاں کیوں رکھا ہے؟"

راؤ نے جواب دیا۔ "جناب میں یہاں نماز پڑھتا ہوں۔"

مجسٹریٹ نے گردن اچکائی اور قدرے منہ ٹیڑھا کیا۔ "آپ اس اصطبل میں، مویشیوں کے چارے کی کوٹھری میں نماز پڑھتے ہیں؟ عجیب سی بات ہے، حالانکہ ہم نے یہ سنا ہے کہ مسلمان لوگ مسجد میں نمازیں پڑھتے ہیں۔"

راؤ نے جواب دیا۔ "آپ نے بھی درست ہی سن رکھا ہے۔ ہمارے مذہب میں نمازوں کی بابت یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہر مسلمان فرض نمازیں تو مسجد میں ادا کرے لیکن نفلیں چھپا کر کسی چوری کی جگہ پر پڑھنی چاہییں اور اس حکم خداوندی کی تائید اور تعمیل میں ہم لوگ اشراق اور نفل نمازیں یہیں پڑھ لیا کرتے ہیں۔"

لاجواب مجسٹریٹ مایوس ہوکر باہر نکلا اور اپنی راہ لینے سے پہلے آخری بار کہا۔ "راؤ صاحب! ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے تمھارا اتنا وقت برباد کیا ہے اس کا ہمیں ہمیشہ احساس رہے گا۔"

راؤ نے انکسار سے جواب دیا۔ "آپ قطعی افسوس نہ کریں کیونکہ آپ کو کسی اعلا نسل کے گھوڑے کی تلاش تھی جو بدقسمتی سے ہمارے یہاں دستیاب نہ نکل سکا لیکن اب ایسا بھی نہیں ہے کہ آپ ہمیشہ اپنی مطلوبہ شے نہ پاسکیں۔ آپ مجھے ایک ذرا سا موقع عنایت فرمائیں۔ میں آپ کی خواہش کسی بھی طرح پوری کرادوں گا۔"

مجسٹریٹ نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور چلا گیا۔ راؤ دوبارہ

حضرت معروف کرخیؒ

کاموں کے آغاز اور انجام کی بابت اپنے مریدین کو بتا رہے تھے آپؒ نے کہا۔ "دنیا کے بعض کام ایسے ہیں جن کا آغاز تلخ، لیکن انجام خیر میں ہوتا ہے اور بعض ایسے کہ ان کا آغاز شیریں ہوتا ہے اور انجام تلخ!"

کسی مرید نے پوچھا۔ "حضرت ان دونوں کی مثال دے کر وضاحت فرمادیں تو بڑا کرم ہوگا۔"

حضرت معروف کرخیؒ نے جواب دیا۔ "مثلاً نیکی اور گناہ، نیکی کا آغاز تلخ، لیکن انجام شیریں اور گناہ کا آغاز شیریں اور انجام تلخ ہوتا ہے۔"

اسی کوٹھری میں داخل ہوا، دیکھا، حاجی امداد اللہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ اس کی عقل چکرا گئی۔ وہ کوئی سوال بھی نہ کرسکا اور اسے ان کی کرامت پر محمول کیا۔

حاجی امداد اللہ کی طرف سے مولانا رشید گنگوہی بہت بے چین اور مضطرب تھے۔ انھیں کچھ پتہ نہ تھا کہ حاجی صاحب کہاں روپوش ہیں اور کیا ارادہ رکھتے ہیں۔ آزادی سے کہیں تلاش بھی نہ کرسکتے تھے کیونکہ مولانا رشید احمد گنگوہی کا وارنٹ گرفتاری بھی کٹ چکا تھا اور وہ بھی انگریزوں کو مطلوب تھے۔ اسی افراتفری میں کسی نے مولانا رشید احمد کو یہ خبر دی کہ حاجی امداد اللہ انبالہ کی جاگیر پنجلاسہ میں راؤ عبداللہ خان کے مہمان ہیں۔ یہ چھپتے چھپاتے پنجلاسہ کے قریب پہنچ گئے اور بہ دقت تمام ملاقات کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ بہت روئے اور دریافت کیا۔ "حضرت! اب کیا منصوبہ ہے؟"

حاجی امداد اللہ نے جواب دیا۔ "مشیت کو ابھی وہ سب منظور نہیں شاید، جو ہم چاہتے ہیں اور وہ یہی کام شاید کسی اور سے لینا چاہتی ہے۔"

مولانا گنگوہی نے سوال کیا۔ "حضرت! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

حاجی امداد اللہ نے جواب دیا۔ "ہماری باتوں کا جو مطلب ہے وہ بہت صاف ہے، ہم مکۂ معظمہ جارہے ہیں اور وہیں سے اپنی تحریک جاری رکھیں گے۔"

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

مولانا گنگوہی نے پوچھا "میرے لیے کیا حکم ہے ؟"

حاجی صاحب نے جواب دیا "تم یہیں ہندوستان میں رہو گے۔"

مولانا گنگوہی نے اضطراب سے پوچھا "میں آپ کی عدم موجودگی میں یہاں کیا کروں گا ؟"

حاجی صاحب نے جواب دیا "قدرت تم سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہے اسی لیے ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم یہیں رہو اور فرمانِ خداوندی کا انتظار کرو۔"

مولانا گنگوہی کا دِل بھر آیا اور وہ آنسو برسانے لگے۔ حاجی صاحب نے پوچھا "تم روتے کیوں ہو ؟"

مولانا گنگوہی نے جواب دیا "آپ کی مفارقت کا غم ایسا نہیں ہے کہ آسانی سے جھیل لیا جائے، بہرحال آپ فرماتے ہیں تو ہم یہیں ہندوستان میں رہیں گے اور وہ کام انجام دینے کی کوشش کریں گے لیکن ایک بات طے ہے وہ یہ کہ جلد یا بہ دیر انگریز ہمیں گرفتار کرلے گا۔ اس وقت آپ سے ملاقات کی کیا سبیل ہوگی ؟"

حاجی صاحب نے جواب دیا "تم واقعی گرفتار کرلیے جاؤ گے لیکن ہم بھی یہ وعدہ کرتے ہیں کہ جانے سے پہلے تم سے ملیں گے ضرور !"

مولانا گنگوہی واپس گئے اور گرفتار کرلیے گئے۔

حاجی امداد اللہ کو ایک بار پھر انگریزی دوڑ کا سامنا کرنا پڑا۔ حاجی صاحب جس مکان میں قیام فرما تھے۔ پولیس وہاں پہنچ گئی۔ اس وقت حاجی صاحب مکان کے کھلے حصے میں، چارپائی پر دراز تھے۔ یہ مکان ایک زمیندار کا تھا۔ سپاہیوں کو اپنے مکان میں داخل ہوتے دیکھ کر زمیندار نے نوکروں کو حکم دیا "تم لوگ کیا کررہے ہو؟" سپاہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ لوگ آئے ہیں ان کی مدد کرو اور مکان کے اندر اور باہر ان کی رہنمائی کرو۔" پھر حاجی صاحب کے اوپر لحاف ڈال دیا اور ڈانٹ کر ملازمین کو حکم دیا "اس بڈھے کو کھیت میں ڈال آؤ، اس نے کھانس کھانس کے اور تھوک تھوک کے سارے گھر کو گندا کر رکھا ہے۔"

ملازمین نے سپاہیوں کی موجودگی میں حاجی صاحب کی چارپائی کو سرہانے اور پائنتی سے پکڑا اور کھیت میں ڈال آئے۔ سپاہیوں نے انھیں گھر کے کونے کونے میں چھان مارا اور بے نیل و مرام واپس گئے۔

اسی قسم کا ایک واقعہ مظفر نگر کی گڑھی پختہ میں بھی پیش آیا تھا اس زمانے میں گڑھی پختہ سہارنپور میں داخل تھی۔ یہاں کے رئیس نے حاجی صاحب کو پناہ دی لیکن مخبروں نے مجسٹریٹ ضلع کو مطلع کردیا اور پولیس کپتان گارڈ لے کر رئیس کی حویلی میں داخل ہوگیا۔ اس علاقے کے تھانے دار خواجہ احمد حسین تھے انھیں بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے حلقے میں، اس علاقے کے جس رئیس کی حویلی میں چھاپہ پڑ رہا ہے وہ حاجی امداد اللہ کی گرفتاری کی کوششوں سے تعلق رکھتا ہے۔ حویلی کے دروازے پر پہنچنے کے بعد انھیں احساس ہوا کہ یہ سب کچھ غالباً حاجی امداد اللہ کی گرفتاری کے سلسلے میں ہو رہا ہے لیکن اب معاملہ بہت آگے پہنچ چکا تھا اور تیر کمان سے چھوٹ چکا تھا۔ معلوم نہیں کس طرح ذہن کو ایک عجیب و غریب ترکیب سوجھ گئی۔ انھوں نے حویلی کے دروازے پر ہی سے چلانا چیخنا شروع کردیا۔ حویلی کے رئیس کا نام لے کر گالیاں دینا شروع کردیں اور دھونس دیتے ہوئے کہا "کدھر ہے او نمک حرام، ذرا باہر تو نکل، سرکار کے باغیوں کو اپنی حویلی میں پناہ دیتا ہے، خدا کی قسم آج دیکھنا ہے کہ تو کس طرح بچتا ہے۔ اس جرم میں اگر تیرا علاقہ ضبط نہ کرادیا ہو تو خواجہ احمد حسین نہیں، بھنگی کہلانا پسند کروں گا۔"

رئیس کے کانوں میں یہ آواز جو پڑی تو اس نے فوراً حاجی صاحب کو کسی اور جگہ بھیج دیا اور یہ چھاپہ بھی ناکام رہا۔

مولانا گنگوہی قید خانے میں اذیتیں جھیل رہے تھے۔ انھیں حاجی صاحب کا انتظار تھا۔ وہ پریشان تھے کہ حاجی صاحب ان سے کس طرح ملاقات کریں گے۔ اگر وہ یہاں حسبِ وعدہ ملنے آئے بھی تو فوراً گرفتار کرلیے جائیں گے اور مولانا گنگوہی کو یہ منظور نہ تھا کہ حاجی صاحب گرفتار کرلیے جائیں۔

ایک دن عصر سے کچھ پہلے مولانا گنگوہی نے نیم غنودگی میں دیکھا کہ حاجی صاحب ان کے سامنے کھڑے ہیں اور کچھ ارشاد فرمارہے ہیں۔

مولانا گنگوہی نے حیرت سے پوچھا "حضرت! یہ آپ! یہاں تک کس طرح پہنچ گئے، کیا باہر پہرے دار موجود نہیں ہیں ؟"

حاجی صاحب نے جواب دیا "وہ موجود ہیں لیکن ہم نے تم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ جانے سے پہلے تم سے ملاقات ضرور کریں گے چنانچہ اپنا وعدہ پورا کرنے آگئے ہیں۔ اب ہم سرزمینِ حجاز جارہے ہیں۔"

مولانا گنگوہی اداس ہوگئے، بولے "لیکن پہرے داروں نے آپ کو یہاں تک کس طرح آنے دیا؟ کیا واپس جاتے ہوئے آپ کو گرفتار نہیں کرلیں گے ؟"

حاجی صاحب واپس جاتے ہوئے بولے "ہم جس طرح آئے ہیں اسی طرح واپس بھی جائیں گے، تم ہماری فکر نہ کرو۔"

مولانا گنگوہی نے پوچھا "حضرت! میرا کیا انجام ہوگا ؟"

حاجی صاحب نے جواب دیا "تم فکر نہ کرو۔"

اس کے بعد حاجی صاحب پاک پٹن چلے گئے۔ کچھ دن وہاں رہے یہاں سے حیدرآباد سندھ میں داخل ہوگئے اور حیدرآباد سندھ سے رخصت ہوکر کراچی میں قیام کیا، کراچی سے مکۂ معظمہ چلے گئے۔

اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ آپ مناسکِ حج ادا فرمارہے تھے کہ یکایک اپنے ایک ساتھی کا ہاتھ پکڑ کر کنارے لے گئے اور افسردگی سے فرمایا "کچھ اور سنا تم نے؟ آج تو غضب ہوگیا۔"

ساتھی نے گومگو جواب دیا "کیا ہوا حضرت؟ میں نے تو کچھ بھی نہیں سُنا۔"

آپ نے گردن جھکائی اور افسوس سے کہا "رشید احمد کو پھانسی کا حکم ہوگیا۔ بہت بُرا ہوا۔"

ساتھی نے پوچھا "کس نے بتایا ؟"

آپ نے جواب دیا "بتائے گا کون، بس ابھی ابھی پتہ چلا ہے۔"

ساتھی حیرت سے صورت دیکھتا رہ گیا۔ آپ نے کچھ توقف کے بعد فرمایا "بہرحال ہم پھانسی نہیں ہونے دیں گے۔ یہاں اتنی دُور سے جو کچھ کرسکتے ہیں ضرور کریں گے۔"

ساتھی کی سمجھ میں یہ باتیں تو آرہی تھیں لیکن وہ اس کی تفصیل جاننے کا خواہش مند تھا۔

اس بات کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ آپ اُٹھے اور مولوی ولایت حسین اور مولوی مظفر حسین کاندھلوی کو اپنے ساتھ لیا اور شہر سے باہر چل پڑے۔ بارش شروع ہوچکی تھی۔ پانی سے دُھل کر سبزہ جوان ہوگیا تھا۔ اپنے دونوں ہمراہیوں کو لے کر آپ سبزے پر بیٹھ گئے اور گردن جھکا کر خاموشی اختیار کی۔ دونوں ساتھی چہرے کے آثار چڑھاؤ پر غور کرتے رہے۔ پھر سر اٹھایا تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، بولے "چلو اٹھو، واپس چلیں کام ہوگیا۔"

مولوی ولایت حسین نے سوال کیا "کیسا کام؟ کس کا کام؟ کہاں ہوگیا کام ؟"

حاجی صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے، بولے "رشید احمد کو اب پھانسی نہیں دی جائے گی۔ پھانسی کا حکم ٹل گیا۔"

کچھ دنوں بعد مولانا گنگوہی کی سزائے موت اور اس کی منسوخی کی خبر اسی ترتیب سے موصول ہوگئی۔

مکۂ معظمہ میں امیر احمد رامپوری بھی قیام فرما تھے۔ یہ صاحب بھی انگریزوں کو درکار تھے۔ گرفتاری کے ڈر سے وطن جانے کا خیال تک دل میں نہ لاتے تھے۔ ایک دن گھر کی یاد غالب آگئی اور یہ حاجی صاحب کی خدمت میں پہنچ گئے، حاجی صاحب نے صورت دیکھتے ہی کہا "ہندوستان جانا چاہتے ہو؟ جاؤ لیکن گرفتار ہوجاؤ گے۔"

امیر احمد نے خاموشی اختیار کرلی لیکن ایک دن پھر حاضر ہوئے اور اپنا پُرانا جملہ ایک بار پھر دُہرایا۔ حاجی صاحب کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوگئیں اور آپ نے ترش لہجے میں کہا "کیا تم گرفتار ہونا چاہتے ہو؟ اگر جی گرفتاری پر مائل ہے تو تم اسی وقت ہندوستان چلے جاؤ۔"

امیر احمد نے جواب دیا "حضرت! کون ہے وہ شخص جو اپنی گرفتاری سے خوش ہوگا۔"

آپ نے کہا "تو خوش ہوگا، ہمیں معلوم ہے کہ تو خوش ہوگا، جا چلا جا اور دیکھ کہ کیا چیز ظاہر ہوتی ہے۔"

کسی شخص نے امیر احمد سے تخلیے میں کہا "جناب! آپ ہندوستان فوراً روانہ ہوجائیں۔ قبلہ حاجی صاحب جیسا فرمارہے ہیں انشاء اللہ ویسا ہی ظہور پذیر ہوگا۔"

امیر احمد رامپوری اللہ کا نام لے کر ہندوستان میں داخل ہوگئے دہلی پہنچ کر ایک مسجد میں قیام کیا۔ سکون اور اطمینان کا سبب یہ تھا کہ حضرت مبہم لفظوں میں رہائی کا حکم فرماچکے تھے۔ امیر احمد نے چند دن حجرے میں رہ کر خود کو گرفتاری کے لیے پیش کردیا، ان پر مقدمہ چلا اور مجسٹریٹ دانت پیس پیس کر رہ جاتا اور یہی کہتا کہ "امیر احمد! میں تمھیں دار پر نہ چڑھاؤں تو میرا نام نہیں۔"

امیر احمد نے حقارت سے جواب دیا "کیا تم پاگل ہو؟ کیا اوٹ پٹانگ حرکتیں کررہے ہو ؟"

"مجسٹریٹ نے کہا "پاگل ہم نہیں، تم ہوگئے ہو۔"

اس کے بعد انھیں جیل بھیج دیا گیا اور مقدمات چلنے لگے۔ آخر کار انھیں تمام مقدمات سے بَری کردیا گیا اور یہ اپنے گھر رامپور چلے گئے۔

میرٹھ کی نواحی آبادی کے ایک صاحب حج کے لیے جارہے تھے۔ انھیں حاجی امداد اللہ سے غائبانہ اور والہانہ عقیدت تھی۔ انھوں نے حاجی صاحب کا صرف نام ہی نام سُنا تھا، صورت نہیں دیکھی تھی۔ ان صاحب نے حج پر روانگی سے پہلے حاجی امداد اللہ کے لیے ایک کملی تیار کرائی اور اسے دوسرے سامان کے ساتھ لے کر حج کے لیے روانہ ہوگئے۔ جب ان کا جہاز سمندر میں ہچکولے کھاتا جدے کی طرف بڑھ رہا

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

جلال الدین سیوطی

اپنے عقیدت مند کو نصیحتیں فرما رہے تھے آپ نے فرمایا "سات باتیں ایسی ہیں جو کسی بھی انسان کو ذلیل کر سکتی ہیں!"

• عقیدت مند نے پوچھا "کون کون سی؟"

سیوطی نے کہا "کسی دعوت میں بن بلائے پہنچ جانا، کسی مجلس میں اپنے مرتبے اور حیثیت سے بالاتر جگہ پر بیٹھنا، مہمان بن کر میزبان پر حکم چلانا، دوسروں کی باتوں میں دخل دینا، ان لوگوں سے خطاب کرنا جو سننے کے لیے تیار نہ ہوں، بدچلن سے دوستی کرنا اور سنگ دل اور حریص دولت مند سے مدد کا طالب ہونا۔"

تھا کہ یہ یکایک طوفان میں پھنس گیا، مسافروں پر اتنی دہشت اور بدحواسی طاری ہوئی کہ بے معنی شور و غل کرنے لگے۔ عجیب افراتفری اور نفسانفسی کا عالم تھا۔ انسانی فطرت کا تضاد جہاز پر ہر سُو نظر آ رہا تھا۔ کچھ خوف سے موت کا استقبال کر رہے تھے اور انھوں نے اپنے آس پاس موجود اپنے عزیزوں کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا اور موت اور اپنی ذات کے سوا انھیں کچھ نظر ہی نہ آ رہا تھا۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو موت کا استقبال اپنے عزیزوں اور بچّوں کے ساتھ خوش دلی سے کرنا چاہتے تھے۔ حاجی امداد اللہ کا پرستار اور معتقد جہاز کے ایک کونے میں چلا گیا اور وہاں بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں اور موت کا انتظار کرنے لگا۔ مایوسی اور دل شکستگی نے دل کا عجیب حال کر رکھا تھا۔ وہ جہاز سے پہلے ہی دم بہ دم ڈوبتا جا رہا تھا۔ اسی عالم میں ذرا غفلت سی طاری ہو گئی۔ اُس غفلت میں اس شخص نے دیکھا کہ کوئی صاحب سامنے کھڑے اس سے کہہ رہے ہیں کہ "حاجی امداد اللہ کی کملی کہاں ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا "حضرت! آپ دیکھ نہیں رہے ہے کہ جہاز طوفان میں پھنسا ہوا ہے ذرا دیر بعد ہم سب اور یہ جہاز کملی سمیت سمندر کی تہہ میں چلا جائے گا۔"

ان بزرگ نے متبسم ہو کر فرمایا "پریشان مت ہو، اٹھ کر بیٹھ جاؤ۔ کون کہتا ہے کہ یہ جہاز ڈوب جائے گا، تھوڑی ہی دیر بعد موافق ہوائیں چلنے والی ہیں اور یہ جہاز طوفان سے بچ نکلے گا۔" اس کے بعد کہا "لاؤ وہ کملی تو دے دو مجھے۔"

یہ شخص گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا کہ وہ کملی ان صاحب کے حوالے کر دے لیکن جب ہوش و حواس ذرا بجا ہوئے تو پتہ چلا کہ سامنے وہ شخص موجود ہی نہیں ہے۔ اس واقعے کو خواب یا رویائے صادقہ کے سوا کچھ اور نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس شخص کو یقین ہو گیا کہ اب جہاز طوفان میں نہیں ڈوبے گا۔ اس شخص نے اس واقعے کا ذکر کیے بغیر جہاز کے تمام مسافروں کو یہ خوش خبری سنا دی کہ جہاز نہیں ڈوبے گا۔ لوگ یہ سمجھے کہ یہ شخص موت کے خوف سے پاگل ہو گیا ہے اور جو کچھ بشارت دے رہا ہے دیوانگی کے سوا کچھ بھی نہیں لیکن دیوانے کی بشارت حرف بہ حرف سچ نکلی اور جہاز طوفان سے بچ نکلا۔

مکّے میں داخل ہوتے ہی یہ شخص تلاش کرتا ہوا حرم کعبہ میں داخل ہو گیا۔ وہاں بہت سارے لوگ موجود تھے یہ ان کے چہروں کو غور سے دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ مالکی مصلّے کے قریب ایک شخص کو کھڑے دیکھ کر رُک گیا۔ یہ شخص کملی لے کر آگے بڑھا اور کملی کو ان کے قدموں میں ڈال کر بولا "حضرت! اگر میں دھوکا نہیں کھا رہا تو یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ حضرت کا نام نامی اسم گرامی حاجی امداد اللہ ہے۔"

مخاطب کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ سوال کیا "تم نے کس طرح پہچانا؟"

اس شخص نے جواب دیا "میں آپ سے جہاز پر ملاقات کر چکا ہوں۔ جہاز کے حلیے اور موجودہ حلیے میں صرف اتنا فرق ہے کہ اُس وقت آپ تہمد زیب تن فرمائے ہوئے تھے اور اِس وقت پاجامے میں ملبوس ہیں۔"

آپ نے اس کا کوئی جواب تو نہ دیا لیکن کسی اور نے جواب دیا "طغیانی اور پانی کے لیے تہمد ہی مناسب لباس تھا۔ مناسب اور موافق ہواؤں کے حوالے کرنے میں حاجی صاحب کو بڑی محنت کرنا پڑی تھی۔"

یہ کس نے جواب دیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک آواز تھی جسے کانوں نے تو سُن لیا لیکن آنکھیں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکیں۔

پچاس سال کی عمر تک حاجی صاحب مجرّد ہی رہے پھر اشارتِ غیبی سے یہ تنبیہہ ملی کہ ایک عارف کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ شادی جیسی سنّتِ نبویہ سے محروم رہے۔ آپ نے اس اشارتِ غیبی پر بی بی خدیجہ بنت شفاعت رام پوری سے نکاح فرمایا۔

آپ چوراسی سال تین ماہ بیس روز زندہ رہے اور ۱۲ر جمادی الآخر ۱۳۱۷ھ بروز شنبہ صبح فجر کی اذان کے وقت اپنے محبوبِ حقیقی سے جا ملے اور جنت المعلےٰ (مکہ معظمہ) میں مدفون ہوئے۔

شاہ ولی اللہ کی تحریک کیوں ناکام ہوئی، اس کا تجزیہ تو مورخینِ اسلام کریں گے لیکن ہم تو یہ جانتے ہیں کہ وہ عہد طباعت اور اشاعت کے تیز رفتار اور خوبصورت وسائل سے محروم تھا اور میری ناچیز رائے میں ان کے بعد جن کے سپرد یہ کام ہوا وہ اس نکتے کو کسی طرح فراموش کر گئے کہ ذہنی انقلاب لائے بغیر کوئی بڑا انقلاب نہیں برپا کیا جا سکتا اور انقلابات نیچے سے اُوپر کی طرف چلتے ہیں، اُوپر سے آمریت یا شہنشاہیت تو نازل ہو سکتی ہے لیکن عوامی، طویل المیعاد اور اکثریت کے لیے فائدہ مند انقلاب عوام کے اعتماد اور تعاون ہی سے لایا جا سکتا ہے۔

خدا نے قرآن پاک کی سُورۂ ہُود میں فرمایا ہے۔

"اگر تم منہ پھیرتے ہو تو پھیر لو، جو پیغام دے کر میں بھیجا گیا تھا وہ میں پہنچا چکا ہوں۔ اب میرا رب تمھاری جگہ دُوسری قوم کو اٹھائے گا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔ یقیناً میرا رب ہر چیز پر نگراں ہے۔"

اور یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جس سال حاجی امداد اللہ پیدا ہوئے تھے اسی سال یعنی ۱۸۱۸ء میں ۵ رمئی کو مشرقی جرمنی میں دُنیا کا بہت بڑا انقلابی مارکس پیدا ہو چکا تھا۔ جب یہ چھ سال کا تھا تو اس کا خاندان اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر عیسائیت میں داخل ہو گیا۔ خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اس انقلابی کی خاص حالات اور ماحول میں تعلیم و تربیت ہوتی رہی۔ انتہائی نامساعد حالات میں اس نے انسانی مصائب و آلام میں معاشی اور اقتصادی اسباب اور محرکات کا پتہ چلایا اور اس نے دُنیا کو بتایا کہ انسانی تاریخ میں جو سوسائٹی بھی نمودار ہوئی ہے اس کا انحصار ذرائع پیداوار اور دولت کی تقسیم پر رہا ہے۔ کسی سیّارے کی تخلیق یا کسی حیوانی نوع کا خاتمہ تاریخ نہیں، نتائجِ تاریخ ہیں۔"

اس نے ۱۸۶۷ء میں اپنی انقلابی کتاب 'سرمایہ' کی پہلی جلد جرمن زبان میں شائع کی۔ ۱۸۷۸ء میں دوسری جلد شائع کرنے کی کوشش کی لیکن صحت جواب دے رہی تھی اس لیے یہ کام نہیں ہو سکا۔

۱۸۸۱ء میں اس کی ہمدم و ہم ساز اور زندگی میں ہر ہر قدم اور ہر حال میں ساتھ دینے والی رفیقۂ حیات چل بسی۔ ۱۴ر مارچ ۱۸۸۳ء کو وہ خود بھی چل بسا۔ موت کے بارہ سال بعد اس کے شاگرد اور دوست اینجلز نے اس کی کتاب 'سرمایہ' کو مکمل صورت میں شائع کر دیا۔

یہ اس انقلابی کا ذکر ہے جس کے لیے علاّمہ اقبال نے فرمایا تھا۔

وہ کلیمِ بے تجلّی، وہ مسیحِ بے صلیب — نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز — مشرق و مغرب کی قوموں کے لیے روزِ حساب

مارکس نے اقوامِ عالم کو لرزہ براندام کر دیا۔ اس نے کسی تکلف اور لحاظ کے بغیر صاف صاف باتیں کیں، اس نے کہا۔

" سرمایہ دار اور بورژوا طبقہ حکومت کے لیے اس لیے نااہل ہے کہ وہ اپنے پیدا کردہ غلاموں کا پیٹ نہیں بھر سکتا اور یہ اپنے غلاموں کو روٹی دینے کے بجائے ان سے روٹی حاصل کرتا ہے۔ سماج اب زیادہ دیر تک ان کے وجود کو نہیں برداشت کر سکتا اور سماج کے وجود کے لیے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔"

" سرمایہ داری اپنے ہاتھ سے اپنی قبر کھود رہی ہے۔ وہ اپنے گورکنوں کو خود پیدا کر رہی ہے۔"

" ہم پر یہ الزام ہے کہ ہم ذاتی ملکیت کو ختم کر دینا چاہتے ہیں، وہ ملکیت جسے انسان اپنی محنت سے حاصل کرتا ہے۔ آپ اس سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں لیکن آپ اس پر کیوں نہیں غور کرتے کہ آپ کے موجودہ سماج میں نوّے فی صد لوگ ذاتی ملکیت سے محروم کیے جا چکے ہیں اور دس فی صد انسان نوّے فی صد انسانوں کی محنت پر اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

" پرولتاری تحریک اکثریت کی ایک خود شناس اور آزاد تحریک ہے جس کے پیشِ نظر اکثریت کا مفاد ہے۔ پرولتاریہ اس وقت تک سربلند نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ موجودہ سماج کو مٹا نہ دے۔"

دُنیا بہت کم اپنے عہد کے بڑے لوگوں کا اس شان اور جوش و خروش سے استقبال کرتی ہے جس کے وہ صحیح معنی میں مستحق اور حق دار ہوتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کا ہندوستان میں انتقال ہوا تو ان کی زندگی میں ان کے مرتبے اور قدر و قیمت کا لوگ صحیح اندازہ نہیں لگا سکے حاجی امداد اللہ نے کام شروع کیا تو لوگ انھیں بھی نہ پہچان سکے۔ دُوسری طرف مغربی دُنیا تھی جس کی شاہیر پرستی اور قدر دانی مشہور ہے۔ لندن میں جب مارکس کا انتقال ہوا تو 'ٹائمز' کے علاوہ انگلستان کے کسی بھی اخبار نے اس کی موت کی خبر نہیں شائع کی اور ٹائمز نے بھی یہ خبر اپنے کسی مقامی نمایندے کے حوالے سے نہیں چھاپی تھی بلکہ اسے یہ خبر پیرس کے نمایندے نے بھیجی تھی اور اس نے اس خبر کے ساتھ جو مراسلہ بھیجا تھا اس میں لکھا تھا "میں نے یہ خبر پیرس کے بعض اخبارات میں پڑھی ہے۔"

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

اس رات کو ایک اندھیری گلی میں یہ واقعہ پیش آیا

اس کہانی کے منفی تاثر پر ادارہ معذرت خواہ نہیں ہے

کورنل وولرچ ★ شہزاد جمیل

وہ خوب صورت لڑکی جنرل اسٹور میں داخل ہوئی۔ اس نے ایک لمبا سا پیکٹ کاؤنٹر پر رکھا اور اس بات کا انتظار کرنے لگی کہ دکان دار اس کی طرف متوجہ ہو۔ دکان کے پاس سے گزرنے والے ایک راہگیر نے سر موڑ کر لڑکی کو دیکھا۔ اس کے دیکھنے کا انداز بھی سرسری تھا اور اس کی شخصیت بھی عام سی تھی۔ لڑکی بے حد خوب صورت اور پرکشش تھی۔ اس نے دکان دار کو ایک پرچی پر لکھی ہوئی چیزوں کے نام دھیمی آواز میں گنوانے شروع کیے۔ اس کی آواز اور انداز سے شرمیلا پن عیاں تھا۔ وہ شکل و صورت سے ایک کم عمر لڑکی نظر آتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دکان دار کو اپنا سبق سنا رہی ہو لیکن اس کے داہنے ہاتھ کی انگلی میں شادی کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ اس سے ظاہر تھا کہ اس کی عمر کم از کم اٹھارہ سال تو ضرور ہے۔

”آپ کہیں تو میں یہ سارا سامان آپ کے گھر پہنچوا دوں؟“ دکان دار نے پیش کش کی۔ ”سامان زیادہ ہے۔ آپ کے لیے تنہا اسے اٹھانا......“

”نہیں نہیں شکریہ۔ میں اٹھا لوں گی۔“ لڑکی نے دھیمی آواز میں کہا ”مجھے کوئی دقت نہیں ہوگی۔“

تھوڑی دیر بعد جب وہ دکان سے برآمد ہوئی تو اس کے دونوں ہاتھوں میں تلے اوپر بہت سارے پیکٹ تھے۔ وہ ایک جیکٹ پہنے ہوئے تھی۔ اس کا لباس سادہ اور کم قیمت نظر آ رہا تھا۔

وہ راہگیر ابھی زیادہ دور نہیں پہنچا تھا جو کچھ دیر پہلے اسے دیکھتا ہوا گزرا تھا۔ وہ کچھ دور جا کر ایک اخبار فروش کی دکان سے اخبار خرید رہا تھا۔ پھر وہ انتہائی سست رفتاری سے اخبار کی سرخیاں پڑھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اس نے ہاتھوں میں دستانے پہن رکھے تھے۔ چند لمحوں بعد لڑکی اس کے قریب سے گزر کے آگے بڑھ گئی۔ دونوں میں سے کسی نے بھی ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھا۔ دیکھنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ راہگیر اخبار کی سرخیاں دیکھنے میں مصروف تھا۔ لڑکی سر جھکائے اپنے خیالوں میں مست چلی جا رہی تھی۔ کچھ دور چل کر لڑکی ایک بیکری میں داخل ہو گئی۔ راہگیر اسی سست رفتاری سے بیکری کی طرف بڑھتا رہا۔ اس مرتبہ پھر اس نے دکان کے قریب سے گزرتے ہوئے اندر دیکھا۔ لڑکی کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ اس کے تمام پیکٹ کاؤنٹر پر رکھے ہوئے تھے اور وہ دکان دار سے ریزگاری لے کر پرس میں رکھ رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر ایک دکان کے شوکیس میں سجی ہوئی قمیصیں دیکھنے لگا۔ لڑکی ایک مرتبہ پھر اس کے قریب سے گزری۔ اب اس کے بنڈلوں میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ لڑکی دکان کے نزدیک سے گزرنے لگی تو شوکیس کے شیشے میں اس کا عکس ابھر آیا۔ راہگیر کی پشت لڑکی کی طرف تھی۔ وہ شیشے میں لڑکی کا عکس غور سے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ صرف ایک بار۔ ایک لمحے کے لیے۔ پھر وہ اپنا چہرہ دوسری طرف کر کے آگے بڑھ گئی۔ اب اس کی آنکھوں کے تاثرات بدل گئے تھے اور وہ کچھ چوکنا ہو گئی تھی۔ چند قدم چل کے وہ اچانک رک گئی کیونکہ شاید کوئی چیز خریدنا بھول گئی تھی۔ وہ واپس پلٹی۔ راہگیر کے قریب سے دوبارہ گزرتے وقت اس نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ چلتے چلتے وہ ایک بڑی عمارت کے اختتام تک پہنچی اور وہاں ایک بغلی گلی میں گھس کے نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

ٹھیک اسی وقت نہ جانے کہاں سے ایک اور آدمی نمودار ہوا۔ وہ دستانے والے راہگیر کے قریب تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ راہگیر نے نووارد کو دیکھتے ہوئے آنکھوں سے گلی کی طرف اشارہ کیا۔ نووارد سلیٹی رنگ کا ہیٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ راہگیر کا اشارہ پا کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اسی سمت میں چل دیا جہاں لڑکی گئی تھی۔ دستانوں والا راہگیر بھی اب تیز رفتاری سے چل رہا تھا مگر وہ اس گلی میں داخل نہیں ہوا جس میں لڑکی کا تعاقب کرنے والا نووارد گیا تھا۔ اس نے اپنے لیے اگلی گلی منتخب کی، یہ گلی پہلی گلی کے متوازی تھی۔

سلیٹی ہیٹ والا آدمی گلی میں داخل ہوا تو گلی سنسان پڑی تھی۔ لڑکی کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ معاً اس کی نظر ایک پیکٹ پر پڑی جو ایک بغلی گلی کے موڑ پہ گرا ہوا تھا۔ پیکٹ کھل چکا تھا اور ڈبل روٹی سڑک پر بکھر گئی تھی، آدمی نے پیکٹ دیکھ کر اپنی رفتار تیز کر دی اور خود بھی بغلی گلی میں مڑ گیا۔ یہ گلی بھی دور دور تک سنسان تھی۔ سیدھے ہاتھ پر کئی راستے نکل رہے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

تھے۔ وہ کچھ اور آگے بڑھا تو اس نے ایک دوسرا پیکٹ زمین پر پڑا دیکھا۔ اب وہ باقاعدہ دوڑنے لگا۔ گلی کے آخری سرے پر اسے ایک اور بڑا سا پیکٹ پڑا ہوا نظر آیا۔ اس پیکٹ میں سے دو خوب صورت ڈبے نکل کر اِدھر اُدھر لڑھک گئے تھے۔ دوسری طرف کھڑے ہوئے دو بچے ڈبے اُٹھانے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے۔ گلی کے آخری سرے پر پہنچتے ہی دستانے والے سے اس کی ملاقات ہوگئی جو دوسری سمت سے دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ انھوں نے ایک ثانیے کے لیے چاروں طرف دیکھا۔ اُنھیں ایک ہی سمت ایسی نظر آئی جس میں لڑکی بھاگتی ہوئی غائب ہوسکتی تھی وہ دونوں ایک ساتھ اُس سمت میں دوڑنے لگے۔ اس بار وہ پوری قوت سے بھاگ رہے تھے۔ نئی گلی کے خاتمے پر وہ اُلٹے ہاتھ کی گلی میں مُڑ گئے کچھ آگے ایک قریبی گلی میں لڑکی نظر آگئی۔ اس کے ہاتھ اب بالکل خالی تھے۔

اور وہ بڑی طرح دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ اُونچی ایڑی کے جوتے پہنے ہوئے تھی۔ اس کے باوجود اس کی رفتار بے حد تیز تھی۔ دونوں مردوں کے سانس پھول گئے تھے۔ وہ ایک اور گلی میں مُڑ گئے جس کی متوازی گلی میں لڑکی بھاگ رہی تھی۔ اس کا جیکٹ اور اسکرٹ ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ پھر ایک عمارت کے قریب پہنچ کے وہ اچانک غائب ہوگئی۔ دونوں آدمی تیزی سے اس کا تعاقب کر رہے تھے پھر بھی اُنھیں چند لمحوں کی دیر ہوگئی۔ اس لیے وہ اسے عمارت کے اندر داخل ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکے اور دوڑتے دوڑتے عمارت سے آگے نکل گئے۔ وہ گلی کے سرے پر پہنچ کر مُڑنا ہی چاہتے تھے کہ ایک عمر رسیدہ شخص نے اُنھیں ہاتھ کے اشارے سے روک لیا اور دھیمے لہجے میں کچھ بتانے لگا۔ عمر رسیدہ شخص نے اُنگلی سے اس عمارت کی طرف اشارہ کیا جس میں گھس کر لڑکی نگاہوں سے اوجھل ہوئی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ تینوں ایک دوسرے سے جُدا ہوگئے۔ ہیٹ والا آدمی ہیٹ نیچے کھسکا کر اسی جگہ کھڑا ہوگیا۔ دستانے والا آدمی تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا پبلک ٹیلی فون بوتھ کی طرف چلا گیا اور عمر رسیدہ شخص کسی اور طرف غائب ہوگیا۔

لڑکی اُسی عمارت کی دوسری منزل پر ایک دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور بُری طرح ہانپ رہی تھی۔ اس نے اپنی تیز تیز سانسوں کی آواز پر قابو پا لیا تھا۔ وہ دروازے کا اس طرح سہارا لیے کھڑی تھی جیسے اس کی ٹانگوں میں بالکل جان نہ ہو۔ سانسوں کی آمد و رفت میں توازن پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے ایک بار سر موڑ کے سیڑھیوں کی طرف دیکھا پھر دونوں ہاتھوں سے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ خاموشی سے کھلتا چلا گیا اور وہ ایک سائے کی طرح اندر داخل ہو کر غائب ہوگئی۔

یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں ہلکی قوت کا ایک پیلا بلب روشن تھا۔ ایک مرد نیلی قمیص پہنے ریوالور کی صفائی کر رہا تھا۔ لڑکی کی آمد پر وہ اپنا کام چھوڑ کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازہ اچھی طرح بند کر کے مزید حفاظت کے لیے پِن لگا دی۔ لڑکی ایک کرسی کا سہارا لیے گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ "پولیس ڈارلنگ پولیس — سادہ لباس والے — آج وہ مجھے پکڑ ہی لیتے۔"

مرد نے محبت سے لڑکی کو دیکھا اور سہارا دے کر اندر کے کمرے میں لے آیا۔ لڑکی کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس کے بازوؤں میں جھول گئی۔

"کیا تم اُنھیں پیچھے لگا کر یہاں لے آئیں؟" اس نے لڑکی کا رُخسار تھپ تھپاتے ہوئے نرمی سے پوچھا پھر ہاتھ بڑھا کر روشنی گُل کر دی۔ لڑکی اس کے پہلو سے علیحدہ ہوگئی۔ مرد نے تشویش کی نظر سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ کھڑکی پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ مرد کھڑکی کی طرف جانے کے بجائے مخالف دیوار کے پاس گیا اور دیوار سے چپک کر آہستہ آہستہ کھڑکی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے پردوں کے درمیان ایک درز کے ذریعے دیکھا کہ گلی کے بلب کی روشنی کمرے کی ایک دیوار پر پڑ رہی ہے۔ مرد نے پردے چھوئے نہیں اور اپنا چہرہ پردوں سے اتنا قریب نہیں کیا کہ سانس لینے سے ان میں ذرا بھی جنبش ہو۔ اس کا نام چیمپ لین تھا۔ وہ اندھیرے میں پشت کی طرف سے بالکل ایک بچہ نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک دُبلا پتلا اکہرے جسم کا پستہ قد آدمی تھا۔ اس کی نقل و حرکت میں بلّیوں جیسی خاموشی اور چیتوں جیسی پھرتی تھی۔ پچھلے چند ہفتوں سے پورے امریکہ کی پولیس اس کی تلاش میں سرگرداں تھی۔

"میں اُنھیں مغالطہ دینے میں کامیاب ہوگئی ڈارلنگ!" لڑکی نے آہستہ سے خوشی کے لہجے میں کہا۔ "مجھے دوڑ لگانی پڑی۔ اگر میں دوڑ نہ لگاتی تو وہ ضرور مجھے پکڑ لیتے۔ میں نے اُنھیں بھٹکا دیا۔"

چیمپ لین خاموشی سے پردوں کے ذریعے باہر دیکھتا رہا۔

لڑکی نے دیوار میں بنی ہوئی الماری کھولی اور اس کی اوٹ لے کر ایک سگریٹ جلائی۔ چند گہرے کش لینے کے بعد اس نے سگریٹ کا جلتا ہوا سِرا ہتھیلی میں چھپا لیا اور بولی۔ "بے تحاشا دوڑنے کے باعث سامان بھی گر گیا۔" لڑکی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں ایک چیز بھی نہیں بچا سکی اور اب اُن دکانوں پر دوبارہ جا بھی نہیں سکتی۔ وہ میری جیکٹ دیکھ کے مجھے پہچان لیں گے میرے پاس ایک ہی تو جیکٹ ہے۔" لڑکی فرش پر ٹہلتے ٹہلتے رُک گئی اور کان لگا کر سوگوار موسیقی کی دھیمی آواز سُننے لگی یہ آواز اُوپر کی منزل سے آ رہی تھی۔ "وہاں کسی کا انتقال ہوگیا تھا۔ یہ لوگ اب تک لاش لے کر نہیں گئے؟" لڑکی نے تُرش لہجے میں کہا۔ "یہ کرب ناک موسیقی مجھے پاگل کر دے گی چیمپ! مرنے والے آدمی کا صحیح مقام قبرستان ہوتا ہے۔ اسے اتنی دیر گھر میں رکھ کے سوگ منانے سے کیا فائدہ؟"

چیمپ لین نے کوئی تبصرہ نہیں کیا بلکہ خاموشی سے باہر کا جائزہ لیتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے اس اثنا میں ایک بار بھی سانس نہ لیا ہو۔ "تو تم اُنھیں مغالطہ دینے میں کامیاب ہوگئیں؟" چیمپ لین نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں تلخی تھی لیکن محبت آمیز تلخی۔ لڑکی ٹہلتے ٹہلتے رُک گئی۔ وہ دبے پاؤں چیمپ لین کے پاس آئی۔ سگریٹ کا سرا اب بھی اُس کی ہتھیلی میں چھپا ہوا تھا۔ وہ مرد کے بازو میں کھڑی ہوئی اور جھانک کر پردوں سے باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

گلی میں عمارت کی مخالف سمت میں تین آدمی قریب قریب کھڑے ہوئے صلاح و مشورہ کر رہے تھے پھر جلد ہی وہ تینوں علیحدہ ہوگئے اور کچھ فاصلہ دے کر سامنے کے مکانات کے پاس تاریکی میں کھڑے ہوگئے۔ کسی مکان کا دروازہ نہیں کھلا۔ آس پاس کی دیواروں کے ساتھ باوردی اور مسلح سپاہی بھی چپکے ہوئے تھے۔ "مطلع ابر آلود ہے" چیمپ لین نے نرمی سے لڑکی کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

لڑکی نے اس کی آستین پکڑ کر کھینچی۔ "ابھی وقت ہے ڈارلنگ! بھاگ نکلو کھلی فضا میں چلو یہ تو چوہے دان ہے۔ یہاں ہم بُری طرح پھنس جائیں گے۔"

"بہت دیر ہوگئی ہے پگلی! ریاست کولمبیا کا ہر پولیس والا اسی علاقے میں موجود ہوگا۔"

انھوں نے دیکھا کہ ایک مرد اور ایک عورت باہوں میں باہیں ڈالے گلی میں داخل ہوئے۔ کسی طرف سے اچانک ایک سایہ نمودار ہوا اور چند قدم اس جوڑے کے ساتھ چلتا رہا پھر ان سے علیحدہ ہو کر دوبارہ تاریکی میں مدغم ہوگیا۔ جوڑا مڑا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا واپس اسی طرف چلا گیا جہاں سے آیا تھا۔ عورت اور مرد دونوں بار بار سر موڑ کر پیچھے دیکھتے جا رہے تھے۔

"ناکا بندی ہو رہی ہے؟" مرد نے کہا۔

"بغلی دروازہ!" لڑکی نے کہا۔ "ڈارلنگ! ہم بغلی دروازے سے بھاگ سکتے ہیں۔"

"تم پولیس کو اتنا بے وقوف کیوں سمجھتی ہو جان؟ یقین کرو وہ ایک فرلانگ تک ہر گلی میں اور ہر بلڈنگ کے چاروں طرف موجود ہوں گے۔" اچانک وہ کھڑکی سے ہٹ کر پیچھے آگیا۔ تاریکی میں اس کی نیلی قمیص کالی ہو کر نظروں سے غائب ہوگئی۔ "یہ لوگ مجھے زندہ تو ہرگز نہیں پکڑ سکتے۔"

اس نے پُرعزم اور پُرسکون لہجے میں کہا۔

کمرے میں سکوت طاری ہوگیا۔ اُوپر کی سوگوار اور دھیمی موسیقی لڑکی کے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگی۔ چیمپ لین نے سر اُٹھا کر چھت کی طرف دیکھا اور پھر مزاح کے لہجے میں بولا۔ "محترم مُردے صاحب! اب آپ ایک طرف ہٹ کر جگہ خالی کر دیجیے، دو مُردے اور آنے والے ہیں۔"

لڑکی نے ایک گہری سانس لی اور اس طرح ایک سسکاری بھری جیسے آلو کاٹتے ہوئے اس کی اُنگلی کٹ گئی ہو۔ گلی کے مکانات کی روشنیاں گُل ہونے لگیں۔ چیمپ لین پردے کے قریب آکر باہر دیکھنے لگا۔ ایک تاریک مکان سے کوئی عورت طوطے کا پنجرا اُٹھائے باہر نکلی۔ اُس کے پیچھے ایک باوردی سپاہی تھا۔ اس نے عورت کو مکان سے باہر نکال کر دروازہ بند کر دیا۔ عورت تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی پنجرا سنبھالے گلی سے نکلی اور نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

"جان! اب ایک مار دھاڑ سے بھرپور فلم شروع ہونے والی ہے، دیکھو گی؟" چیمپ لین نے پھر مزاحیہ انداز میں لڑکی کو مخاطب کیا۔ اُوپر کے فلیٹ میں اطلاعی گھنٹی بجنے کی دھیمی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں بعد سوگوار موسیقی کی آواز اچانک درمیان میں ٹوٹ گئی۔ وہ دونوں کان لگا کر اُوپر کی آوازیں سُننے لگے پھر چند لمحوں بعد اُنھیں بہت سے قدموں کی دھمک سنائی دینے لگی۔ "ذرا جھانک کے تو دیکھو۔ کیا پولیس والے یہ عمارت خالی کروا رہے ہیں؟" چیمپ لین نے لڑکی سے کہا۔ لڑکی دبے پاؤں دروازے کی طرف گئی۔ اس نے آہستگی سے دروازہ کھول کے جھری پیدا کی اور ایک آنکھ لگا کر باہر جھانکنے لگی۔ پھر اس نے بڑی احتیاط سے دروازہ پہلے کی طرح مضبوطی سے بند کر دیا اور واپس آگئی۔ "ہاں — سب نیچے جا رہے ہیں۔"

اچانک لاؤڈ اسپیکر کی تیز آواز گونجی۔ "سب لوگ باہر آجائیں۔ یہ پولیس کا حکم ہے۔ تمام عمارتوں میں رہنے والوں سے التماس ہے کہ وہ

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

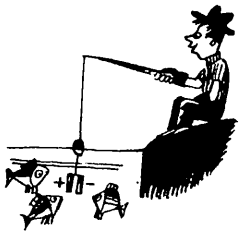

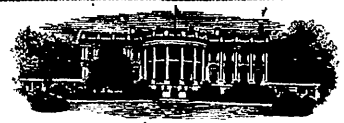

امریکہ کا گورا صدر جیفرسن رنگ و نسل کے امتیاز کا سخت مُخالف تھا۔ ایک بار وہ اپنے پوتے کے ساتھ گھوڑے پر کہیں جا رہا تھا۔ ایک طرف سے اچانک کوئی حبشی نمودار ہوا اور اس نے صدر کو دیکھ کر احتراماً ٹوپی اتاری۔ خوش اخلاق اور فراخ دل صدر نے بھی اپنا ہیٹ ہاتھ میں لے کر حبشی کے سلام کا جواب دیا لیکن صدر کا پوتا اپنے دادا کے اس رویے سے خوش نہیں ہوا۔ اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

جیفرسن نے پوتے سے پوچھا "تم نے حبشی کو سلام کا جواب کیوں نہیں دیا؟"

پوتے نے نفرت سے جواب دیا "وہ کالا کمتر انسان کس طرح ہماری برابری کر سکتا ہے؟"

جیفرسن نے کہا "وہ کالا ہونے کے باوجود خوش اخلاقی میں تم سے سبقت لے گیا ہے اور یہ بات میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے کہ ایک حبشی خوش اخلاقی کے مقابلے میں تمھیں شکست دے دے۔"

کسی تاخیر کے بغیر گلی میں آ جائیں، یہ پولیس کا حکم ہے، قانون سے تعاون کرنا آپ کا فرض ہے، آپ سے درخواست ہے کہ آپ باہر آ جائیں۔"

"پولیس سارا علاقہ خالی کرا رہی ہے۔" لڑکی نے کہا۔

"ہاں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے حملے کا آغاز گیس سے کریں گے۔" مرد نے کہا۔

"جیمپ، جیمپ!" لڑکی نے التجا کرتے ہوئے کہا "یہاں سے بھاگ چلو ڈارلنگ! کچھ کرو، اپنے اسلحہ کے ذخیرے پر بھروسا مت کرو جان! تمھارا مقابلہ چند لوگوں سے نہیں، پوری حکومت سے ہے، تم اسلحہ کے بل بوتے پر کب تک مقابلہ کرو گے؟ سارے مکانات خالی ہو گئے تو ہم بھاگ بھی نہیں سکیں گے۔" مرد نے آہستگی سے لڑکی کی پشت سہلائی۔

سیڑھیوں پر نیچے جانے والوں کی آہٹیں گونج رہی تھیں، اترنے والے بہت عجلت میں تھے۔ پولیس کا لاؤڈ اسپیکر چیخ چیخ کر لوگوں کو باہر آنے کا حکم دے رہا تھا۔ جیمپلین کی کم عمر بیوی بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ چند لمحوں بعد وہ واپس اندر آئی۔ جیمپ کھڑکی کے قریب جھکا ہوا گلی کا منظر دیکھ رہا تھا۔ قریبی عمارتوں سے لوگ باہر نکل رہے تھے، دروازوں پر کھڑے ہوئے پولیس والے انھیں ہاتھ کے اشاروں سے مختلف سمتوں میں جانے کی ہدایت کر رہے تھے۔ لڑکی نے کہا "جیمپ ڈارلنگ! اوپر کی منزل خالی ہو چکی ہے، چلو چھت پر چلو۔"

"کیا تم انھیں بالکل گدھا سمجھتی ہو۔" مرد نے پُرسکون آواز میں باہر جھانکتے ہوئے کہا۔

"مگر اس چوہے دان میں مرنے سے کیا فائدہ؟ مرنا ہی ہے تو ہم ہال میں ان کا مقابلہ کرتے ہوئے کیوں نہ مریں؟ اوپر کی سیڑھیاں بالکل خالی ہیں، ہم اوپر چڑھ جاتے ہیں۔ اگر ضرورت پڑی تو واپس آ جائیں گے۔ یہاں سے تو نکلو ڈیئر!" لڑکی مرد کا بازو پکڑ کر گھسیٹنے لگی۔

"اچھا۔" جیمپ نے پلٹ کر کہا "تم اوپر پہنچ کے پوزیشن سنبھالو۔ میں یہاں سے کارروائی شروع کرتا ہوں۔ جلد ہی تمھارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ سب سے پہلے میں اُس سادہ لباس والے کو نشانہ بناتا ہوں، دیکھو۔" اُس نے برساتی پہنے ہوئے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا۔

لڑکی نے شوہر کے شانے سے اچک کر کھڑکی کے پردوں سے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ اسے برساتی والا شخص نظر آ گیا۔ وہ کھڑکی کے سامنے ایک مکان کے دروازے کے پاس تاریکی میں چھپا کھڑا تھا اور ایک ہاتھ سے کسی کو اشارہ کر رہا تھا۔ جیمپلین نے نہ تو کھڑکی کے پردے ہٹائے نہ چوکھٹ کا سہارا لیا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا جس سے وہ برساتی والے سادہ پوش کا نشانہ لے رہا تھا "اپنی آنکھیں بچاؤ جان!" اس نے لڑکی سے کہا۔ لڑکی نے بے اختیار اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ ریوالور کی نال سے ایک شعلہ نکلا جس نے ان دونوں کے چہرے منوّر کر دیے۔ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا اور اس کے ٹکڑے بارش کے قطروں کی طرح باہر گرنے لگے۔ پردہ ایک مرتبہ زور سے ہلا۔ اب اس میں ایک گول سوراخ صاف نظر آ رہا تھا۔ برساتی والا سادہ پوش سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا گلی میں گرا اور غیر فطری انداز میں بے حس و حرکت ہو گیا۔

دوسرے ہی لمحے گلی میں تیز روشنی والی تتلیاں برق رفتاری سے اُڑنے لگیں۔ چاروں طرف سے لمبی لکیروں والے شعلے جیمپ کی کھڑکی کی طرف لپکنے لگے۔ چند ثانیوں میں کھڑکی کے شیشے کا ایک ٹکڑا بھی باقی نہیں رہا۔ جیمپ اچھل کر پیچھے ہٹا۔ دوسرے ہی لمحے وہ کمرے کے فرش پر اوندھا لیٹا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ لڑکی نے اس کی تقلید کی۔ کھڑکی کے پردے بہت زور سے پھڑپھڑا رہے تھے ان میں بڑی تیزی سے سوراخ نمودار ہوتے جا رہے تھے۔ صرف چند لمحوں میں پردوں کی جگہ چیتھڑے جھولنے لگے۔

اچانک کہیں سے سرچ لائٹ کی روشنی ابھری اور کمرہ بقعۂ نور ہو گیا۔

وہ دونوں اوندھے منہ فرش سے چپکے ہوئے تھے اور سانپ کی طرح کمرے سے باہر نکل رہے تھے۔ لڑکی آگے تھی۔ جیمپلین نے رُک کر چہرہ موڑا اور چند لمحوں تک کھڑکی سے باہر روشنی کی دھار دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنا سر فرش سے فوراً اونچا کر کے ریوالور والا ہاتھ بلند کیا اور روشنی کی دھار پر گولی چلائی۔ ایک زبردست چھناکے کی آواز آئی اور اچانک تاریکی چھا گئی۔ سرچ لائٹ کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا۔ تیز روشنی کے بعد اچانک تاریکی چھا جانے کے باعث وہ خود بھی ایک منٹ تک اندھے بنے رہے۔ جیمپلین نے ٹٹول کر لڑکی کی سڈول پنڈلیاں پکڑ لیں اور ان کے سہارے آگے بڑھنے لگا "جلدی کرو۔ ابھی ہمارے پاس کچھ وقت ہے۔" اس نے کہا "پولیس کو یہ نہیں معلوم کہ میں تنہا ہوں ورنہ وہ لوگ اب تک عمارت میں گھس کر حملہ کر چکے ہوتے۔"

فلیٹ سے باہر نکل کر وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔ اس نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا اور راہداری سے گزرتا ہوا سیڑھیوں پر پہنچ گیا۔ سیڑھیوں سے جھانک کر اس نے نیچے دیکھا۔ تاریکی میں کچھ سائے متحرک نظر آ رہے تھے۔ سیڑھیوں پر رُک کر اس نے ریوالور سے یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلائیں۔ گولیوں کا جواب فوراً ٹامی گن سے دیا گیا۔ بے شمار نارنجی رنگ کے شعلے اندھیرے میں نیچے سے اوپر لپکے۔ جیمپلین گولیاں چلاتا ہوا لڑکی کا ہاتھ پکڑے چوتھی منزل پر پہنچ گیا۔ یہاں ایک کمرے میں میز پر کھانا چنا ہوا تھا اور ریڈیو سے موسیقی نشر ہو رہی تھی۔ فلیٹ کے رہنے والے بڑی عجلت میں بھاگے تھے۔ پوری عمارت خالی تھی۔ چھت کا دروازہ بند تھا۔ اس نے لڑکی کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا اور دائیں کاندھے سے دروازہ اُکھاڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک چھت سے گولیاں چلنی شروع ہو گئیں۔ جیمپلین پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا "معلوم ہوتا ہے اس عمارت پر پوری ایک بریگیڈ فوج لگا دی گئی ہے۔" اس نے کہا اور لڑکی کا ہاتھ پکڑے تیسری منزل پر آ گیا۔ عمارت اب بھی خالی تھی، نیچے پولیس والے ٹامی گن سے بدستور گولیاں برسا رہے تھے۔ وہ اُس فلیٹ کے سامنے سے گزرے جس میں ریڈیو بج رہا تھا اور جس کے کھلے دروازے سے کچھ روشنی راہداری میں آ رہی تھی۔ لڑکی کی نظر جیمپلین کے ایک بازو پر پڑی۔ وہ چونک گئی "اوہ۔ تم زخمی ہو جیمپ۔ تمھارے شانے میں گولی لگ گئی ہے۔" لڑکی نے تشویش کے لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں، ایک گولی لگی ہے کوئی خاص بات نہیں ہے۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ گولی چھت کا دروازہ توڑتے وقت اس کے بازو میں لگی تھی۔ لڑکی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے فلیٹ میں لے گئی۔ کھانے کی میز پر نیپکن رکھے ہوئے تھے اس نے ایک نیپکن اٹھایا۔ جیمپلین نے نیپکن اس کے ہاتھ سے چھین کر خود بازو میں باندھ لیا۔

"جیمپ ڈیئر! میں تمھیں تنہا نہیں چھوڑوں گی تم زخمی ہو۔"

"تم وہی کرو گی جو میں تم سے کہوں گا۔" اس نے کہا "یہ معمولی زخم

ہے۔ ذرا سا خون نکلا ہے۔" اس نے آہستگی سے لڑکی کو پرے ہٹا دیا "تمھیں معلوم ہے میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں؟"

لڑکی خوف زدہ سی ہو گئی "میں جانتی ہوں۔"

"تو غور سے سنو کہ تمھیں اب کیا کرنا ہے۔" جیمپلین جلدی جلدی اسے کچھ سمجھانے لگا "اور تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے جان!" اس نے بات ختم کرتے ہوئے کہا "جیسے ہی موقع ملے تم میرے دوست ایڈی سے رابطہ قائم کرنا۔ میں تمھارے لیے اسے ایک پیغام دے دوں گا۔ عجلت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بہت ہوشیاری اور صبر سے کام لینا۔ اب تم جاؤ۔" اس نے فرطِ جذبات میں لڑکی کو بھینچ لیا اور الوداعی بوسہ لے کے اسے سیڑھیوں کی طرف بڑھا دیا۔ لڑکی کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ جانا نہیں چاہتی ہے مگر جیمپ کا حکم ٹالنا اُس کے بس میں نہیں تھا۔

لڑکی خوف زدہ انداز میں پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہوئی سیڑھیوں سے اُترنے لگی۔ جیمپلین عمارت میں کسی جگہ سے بے تحاشا گولیاں چلا رہا تھا۔ پولیس کی طرف سے بھی برابر جواب دیا جا رہا تھا۔ عمارت اچانک آنسو گیس کے بم پھٹنے سے لرزنے لگی۔ گیس دوسری منزل پر تیزی سے پھیلنے لگی۔ لڑکی جب عمارت سے باہر نکلی تو اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں چھپا رکھی تھیں۔ پولیس نے فوراً اُسے گھیر لیا۔ وہ پولیس والوں کے نرغے میں ایک چھوٹی سی بچی نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ممکن ہے اس کی وجہ آنسو گیس ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جیمپ سے جدا ہونے پر رو رہی ہو۔ "جیمپلین کہاں ہے؟" پولیس والے چلا چلا کر اس سے پوچھ رہے تھے۔

"وہ پہلے ہی نکل گیا تھا۔" لڑکی نے جواب دیا "عمارت خالی ہوتے وقت وہ دوسروں کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ شاید تم لوگ اسے پہچانتے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

نہیں تھے ورنہ وہ اس طرح آسانی سے نہیں نکل سکتا تھا۔ میں اندر رک گئی تھی تم لوگ مجھے دیکھ چکے تھے۔ ورنہ میں بھی چلی جاتی۔"

پولیس نے فائرنگ فوراً بند کر دی اور کئی درجن مسلح سپاہی عمارت میں گھس گئے۔ جیمپ کے فلیٹ میں انھیں اسلحہ اور بارود کے سوا کچھ نہیں ملا۔

"نکل گیا" ایک پولیس افسر نے تاسف سے کہا۔

"میں نے کہا تھا کہ عمارت سے باہر آنے والوں کی خوب اچھی طرح جانچ کی جائے" ایک بڑا افسر غصے میں چلایا۔

"بلڈنگ کے تمام لوگ یہیں موجود ہیں جناب!" ایک ماتحت نے جواب دیا۔ "سب کی اچھی طرح جانچ کی گئی تھی۔ البتہ جو لوگ جنازے میں شریک ہونے آئے تھے اور ایک دعوت میں مہمان تھے۔ صرف انھیں جانے کی اجازت دی گئی تھی۔ پتہ نہیں، جیمپ لین کس طرح اُن میں شامل ہو گیا؟"

"تمھیں کسی کو جانے کی اجازت نہیں دینی چاہیے تھی!"

"لیکن جناب ہم فائرنگ سے یہ سمجھے تھے کہ وہ اپنے فلیٹ میں موجود ہے"، ماتحت نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "عمارت خالی ہونے کے بعد ہی اس نے گولی چلا کر سرچ لائٹ بے کار کی تھی اور اس کے بعد بھی اس نے گولیاں چلائی تھیں۔"

عمارت کی اچھی طرح تلاشی لی گئی لیکن جیمپ لین کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر گرفتاری سے بال بال بچ گیا تھا لیکن اس بار اس کی بیوی پولیس کے ہاتھ آ گئی تھی۔ بلڈنگ کے لوگوں کو دوبارہ فلیٹوں میں جانے کی اجازت دے دی گئی۔ لڑکی کو پولیس ہیڈ کوارٹر لے آئی۔ ساری رات اس سے سوالات ہوتے رہے اور دوسرے دن سورج چڑھنے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

لڑکی نے پولیس کو بتایا کہ "جیمپ لین سے میری شادی تین ہفتے قبل ہوئی تھی۔ شادی سے پہلے مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ میرا ہونے والا شوہر جرائم پیشہ شخص ہے اور پولیس اسے تلاش کر رہی ہے۔ بے شک میں نے جیمپ لین نامی مجرم کے متعلق اخبار میں پڑھا تھا لیکن میں ناموں کی یہ مشابہت محض ایک اتفاق سمجھی تھی کیونکہ لین ایک عام سا نام ہے، ویسے پچھلے تین ہفتوں میں میرے شوہر نے کوئی مجرمانہ کام نہیں کیا۔"

"اگر تمھیں جیمپ لین کے ماضی کا علم نہیں تھا تو کل شام تم سادہ لباس والوں کو اپنے تعاقب میں دیکھ کر بھاگی کیوں تھیں؟" پولیس والوں نے پوچھا۔

"کل شام تک مجھے اپنے شوہر کے ماضی کا علم ہو چکا تھا۔ میں نے پرسوں باورچی خانے میں پوشیدہ ہتھیار دیکھ لیے تھے۔ مجھے یہ جان کر بے حد صدمہ ہوا تھا کہ میں ایک بدنام اور خطرناک مجرم کی بیوی ہوں۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ موقع پاتے ہی اس سے علیحدگی اختیار کر لوں گی۔ کل شام پولیس سے میں صرف اس لیے بچنا چاہتی تھی کہ اگر پولیس نے مجھے گرفتار کر کے مجھ سے میرے شوہر کا پتہ معلوم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تو وہ یہ سمجھے گا کہ میں نے اس سے غداری کی ہے۔ اس طرح میری زندگی خطرے میں پڑ جاتی کیونکہ جیمپ کسی کو معاف کرنے کا عادی نہیں ہے۔"

پولیس کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے وہ بہت پُرسکون تھی جیسے اس کا ضمیر مطمئن ہو اور دامن بالکل صاف ہو مگر رات گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے سکون اور خود اعتمادی میں کمی آنے لگی۔ شاید یہ کیفیت غیر معمولی حالات برداشت کرنے کا نتیجہ تھی۔ وہ ساری رات ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوئی تھی۔ سورج نکلنے کے بعد وہ بڑی بے قرار نظر آنے لگی اور ساڑھے سات بجے تو واضح طور پر نروس نظر آ رہی تھی۔ پھر ساڑھے آٹھ بجے اس کی حالت ایسی ہو گئی کہ وہ پولیس کے سوالات سمجھنے تک کے قابل نہیں رہی۔ لیفٹیننٹ نے لڑکی کے لیے کافی لانے کا حکم دیا۔ اس کا خیال تھا کہ کافی لڑکی کے اعصاب پُرسکون کر دے گی مگر اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔

پولیس ہیڈ کوارٹر کے باہر شہری زندگی معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔ لڑکی کے کانوں میں ٹریفک کی آوازیں آنے لگی تھیں، اس کے اضطراب میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ "پلیز۔۔۔ پلیز مجھے جانے دیجیے۔ میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ میں بے گناہ ہوں۔ میں یہ سب کچھ زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے نہیں معلوم کہ جیمپ کہاں گیا ہے۔ مجھے جانے دیجیے۔" لڑکی نے التجا کرتے ہوئے کہا۔ وہ بے حد مضطرب نظر آ رہی تھی اور اپنا رومال انگلیوں سے مروڑتے ہوئے بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اگر پولیس نے اسے کچھ دیر اور روکے رکھا تو وہ ہذیان کی مریضہ کی طرح چیخنے چلانے لگے گی۔

بہت دیر تک مشورے کرنے کے بعد پولیس نے لڑکی کو جانے کی اجازت دے دی۔ اسے تاکید کر دی گئی کہ وہ یہ شہر چھوڑنے کی کوشش نہ کرے کیونکہ پولیس کسی بھی وقت اسے مزید تفتیش کے لیے طلب کر سکتی ہے، اگر اس نے شہر چھوڑا تو اسے مفرور مجرم قرار دے دیا جائے گا۔ لڑکی نے پولیس ہیڈ کوارٹر کی سیڑھیاں ایسی عجلت اور تیزی سے طے کیں جیسے بدروحیں اس کا تعاقب کر رہی ہوں۔ اتنا تو وہ سمجھ گئی تھی کہ اسے چھوڑنے سے پولیس کا مقصد یہ ہے کہ وہ خفیہ طور پر اس کا تعاقب

سینٹری ٹاول قابلِ اعتماد ہوتے ہیں

موڈیس® زیادہ آرام دیتے ہیں

گھر کے فرسودہ پرانے کپڑوں وغیرہ کا استعمال ذاتی صحت وصفائی کے لئے بے آرام اور غیر محفوظ ہے۔ کسی بھی فیکٹری کے بنے ہوئے سینٹری ٹاول آرام دے سکتے ہیں لیکن موڈیس سینٹری ٹاول سب سے زیادہ آرام دہ طریقہ ہے۔ کیونکہ ان میں انتہائی نرم وملائم، جاذب روئی کی تین تہیں رکھی گئی ہیں، جو زیادہ سے زیادہ آرام و آسائش کا باعث ہیں۔ ان کے علاوہ مکمل حفاظت کے لئے نمی سے محفوظ رہنے والی تہہ بھی ہے۔ موڈیس خاص غلاف کے چھوٹے سوراخوں کے ذریعہ رطوبت کو بہت جلد جذب کر لیتا ہے۔

خواتین کے ذاتی حفظانِ صحت، آرام و اعتماد کے لئے موڈیس ہی بہتر سے بہتر ہے۔

Johnson & Johnson
PAKISTAN LIMITED

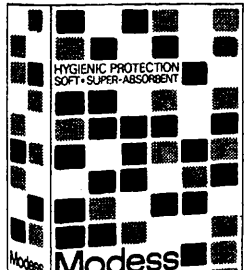

تمام خواتین کی پسند موڈیس

J&J-1-73 ASIATIC

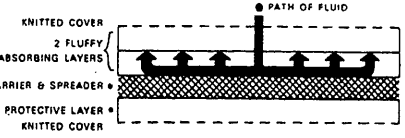

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

کر کے جیمپ لین تک پہنچ جائے۔ اس لیے وہ پولیس ہیڈکوارٹر سے نکل کر بہت محتاط ہو گئی۔ اسے جیمپ لین کی ہدایت بھی یاد تھی۔ وہ جلدی میں ہونے کے باوجود بے حد احتیاط سے چل رہی تھی۔ بہت دیر تک وہ بے مقصد اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔ راہگیروں کے ہجوم میں غائب ہونا۔ بڑی بڑی دکانوں میں گھس کر نقلی دروازوں سے باہر نکلنا۔ غیر متوقع طور پر اچانک چلتی بس میں چڑھ جانا اور پھر اچانک کسی اسٹاپ پر اُتر جانا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا تعاقب کرنے والا ان حرکتوں کی وجہ سے اسے کھو دے۔

اس نے ایک ہوٹل میں لگے ہوئے پبلک بوتھ سے ایڈی کو ٹیلیفون کیا اور جلدی سے اپنا تعارف کرانے کے بعد پوچھا "میرے لیے کیا پیغام ہے ایڈی؟ وہ ٹھیک تو ہے نا؟ وہ ہے کہاں؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔" ایڈی نے جواب دیا۔ "اس نے مجھ سے رابطہ ہی قائم نہیں کیا۔"

"لیکن۔۔۔ لیکن اس نے تو کہا تھا کہ وہ تم سے ضرور رابطہ قائم کرے گا۔" لڑکی کی آواز میں اچانک خوف کا عنصر جھلکنے لگا اور اس نے ریسیور پر گرفت مضبوط کر لی۔

ایڈی نے کہا "تو میرے پاس آنے کی کوشش نہ کرنا۔ کچھ دیر بعد مجھے دوبارہ فون کرنا۔ اس دوران میں اگر جیمپ نے مجھ سے رابطہ قائم کر لیا تو میں۔۔۔۔۔۔"

"لیکن ایڈی! ضرور کوئی گڑبڑ ہے معلوم۔۔۔" دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ "اوہ میرے خدا! جیمپ! جیمپ!" لڑکی نے ریسیور لٹکاتے ہوئے دہشت زدہ آواز میں کہا۔ "اس کا بازو زخمی ہو گیا تھا۔ نہیں نہیں۔۔۔"

جب وہ ہوٹل سے باہر نکلی تو اس کی حالت پاگلوں جیسی تھی۔ اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیل گئی تھیں اور منہ کھلا ہوا تھا۔ وہ یہ بات بالکل فراموش کر بیٹھی کہ خفیہ پولیس کا کوئی شخص اس کے تعاقب میں ہو سکتا ہے۔ وہ تمام احتیاطی تدبیریں بھی بھول گئی۔ وہ جیمپ لین اور اس کے زخمی بازو کے سوا ہر چیز بھول گئی۔ اس کے تصور میں صرف وہ خون تھا جو جیمپ کے زخم سے بہہ رہا ہو گا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جیمپ اس وقت کہیں بے ہوش پڑا ہو گا۔ ممکن ہے اب تک مر چکا ہو۔ اس کی آنکھ ڈبڈبا گئیں۔ اس نے پاگلوں کی طرح ہاتھ ہلا کر ایک ٹیکسی روکی اور جلدی سے پچھلی نشست پر گر پڑی۔ اس نے ڈرائیور کو اُس عمارت کا پتہ بتایا جسے کل رات پولیس نے گھیرا تھا۔

ٹیکسی عمارت کے سامنے رُکی۔ لڑکی نے ڈرائیور کو انتظار کرنے کی ہدایت کی اور تیزی سے اُتر گئی۔ عمارت کا منتظم جھاڑو سے شیشوں کی کرچیاں ایک جگہ جمع کر رہا تھا۔ وہ اس کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ منتظم نے سَر اُٹھا کر ایک بار اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار اُبھرے اور وہ سَر جھکا کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ "میں اپنا سامان لینے آئی ہوں۔" لڑکی نے کہا۔ وہ ٹکٹکی باندھے منتظم کو دیکھ رہی تھی۔ منتظم نے لڑکی کی بات سُنی ان سُنی کر دی۔ لڑکی نے پھر اپنا جملہ دُہرایا۔

اس بار منتظم نے سَر اُٹھائے بغیر جھلّا کر کہا "جتنی جلد ہو سکے اپنا سامان لے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

لڑکی نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر چند لمحوں تک منتظم کو دیکھتی رہی پھر اس نے نظریں اُٹھا کر دوسری منزل پر اپنے فلیٹ کی طرف دیکھا۔ وہاں سے اس کی نظریں تیسری منزل پر چلی گئیں جہاں کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ "جنازہ کس وقت اُٹھایا جائے گا؟" اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"تمھیں اس سے کیا؟" منتظم نے تلخ لہجے میں کہا اور سَر اُٹھا کر لڑکی کو دیکھا۔ "تم نے اور تمھارے بدمعاش شوہر نے کل رات میت کی بڑی بے حرمتی کی ہے۔" وہ سَر جھکا کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ "تدفین والی گاڑی صبح آٹھ بجے آئی تھی۔ اب تک مُردہ دفن کیا جا چکا ہو گا۔"

لڑکی پر چند ثانیوں تک سکتے کی کیفیت طاری رہی پھر وہ بے تحاشا بھاگتی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ "قبرستان چلو۔ قبرستان۔" لڑکی نے ہذیانی انداز میں چلّا کر ڈرائیور سے کہا۔ ڈرائیور نے لڑکی کی حالت دیکھی تو گھبرا کر جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کی اور تیزی سے قبرستان کی طرف چل دیا۔ گلی کا موڑ مڑتے ہی لڑکی کی نظر ایک اور ٹیکسی پر پڑی۔ اس میں تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ لڑکی کھڑکی سے باہر سَر نکال کر زور سے چیخی۔ "میرے پیچھے آؤ۔۔۔ خدا کے لیے دیر مت کرو۔" ٹیکسی تیزی سے آگے نکل گئی۔ لڑکی نے سر اندر کھینچ لیا اور پیچھے دیکھتے ہوئے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر پچھلی گاڑی کو تعاقب میں آنے کا اشارہ کرنے لگی۔ پچھلی گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔

"خاتون! آپ ٹھیک سے بیٹھیے ورنہ میں آپ کو گاڑی سے اُتار دوں گا۔" ٹیکسی ڈرائیور نے لڑکی کی دیوانگی سے تنگ آ کر دھمکی دی۔

چند لمحوں بعد ایک پولیس والا تیزی سے موٹر سائیکل پر ٹیکسی کے قریب سے آگے نکل گیا۔ اس نے ٹیکسی روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ٹیکسی کے آگے راستہ بناتا ہوا چلنے لگا۔ نواحی علاقے میں پہنچتے ہی وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا؟ ٹیکسی ایک جھٹکے سے قبرستان کے دروازے پر رُکی لڑکی رُکنے سے پہلے ہی دروازہ کھول کے تیر کی طرح قبرستان میں بھاگی۔ چند قدم کے فاصلے پر اسے ایک سوگوار مجمع نظر آیا۔ لوگ تدفین کے بعد واپس آ رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر لڑکی کے منہ سے ایک دہشت ناک چیخ نکلی پھر وہ اندھوں کی طرح مجمع چیرتی ہوئی قبر کی طرف بھاگی جہاں اب بھی چند افراد کھڑے تھے۔ ایک عورت قبر پر پھولوں کا گلدستہ رکھ رہی تھی۔

قبرستان پر ایک ٹیکسی اور رُکی۔ تین آدمی اُتر کر تیزی سے قبرستان میں آئے۔ انھوں نے حیرت زدہ مجمع دیکھا جو سَر موڑے بے تحاشا بھاگتی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ تینوں ایک ساتھ لڑکی کے تعاقب میں دوڑے۔ لڑکی قبر کے پاس دو زانو بیٹھ گئی اور اس پر پڑی ہوئی پھولوں کی چادر پاگلوں کی طرح ہٹانے لگی۔ قبر پر کھڑے ہوئے لوگ شدید حیرت سے لڑکی کو دیکھتے رہے پھر انھوں نے آگے بڑھ کر اس کے بازو پکڑ لیے۔ "چھوڑ دو مجھے۔" لڑکی نے چیخ کر کہا۔ "ہٹ جاؤ! جیمپ! جیمپ! جواب دو! میں آگئی ہوں۔"

زمین کے اندر سے اچانک ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے غبارے پھوٹ رہے ہوں۔ پھر ایک ہلکی سی چیخ سُن کر سب پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے زمین کی گردش رُک گئی۔ دوسرے لمحے وہاں کھڑے ہوئے لوگ اُلٹے سیدھے قدموں سے بے تحاشا بھاگنے لگے۔ اُن کی آنکھیں دہشت سے اُبل کر باہر آگئی تھیں اور چہرے لٹک گئے تھے۔ ایک عورت ہذیانی انداز میں بُری طرح چیخ رہی تھی۔ لڑکی قبر کے پاس تنہا رہ گئی اور دوبارہ جھک کر پاگلوں کی طرح مٹی ہٹانے لگی۔ اچانک چند مردانہ بازوؤں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ خفیہ پولیس کے تینوں آدمی لڑکی کے گرد کھڑے حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ لڑکی ان میں سے ایک کو پہچان گئی۔ یہ وہ لیفٹیننٹ تھا جس نے رات بھر اس سے سوالات کیے تھے۔ "لیفٹیننٹ پلیز! خدا کے لیے میری مدد کرو! جیمپ کو باہر نکالو۔ وہ اندر مر جائے گا! جلدی کرو لیفٹیننٹ! جلدی کرو!" لڑکی نے لیفٹیننٹ کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑا۔

"جیمپ ہے کہاں؟" لیفٹیننٹ نے حیرت سے پوچھا۔

"اندر۔۔۔ قبر کے اندر۔" لڑکی نے ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے کہا۔ زمین کے اندر سے پھر اچانک غبارے پھوٹنے کی آوازیں آئیں۔

"وہ ابھی زندہ ہے! وہ گولیاں چلا رہا ہے! خدا کے لیے اسے باہر نکالو!" لڑکی دہشت زدہ انداز میں آنکھیں پھاڑے قبر کی طرف دیکھ رہی تھی۔

لیفٹیننٹ نے لڑکی کے شانے پکڑ کر اسے ایک جھٹکے سے اپنی طرف موڑا۔ "وہ آخر قبر میں کس طرح پہنچا؟" اس نے بے یقینی سے قبر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ۔۔۔ وہ تابوت میں چھُپ گیا تھا۔ مُردے کے ساتھ۔ وہ اتنا چھوٹا تھا کہ مُردے کے ساتھ تابوت میں آسانی سے لیٹ سکتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جب پولیس عمارت کی تلاشی لے کر چلی جائے گی تو وہ باہر نکل کر فرار ہو جائے گا لیکن وہ زخمی تھا۔ اس کے بازو میں گولی لگ گئی تھی، خون بہنے کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو گیا ہو گا اور اب۔۔۔ اب اسے ہوش آگیا ہے۔ خدا کے لیے لیفٹیننٹ! کچھ کرو۔ میں تمھارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ وہ۔۔۔ وہ زندہ دفن ہو گیا ہے لیفٹیننٹ!" لڑکی دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھُپا کر ہچکیاں لینے لگی۔

لیفٹیننٹ نے لڑکی کو چھوڑ دیا اور اپنے ایک ساتھی سے کہا۔ "ہنری! جلدی سے جاؤ۔ باہر تدفین کی گاڑی کھڑی ہے۔ کدالیں اور پھاوڑے نکال لاؤ۔"

ہنری لیفٹیننٹ کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی دروازے کی طرف بھاگنے لگا تھا۔ لیفٹیننٹ بیٹھ کر غور سے قبر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے زمین سے کان لگا دیے۔ چند لمحوں بعد اسے پھر زمین کے اندر گولی چلنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ لڑکی کا بیان درست نظر آتا تھا۔ جیمپ لین قبر میں موجود تھا اور باہر والوں کو مدد کے لیے متوجہ کرنے کی غرض سے گولیاں چلا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد انھوں نے مٹی ہٹا کر قبر کھولی۔ تابوت کے ڈھکن میں چار سوراخ نظر آئے۔ کیلیں نکال کر ڈھکن کھولا گیا۔ وہاں دو لاشیں نظر آئیں۔ جیمپ لین کی لاش خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ اس نے ریوالور کی آخری دو گولیاں خودکشی کرنے میں استعمال کی تھیں۔ اس کا خوف و دہشت سے مسخ چہرہ خون میں لتھڑ کر اور بھیانک ہو گیا تھا۔ لڑکی نے جیسے ہی اسے دیکھا، چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔

ایک

واعظ کو پہلی بار تقریر کا موقع ملا۔ اس نے سوچا تقریر ایسی جامع اور بھرپور کی جائے کہ حاضرین دنگ رہ جائیں۔ اس نے بڑے زور و شور سے تقریر کی تیاری کی اور گھنٹوں تقریر کے اشارات کاغذ پر قلم بند کرتا رہا اور جلسے میں پہنچ کر جب وہ تقریر کے لیے کھڑا ہوا اور جیب میں ہاتھ ڈالا تو پتہ چلا اشارات والا کاغذ وہاں موجود نہیں ہے۔ وہ بہت گھبرایا لیکن پھر سنبھل گیا اور تقریر کا آغاز کیا۔

"خواتین و حضرات! میں آج آپ کے سامنے زندگی کے اہم مسائل پر تقریر کرنا چاہتا تھا لیکن یہ میرا ذاتی مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ مجھ سے پہلے بھی بیسیوں مقررین آپ کے سامنے نہایت اہم اور مواعظانہ تقریریں کرتے رہے ہیں اور ان کا آپ پر کوئی اثر نہیں ہُوا۔ آپ کے دل اس چکنی اور پھسلواں چٹان کی طرح ہیں جس پر کوئی چیز ٹھیرتی ہی نہیں۔ پھر میں تقریر کر کے اپنی توانائی کیوں ضائع کروں، لہٰذا مجھے اجازت دیجیے میں اپنے گھر جاؤں اور آپ لوگ اپنے اپنے گھروں کو تشریف لے جائیں۔"

Pakistanipoint Waqar Azeem
وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

تاریک براعظم کا فسوں
سب رنگ کا ایک
تحیر خیز پُراسرار
سلسلہ

جابر بن یوسف الباقر

گزشتہ قسطوں کے مکمل خلاصے کے ساتھ — ۲۲

آکسفورڈ کا تعلیم یافتہ مغرب زدہ نوجوان جابر بن یوسف الباقر ایک وجیہہ، جذباتی، ضدی اور شگفتہ مزاج شخص تھا۔ اُسے اپنی زندگی میں ایسے تحیر خیز واقعات سے سابقہ پڑا جنھیں عقل تسلیم کرنے سے گریزاں رہتی ہے۔ وہ اپنی انگریز محبوبہ فلورا کے ساتھ بحری سفر کر رہا تھا کہ جہاز اچانک گہرے پانیوں میں غرق ہو گیا۔ اُس کے اور فلورا کے سوا محض چند مسافر زندہ بچے اور ایک حفاظتی کشتی پر سوار ہو کر بدنصیبی کی رہنمائی میں جزیرۂ توری جا پہنچے۔ توری تاریک براعظم کی رفیع الشان ملکہ اکابلا کی وسیع و عریض سلطنت کا ایک حصہ تھا جہاں دو قبیلے آباد تھے۔ ایک قبیلے کا سردار کالاری تھا اور دوسرے قبیلے کا سردار شوالا۔ شوالا نے بدقسمت اجنبیوں کو قید کر دیا اور سفید فام فلورا کو اپنے لیے منتخب کر کے دو مقامی لڑکیوں توشا اور بشری کو اُس کی نگرانی پر مامور کر دیا۔ ذہین جابر نے اپنے ہندی ساتھی سرنگا کے اشارے پر توشا اور بشری کو شیشے میں اتارا اور اُن سے جزیرے کے متعلق حیرت انگیز معلومات حاصل کیں۔ یہ معلومات اُس کے بہت کام آئیں لیکن توشا اور بشری کو اس کی کڑی سزا بھگتنا پڑی۔ شوالا نے ایک کو برسرِعام زندہ جلا دیا اور دوسری کو آدم خور چیونٹیوں سے ڈسوا کر ہلاک کر دیا۔ اس دہشت گردی پر جابر کے عرب ساتھی ڈاکٹر جواد کا دماغ الٹ گیا۔ حبشیوں نے اُس کا باقاعدہ علاج کیا لیکن علاج کا طریقہ انتہائی بھیانک تھا۔ یہ اذیت ناک حالات جابر کے لیے ناقابلِ برداشت تھے۔ وہ قید میں پڑے پڑے بے بسی کی موت مرنا نہیں چاہتا تھا چنانچہ ایک رات وہ پہرے داروں کو اُنھی کے نیزوں سے قتل کر کے وہ فرار ہوا اور میلوں بھاگنے کے بعد توری کے ایک معزز طبیب کے غار میں جا گھسا۔ طبیب کے گلے میں مقدس جارا کاکا کی کھوپڑی پڑی تھی۔ توری میں جس شخص کے پاس جارا کاکا کی کھوپڑی ہوتی تھی وہ احترام کا مستحق سمجھا جاتا تھا اور نحوستیں اُس سے دور رہتی تھیں لہٰذا جابر نے طبیب کو سوتے میں ہلاک کر کے جارا کاکا کی کھوپڑی حاصل کر لی۔ یہ جزیرۂ توری میں اُس کی پہلی فتح تھی۔ دوسرا دن پاک کے غار سے نکلا اور بے تحاشا دوڑتا ہوا ایک دور افتادہ سرنگ میں جا کر روپوش ہو گیا پھر زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اندھیری سرنگ یکایک بقعۂ نور بن گئی اور اس کی متحیر آنکھوں نے ایک حسین و جمیل دوشیزہ اپنے روبرو دیکھی۔ یہ اکابلا کی ایک نائب زرولین تھی۔ زرولین نے تاریک براعظم کے فولادی قوانین پر پردہ پوشی ڈالتے ہوئے جابر سے تین آدمیوں کے قتل کا جواب طلب کیا۔ جابر نے جواب کے طور پر اپنی دردناک داستان دہرائی اور اپنی جادو بیانی سے زرولین کا دل موہ لیا۔ وہ بے اختیار اُس کے سینے سے لگی مگر اس سے پہلے کہ معاملہ آگے بڑھتا آگ کے ایک پُراسرار گولے نے اچانک نمودار ہو کر زرولین کا لالہ زار بدن راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا۔ جابر پر بے ہوشی طاری ہو گئی اور جب دوبارہ اُس کی آنکھ کھلی تو وہ اپنی جھونپڑی میں تھا اور بوڑھا سرنگا اپنی کنواری لڑکی سریتا کے ساتھ حیرت و اشتیاق سے اُس کے گلے میں پڑی ہوئی کھوپڑی دیکھ رہا تھا۔ جابر نے انھیں اپنی روداد سنا کر اور زیادہ حیران کر دیا۔ اُسی رات ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ نازک سریتا کسی پُراسرار کیفیت کے زیرِ اثر جابر کے منع کرنے کے باوجود چھلاوے کی طرح جھونپڑی سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اُسے دراصل توری کے سردار کالاری نے ساحرانہ طریقے سے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ جابر نے جھنجھوڑ کے سرنگا کو جگایا۔ سرنگا ایک صاحبِ اسرار شخص تھا۔ اُس کی جیب میں ہر وقت ایک مورتی موجود رہتی تھی۔ اُس نے مورتی نکال کر کوئی عمل پڑھا اور جابر یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ مورتی نے ایک جیتی جاگتی دیوی کی شکل اختیار کر لی۔ سرنگا نے ہاتھ جوڑ کر کسی نامعلوم زبان میں دیوی سے کچھ گفتگو کی اور مورتی کو دوبارہ اصل حالت میں واپس لا کے جابر سے اصرار کیا کہ مجھے ابھی زرولین کے غار میں لے چلو۔ چنانچہ وہ دونوں ڈرامائی انداز میں پہرے داروں کو جھانسہ دے کر سرنگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ بدقسمتی سے جابر گھنے جنگلوں میں پہنچ کے راستہ بھٹک گیا اور انھیں آسمانوں سے خوف ناک گھن گرج سنائی دینے لگی۔ ساتھ ہی سرنگا کا نحیف و نزار جسم پتھر کے بت میں تبدیل ہو گیا۔ اس بھیانک افتاد نے زود حس جابر کے لیے مہمیز کا کام کیا اور وہ صحرائی اونٹ کی طرح بے تکان دوڑتا ہوا ایک غار میں داخل ہو گیا۔ یہ غار جزیرۂ توری کے کاہنِ اعظم سمورال کی اقامت گاہ تھا۔ معمر سمورال اجنبی جابر کے ساتھ کمال شفقت سے پیش آیا اور اُس کی نوخیز لڑکی ترام اور کمسن بیٹے سجرال نے مہمان کی مدارات میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ جابر نے وہاں بڑے سکون کے دن گزارے۔ سمورال کے ان مختلف طلسمات کے علاوہ ایک کرشمہ بھی تھا جس کے گھومتے ہوئے تیل میں دلچسپ مناظر کسی فلم کی طرح دیکھا کرتا تھا۔ جابر کی فرمائش پر اُس نے سرنگا اور سریتا کے حالات دیکھے اور اُسے بتایا کہ سرنگا دوبارہ متحرک ہو کے جنگلوں جنگلوں بھٹکتا پھر رہا ہے اور سریتا بوالہوس کالاری کی بھینٹ چڑھنے کے لیے تیاری کے مرحلوں سے گزر رہی ہے۔ جابر کو یہ امر کسی قیمت پر منظور نہیں تھا کہ فلورا کے بعد سریتا بھی سیاہ فاموں کی ہوس کا نشانہ بن جائے چنانچہ ایک روز موقع پا کر وہ غار سے نکلا اور دندناتا ہوا کالاری کے سر پر جا پہنچا۔ کالاری نے سریتا کو سرتاپا برہنہ کر دیا تھا اور اُس پر مجرمانہ حملے کے لیے پر تول رہا تھا۔ جابر اس شرمناک منظر کی تاب نہ لا سکا اور کالاری پر چیتے کی طرح جھپٹ پڑا۔ کالاری اُس سے کہیں زیادہ طاقت ور تھا۔ وہ اُسے شکنجوں میں مسل رہا تھا مگر سرنگا کی دیوی نے بروقت نمودار ہو کر جابر کی مدد کی اور جابر نے چشم زدن میں کالاری کو جہنم رسید کر دیا اور کسی تاخیر کے بغیر عریاں سریتا کو پشت پر لاد کے بے تحاشا بھاگنے لگا۔ کالاری کا پورا قبیلہ اُس کے تعاقب میں دوڑ پڑا مگر جابر برق رفتاری سے اُنھیں پیچھے چھوڑتا ہوا اپنا ٹھکانا سمورال کے غار میں داخل ہو گیا۔ سمورال نے اُس سے کوئی بازپرس نہیں کی بلکہ یہ انکشاف کر کے اُسے حیرت زدہ کر دیا کہ چونکہ اُس نے کالاری پر فتح پائی ہے اس لیے رواج کے مطابق کالاری کا منصب اب اُسے سونپ دیا جائے گا۔ جابر نے فرطِ مسرت سے کاہن کے ہاتھ چوم لیے اور موقع کی مناسبت سے بے باکانہ لجاجت کے ساتھ اُس کی بیٹی ترام اُس سے مانگ لی۔ سمورال نے کچھ پس و پیش کے بعد یہ پیغام قبول کر لیا اور دوشیزہ ترام ہمیشہ کے لیے جابر کی ہو گئی۔ سریتا سہمی ہوئی نظروں سے یہ تماشا دیکھتی رہی۔ جابر نے کاہنِ اعظم سے خشوع و خضوع کے ساتھ سرداری کے آداب سیکھے اور ترام کو لے کر ایک پُرشکوہ جلوس کی شکل میں اپنے قبیلے پہنچا۔ اُس کی مسند نشینی کا جشن دھوم دھام سے منایا گیا۔ اُسے برہنہ کر کے جانوروں کے خون میں غسل دیا گیا اور کالاری کی بیویوں سمیت قبیلے بھر کی عورتیں اُس کی خدمت بجا لائیں۔ جابر نے تن دہی سے اپنے علاقے میں اصلاحات نافذ کیں اور شوالا سے سفارتی تعلقات بحال کرنے کی کوشش کی اور ایک سردار کی حیثیت سے اُس سے اپنی محبوبہ فلورا کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ شوالا نے یہ مطالبہ حقارت سے ٹھکرا دیا۔ مجبوراً جابر کو اُس سے زور آزمائی کا فیصلہ کرنا پڑا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی عملی قدم اٹھاتا ایک روز اچانک اکابلا کی بارگاہ میں طلب کر لیا گیا۔ اکابلا کا قصر شان و شوکت میں قدیم شاہی محلات سے کسی طور کم نہیں تھا اور حسن و جمال کے نادر نمونوں سے بھرا پڑا تھا۔ جابر کو باغوں، بہشتوں، ایوانوں اور مختلف عجائب کی کہکشاں سے گزار کر اکابلا کی خصوصی نشست گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں رنگ برنگے بادلوں کے شامیانے سے تنے ہوئے تھے۔ خوش نما دریا سے شہنائیاں اُبل رہی تھیں اور فضا میں نفیس ترین خوشبوئیں بسی ہوئی تھیں۔ اکابلا کا زرنگار تخت برق و رعد کی کڑک اور آسمانی گھن گرج کے درمیان بلندی سے نازل ہو کر جابر سے چند قدم کے فاصلے پر معلق ہو گیا۔ سبز پتوں اور پھولوں کے پیرہن میں دنیا کا سب سے بے مثال پیکر جابر کی حیران نگاہیں خیرہ کر رہا تھا۔ یہ ذی حشم اکابلا تھی۔ اکابلا نے جابر سے اپنی پری صورت نائب شمارا کی زبانی گفتگو کی۔ شمارا نے اُسے حدودِ سلطنت سے آگاہ کرتے ہوئے اُس پر شوالا کے سلسلے میں اپنی حدود سے تجاوز کرنے کا الزام لگایا۔ جابر نے جواب میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیے۔ اُس نے اپنی دردناک روداد کا ایک ایک باب تفصیل سے سنایا اور فلورا پر اپنے جائز حقوق پیش کرتے ہوئے اُس کی بازیابی کی درخواست کی۔ اکابلا نے شعلہ بیان جابر کی ایک لذیذ مشروب سے تواضع کی اور فلورا کے حصول کے لیے شوالا سے دو بدو مقابلے کا حکم دے کر ڈرامائی انداز میں رخصت کر دیا۔ قصرِ اکابلا سے واپسی پر جابر کی دنیا زیر و زبر ہو گئی۔ حسین اکابلا کے تصور کے سوا اُسے کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ اُس نے اپنے تصرف کی تمام عورتوں سے کنارہ کشی کر لی اور شوالا سے مقابلے کے لمحے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا کیونکہ اسی موقع پر اُسے دوسری بار اکابلا کا دیدار نصیب ہونے والا تھا۔

مقابلے کے دن دونوں قبیلے ایک بڑے میدان میں جمع تھے اور ایک ممتاز مقام پر اکابلا کا مرصع تخت ایستادہ تھا۔ یہ جزیرۂ توری کا ایک یادگار دن تھا۔ کاہنِ اعظم کے اشارے پر جب مقابلہ شروع ہوا تو جابر نے جان لڑا دی۔ شوالا بھی پوری تیاری سے آیا تھا اور جابر سے کہیں زیادہ طاقت ور تھا اس لیے اُسے نیچا دکھانے میں جابر کو سخت دقت پیش آ رہی تھی یہاں تک کہ ایک نازک موڑ ایسا آیا جہاں جابر کی شکست یقینی ہو گئی مگر عین موقع پر سرنگا کی دیوی نے دوسری بار اُس کی مدد کی اور اُس نے دیکھنے والوں کی توقع کے بالکل خلاف قوی الجثہ شوالا کو چاروں شانے چت کر دیا۔ دیوی کی مداخلت معمولی بات نہیں تھی اس لیے سرنگا پر اکابلا کا عتاب نازل ہوا۔ اُس کے جسم پر بڑے بڑے آبلے پڑ گئے اور اُس کی دیوی شیشے کے ایک قدِ آدم جار میں مقید کر لی گئی۔ دیکھتے دیکھتے لمحوں میں جابر فوراً گرفتار ہو گئی۔ جابر فتح مند قرار دیا جا چکا تھا اور اب اُسے شوالا کے تصرف کی کوئی بھی چیز طلب کرنے کا حق حاصل تھا مگر وہ اکابلا کی موجودگی میں اپنی زبان سے فلورا کو مانگنے کی غلطی کیسے کر سکتا تھا؟ اُس نے فیصلہ فلورا پر چھوڑ دیا۔ فلورا نے حیرت انگیز طور پر شوالا کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ یہ ایک ناقابلِ یقین حادثہ تھا۔ جابر کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور وہ فتح مند ہونے کے باوجود خود کو شکست خوردہ محسوس کرنے لگا چنانچہ اکابلا کے تصور میں اور زیادہ شدت پیدا ہو گئی اور اُس کی جوانی تجرد اور رہبانیت میں بسر ہونے لگی۔ اس ایثار کے عوض اکابلا نے اپنی پری پیکر نائب شمارا اُس کی خلوت میں بھیج دی۔ توبہ شکن شمارا اکابلا کا تحفہ تھی اس لیے جابر نے اُسے عکسِ محبوب سمجھ کر آنکھوں سے لگا لیا اور اُس کے ساتھ انتہائی سرمست و سرشار لمحے گزارے۔ انھی دنوں ایک دہشت ناک سانحہ رونما ہوا۔ جابر کو پتہ چلا کہ اُس کے نائب ابالیش اور بندر کاہو کی وفاداریاں مشکوک ہیں۔ اُس نے تحقیق کی تو اس امر کی تصدیق ہو گئی۔ جابر نے پہلی فرصت میں ابالیش کو موت کے گھاٹ اتار دیا مگر کاہو نہ صرف بچ نکلا بلکہ اس نے موقع پا کے جابر کی شریکِ حیات ترام کی زندگی کا چراغ گُل کر دیا اور فرار ہو گیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ کاہنِ اعظم نے اُس سے ہمدردی کرنے کے بجائے یکلخت تمام تعلقات منقطع کر لیے اور اُسے ترام کی خفیہ تدفین میں بھی شریک نہیں کیا۔ دل شکستہ جابر دنیا بھر سے منہ موڑ کے اکابلا کے خیالوں میں گم ہو گیا اور آخر ایک روز اُسے اکابلا کی طرف سے آزمائش اور تربیت کے لیے جزیرۂ باگمان روانہ ہونے کا حکم مل گیا۔ باگمان تاریک براعظم کی ایک عجیب بستی تھی۔ وہاں سورج کی روشنی کا گزر ممکن نہیں تھا۔ ہمہ وقت اندھیرا مسلط رہتا تھا۔ جزیرے کا سردار لوکاسا ایک حسین و جمیل دوشیزہ لوریا کی ماتحتی میں کام کرتا تھا۔ لوریا اکابلا کی نمائندہ تھی مگر دلچسپ امر یہ تھا کہ ماتحت سردار لوکاسا لوریا کے مرمریں بدن پر تصرف حاصل رکھتا تھا۔ باگمان میں توری کے ایک معزز سردار جابر بن یوسف الباقر کا استقبال اس طرح کیا گیا کہ ایک سانولی دوشیزہ قریب آئی اور اُسے اپنے اور سانپ کے خون کا آمیزہ دیوتاؤں کا مشروب کہہ کر پلایا۔ یہ پہلی آزمائش تھی۔ مہذب جابر اس میں پورا اترا۔ وہ مشروب کا آخری قطرہ تک حلق میں انڈیل لینا چاہتا تھا کہ اُس کی بیوی ترام کا مفرور قاتل بندر کاہو اچانک نمودار ہو کر اُس سے مشروب چاٹنے کی اجازت طلب کرنے لگا۔ جابر نے مصلحت اور دوراندیشی کے تحت غصہ ضبط کر کے اُسے اجازت دے دی۔ کاہو نے جیسے ہی مشروب چاٹا جابر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اب اُس کے سامنے بندر کے بجائے ایک معمر حبشی کھڑا ہے۔ کاہو دراصل کسی زمانے میں توری کا ایک سرکردہ شخص تھا جس کی کسی لغزش پر برہم ہو کر اکابلا نے اُس کی روح بندر کے جسم میں قید کر دی تھی اور آج جابر کے طفیل دیوتاؤں کا مشروب پی کر وہ دوبارہ اپنی اصل ہیئت میں آ گیا تھا۔ وہ امتنان و تشکر کے جذبات کے ساتھ جابر سے رخصت ہوا۔ اس کے بعد جابر کو معمول کی طرح باگمان کے سردار لوکاسا کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ لوکاسا ایک اُجڈ اور سفاک شخص تھا۔ اُس نے جابر سے پہلی ہی ملاقات میں سخت بدسلوکی کرتے ہوئے لیفو سے اُس کی تواضع کی۔ لیفو انسانی گوشت کے تعفن زدہ ٹکڑوں کا نام تھا مگر جابر نے انھیں بڑی خندہ پیشانی سے زہر مار کر لیا۔ انھی دنوں باگمان میں جشنِ لوریا کا انعقاد ہوا۔ یہ ایک سالانہ تقریب تھی جس میں جسمانی کرتبوں، طلسمی تماشوں اور مختلف ہلاکت خیز کھیلوں کا مظاہرہ کیا جاتا تھا اور باگمان بھر کے باہنر، زورآور اور دلیر نوجوان اس میں حصہ لیتے تھے۔ جشن کا انعقاد جابر کے لیے ایک زریں موقع تھا چنانچہ وہ جسمانی مقابلوں کی آگ میں دیوانہ وار کود پڑا۔ باگمان کے پلے ہوئے قوت وروں سے بازی لے جانا آسان نہیں تھا مگر جابر نے اپنی خود اعتمادی اور کاہو کی روح کے تعاون سے آخر مقابلہ جیت لیا۔ حسین و دلکش لوریا نے اُسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی دو مالائیں انعام میں دے دیں۔ یہ صورتِ حال لوکاسا کے لیے خطرے کی گھنٹی سے کم نہیں تھی اس لیے اُس نے جابر کو اُسی وقت کڑی تربیت کے لیے زارشی کے لق و دق صحرا میں بھیج دیا۔ جابر پورے برس تک زارشی کی خاک چھانتا رہا۔ وہاں اُس نے تاریک براعظم کے معمر ترین بزرگوں کے ساتھ رہ کر کڑی ریاضت کی جس کا صلہ اُسے شیپالی کی صورت میں ملا۔ یہ ایک انگارا تھا جس نے جابر کی ہتھیلی میں آتے ہی آبِ زر موتی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ پھر جابر نے امتحاناً ایک معصوم بچے کا خون کیا اور ایک عظیم الجثہ جانور کو ہلاک کر کے اُس کے سینگ محفوظ کر لیے۔ یہ غیر معمولی کارنامے تھے۔ زارشی میں جابر کی ملاقات نیک دل اشتالا سے بھی ہوئی۔ اشتالا باگمان کا معزول سردار تھا اور لوکاسا کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو کر دوبارہ دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے زارشی میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ جابر اُس سے رخصت ہو کر باگمان لوٹا تو اُس نے اپنے حیرت انگیز تجسس کی بدولت لوریا تک براہِ راست رسائی حاصل کی اور زارشی کی ناقابلِ فراموش فتوحات گنوا کر لوکاسا سے زور آزمائی کی درخواست پیش کر دی جو فوراً قبول کر لی گئی۔ جابر اور لوکاسا کی جنگ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ جسمانی، نفسیاتی اور طلسمی کون سے حربے تھے جو اس لڑائی میں استعمال نہیں کیے گئے۔ لوکاسا نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا لیکن قسمت جابر کے ساتھ تھی اس لیے لوکاسا کو انتہائی عبرت ناک

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

موت سے دوچار ہونا پڑا۔ نتیجتاً لوریا کا شباب اور باگمان کا اقتدار دونوں نعمتیں جابر کی مٹھی میں آگئیں لیکن جابر نہ اقتدار کا بھوکا تھا نہ لوریا کے بدن کا پیاسا۔ اُس کا مطمحِ نظر کچھ اور تھا اور اُس کا مطلوب کوئی اور تھا۔ اُس نے باگمان کی فلاح کے لیے چند انقلابی اقدامات کیے۔ پھر اسشالا کو رزاشی سے بلا کر اُسے اپنی نیابت سونپی اور بے قرار لوریا کا دل توڑ کر آنسوؤں، دعاؤں اور تحفوں کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گیا۔

بیچ سمندر میں اُس کی کشتی تباہ کن طوفان کی نذر ہو گئی [illegible]

جب سے میں نے رنگ و نور کے اس جزیرے اسمار میں قدم رکھا تھا، میرے ساتھ تواتر سے ناقابلِ یقین واقعات پیش آ رہے تھے۔ کون تصور کر سکتا تھا کہ جابر بن یوسف جیسا مردانہ صفات کا نمونہ ایسے حالات میں گھر جائے گا کہ اُسے ایک ستون پر بٹھایا جائے گا اور اس کی رونمائی کے لیے حسین عورتوں کے ہجوم جمع ہو جائیں گے۔ میں سوچ رہا تھا، میری جنس تبدیل ہو گئی ہے۔

میں خود سے شرما رہا تھا۔ وہ میری طرف ہولناک نگاہوں سے دیکھتی تھیں اور میں اُن کی طرف ملتجی نظروں سے۔ بیک وقت اتنی عورتوں کو اپنی طرف راغب دیکھ کر بوالہوس بھی پناہ مانگیں۔ وہ سب مجھ سے تعلقِ خاطر کی متمنی تھیں۔ میں ایک ایسا نادر ہیرا تھا جسے ہر انگلی سجانے کو بےتاب تھی۔ میرے سخت بازوؤں میں انھیں گداز نظر آتا تھا، انھی مشتاق چہروں میں جب اشمار کا چمکتا دمکتا چہرہ نظر آیا تو میں بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ میری نگران نازنینوں نے مجھے پھر بٹھا دیا۔

اشمار خانزادہ اقابلا کی ایک معزز کنیز تھی۔ اس نے میری راتیں بارہا مہکائی تھیں اور میں نے ان گنت بار اس کے چمن زار بدن کی سیاحت کی تھی۔ اسے یہاں دیکھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے آنکھوں میں کسی نے ٹھنڈا سرمہ لگا دیا ہو اور سخت زمین پر مضمحل گردن کے نیچے تکیہ رکھ دیا ہو۔ شروع میں اشمار جھجکی، بعد میں سکڑنے لگی۔ میں اپنی اونچی نشست سے چیخنا چاہتا تھا، ”اشمار اے قصرِ اقابلا کی شراب! یہ میں ہوں، میں اسمار میں آگیا ہوں، مجھے غور سے دیکھ اور میرے خشک لبوں کی تشنگی دور کر۔“ مگر میرا اضطراب مجھی تک محدود رہا۔ میں اپنی کوئی چیخ اشمار تک منتقل نہیں کر سکا کیوں کہ میرے اندر بیٹھے ہوئے کسی شخص نے مجھے روک دیا۔ ”خاموش رہ اور تماشا دیکھتا جا۔“

ستون کے نیچے سرخ و سفید عورتوں کے جمگھٹے آتے اور گزر جاتے۔ بار بار اعلان ہوتا مگر الیشام کا نام سننے کے بعد ان کے حوصلے سرد پڑ جاتے۔ الیشام کو یقیناً اسمار میں کوئی خاص مقام حاصل تھا۔ اس کا کسی قدر اندازہ مجھے اسی وقت ہو گیا تھا جب ناظم تلراش نے مجھے ناظموں کے شبستان میں پیش کیا تھا اور الیشام نے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ الیشام نے یہ جرأت کی تھی۔ جرأت وہی لوگ کرتے ہیں جنھیں ان کی جرأت کے سبب کا یقین ہوتا ہے۔ میں اشمار کی خاموشی پر جھنجلاہٹ میں آوازے کسنے لگا۔ تور ہی سے روانگی کے وقت کاہنِ اعظم سمورال نے ہدایت کی تھی کہ دیوتاؤں کے مقدس تحفوں کا استعمال صرف مخصوص موقعوں پر کیا جائے۔ خود میرے لیے بھی یہی مناسب تھا کہ میں کوئی ہنگامہ کرنے سے پہلے جزیرۂ اسمار کے قوانین اور اس کی طاقت کا اندازہ لگا لوں۔ ابھی کتنا وقت گزرا تھا، میری گردن شرم سے جھکی ہوئی تھی لیکن کسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے یہ شرمناک وقت گزارنا لازم تھا۔ اشمار میری بازیابی کا اعلان سن کر کچھ دیر کھڑی رہی پھر سر جھکائے چلی گئی۔ مجھے یقین آ گیا کہ میری قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ میں الیشام کے سپرد کر دیا جاؤں گا۔ کیا اسمار میں الیشام سے زیادہ کوئی عورت جرأت مند نہیں ہے؟ لیکن سورج غروب ہونے سے پہلے اشمار پھر ایک نئے ہجوم کے درمیان نظر آئی۔ اس مرتبہ اس کے چہرے پر عزم کی تابانی نظر آتی تھی۔ میری پشت پر کھڑی ہوئی لڑکی نے آخری بار ڈھول بجا کر اپنا اعلان دہرایا۔ ”جزیرۂ اسمار کی معزز عورتو! تمھارے سامنے اس وقت ان جزیروں کا سردار جابر بن یوسف البا ز موجود ہے۔ دیوتاؤں نے ہماری آسودگیِ جاں کے لیے یہ حسین مرد اسمار کی سرحدوں میں پھینک دیا ہے۔ اس کے بازو سخت ہیں، علم برتر ہے اور اس کا سینہ دیوتاؤں کے فوارے سے آراستہ ہے۔ اس کی نگاہیں والہانہ اور انداز شاعرانہ ہیں۔ روایت کے مطابق صرف اسی کو اس تحفۂ خاص کی رفاقت کا حق حاصل ہے جو اس کی اہل ہو۔ محترم الیشام نے اسے اپنے لیے منتخب کر لیا ہے۔ سورج غروب ہو رہا ہے، جلد ہی اسے محترم الیشام کے علاقے میں پہنچا دیا جائے گا۔ کوئی ہے جو خود کو الیشام سے برتر ثابت کر کے یہ مرد حاصل کرے؟ کوئی ہے جو الیشام سے اس مرد کے لیے مبارزت کرے؟“

مجمع میں اس اعلان کے بعد ایک بھنبھناہٹ ہوئی اور پھر اشمار کی آواز ابھری، وہ بلند آواز ساری سرگوشیوں پر حاوی آگئی۔ ”مقدس شوطار مجھے حوصلہ دے۔“ اشمار نے احترام سے کہا۔ ”میں اس مرد کے لیے الیشام سے مبارزت کو تیار ہوں۔“

ہجوم کی ہر عورت نے اشمار کو استعجاب کی نظر سے دیکھا جیسے اس سے کوئی سنگین جرم سرزد ہو گیا ہو۔ چند لمحوں کے لیے سکوت چھا گیا، خوف و ہراس کا سکوت۔ مجمع کائی کی طرح پھٹنے لگا اور سورج کی آخری کرن کے بعد اشمار وہاں تنہا کھڑی رہ گئی۔ میں نے اسے آواز دینا چاہا لیکن سیاہ فام عورتوں نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے حلقے میں لے لیا، پھر مجھے نیچے اتار کر سیاہ پتھروں والے زنداں میں ڈال دیا گیا۔

اگر اشمار نہ آتی تو میں اس وقت الیشام کے بازوؤں کے حصار میں ہوتا۔ قید و بند کی یہ رات میرے لیے بڑی جاں گسل تھی۔ مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ اشمار اور الیشام کے درمیان میرے حصول کی جنگ کب اور کس طریقے پر ہوگی؟ ان پتھروں کی موجودگی میں کوئی لطیف خیال، جمال کا کوئی احساس آ ہی نہیں سکتا تھا۔ جب کہ میں ایسی سرزمین میں آ گیا تھا جہاں حسن کے دریا بہتے تھے۔ دنیا میں حسن کے متعلق صرف افسانے لکھے جاتے ہیں۔ جو پری پیکر عورتیں، مستیاں بکھیرتی ہوئی، خود اپنے بازو وا کیے، سرشار نگاہوں میں نظارے کی دعوت سمیٹے جلوہ گر ہوں، جابر بن یوسف کے لیے زندگی کا یہی حاصل کیا کم تھا؟ یہ تو وہ جنت تھی جس کے خواب شاعر دیکھا کرتے ہیں مگر شاعر صرف خواب دیکھا کرتے ہیں۔ ان کی انائے عشق کا کیا حال ہوتا اگر وہ حسن و عشق کی یہ ارزانی دیکھتے؟ میں کچھ کہہ نہیں سکتا، میں گرفتگی کی کیفیت میں تھا۔ اس محکومی میں بڑا لطف تھا مگر مجھے اس محکومی کی عادت نہیں

RIO (K) PID
IAL 11

تھی۔ سنا تھا کہ قرن ہا قرن سے اسسار میں عورتوں کو بالادستی حاصل ہے شوطار کا ذکر وہ اسی احترام سے کرتی تھیں جیسے آقا بلا کا جزیرۂ توری اور دوسرے جزیروں میں کیا جاتا تھا۔ یہ جزیرہ آقا بلا کی قلمرو میں شامل تھا۔ آقا بلا نے مجھے یہاں بھیجا تھا اور آقا بلا نے مجھے یہیں کیوں بھیجا تھا؟ کیا وہ شوطار سے ناخوش ہے اور یہاں کسی تبدیلی کی خواہش مند ہے؟ کیا اس نے مجھے ایسے دریا کے کنارے پہنچا دیا ہے جہاں مجھے تشنگی کی شکایت نہ رہ جائے اور میں سیراب ہو کے اس کی طلب سے دست کش ہو جاؤں؟ شوطار کو علم ہو گا کہ مجھے اسسار کی سرحدوں میں کیوں دھکیلا گیا ہے؟ یہاں میرے لیے ہر قدم پر خطرے ہیں۔ مجھے اپنی نظارہ باز آنکھیں بند کر لینی چاہئیں اور آنے والے لمحے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے جو بڑا غیر یقینی ہے مگر میں کیا کروں؟ کیا میں اپنے طلسمی نوادر کی مدد سے یہ دیواریں توڑ کر باہر نکل جاؤں؟ اور خون خرابہ کرتا ہوا شوطار کے قصر تک پہنچ جاؤں؟ اور اس سے کہوں کہ وہ دست بردار ہو جائے؟ اور تمام اختیارات مجھے سونپ دے مجھے اپنے پاگل پن پر ہنسی آ گئی۔ ابھی نہیں۔ ابھی تو تم ایک خوبصورت مرد بنے بیٹھے رہو اور ان تتلیوں کو اپنے قریب پھٹکنے دو۔"

میری نگراں مجھے لطف کی نظر سے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے اس کا جواب اثبات میں دیا۔ ان کے سیاہ جسم روشنی میں دمک رہے تھے۔ نیزے ہاتھوں میں تھامے وہ بڑی مستعد معلوم ہو رہی تھیں۔ میں نے انھیں اشارے کیے تو ان کی اشارے بازی ختم ہو گئی۔ میں نے انھیں قریب بلایا تو وہ مجھ سے دور ہو گئیں۔ وہ میری اور میں ان کی حسرت دل میں لیے یوں ہی تڑپتا رہا۔

میں دو روز تک زنداں کی دیواروں میں سر مارتا رہا۔ تیسرے روز محافظ لڑکیوں نے مجھے نئے سرے سے بنا سنوار کر سنگلاخ عمارت سے باہر نکالا اور ایک وسیع میدان میں لے گئیں جہاں اسسار کی ہزاروں لڑکیاں تماشائیوں کی حیثیت سے موجود تھیں۔ ایک جانب پتھر کے اونچے چبوتروں پر ناظموں کی نشستیں تھیں۔ دوسری جانب محافظ دستے کی سیاہ فام لڑکیاں تھیں۔ میدان کے درمیان انشام اور اشمار آمنے سامنے پتھر کی نشستوں پر ایک دوسرے کو قہر آلود نگاہوں سے گھور رہی تھیں۔ مقابلے کا اہتمام شان و شوکت سے کیا گیا تھا۔ ان میں مرد بھی تھے جو عورتوں کے ساتھ چپکے ہوتے تھے۔ مجھے پہلے میدان میں سیاہ فام نگراں عورتوں کی معیت میں گھمایا گیا پھر پتھر کے ایک ستون سے باندھ دیا گیا۔ میرا خیال تھا شوطار بھی اس مقابلے میں شریک ہو گی مگر ایسے مقابلے یہاں عام تھے۔ انھوں نے اپنی دل بستگی کا عجیب طریقہ ڈھونڈا تھا۔ محافظ عورتیں مجھے ستون سے باندھ کر پیچھے پلٹیں تو سرخ بالوں کی ایک بے حد حسین عورت اپنی نشست سے اٹھی اور اس نے میرے بارے میں اپنے حلق سے کچھ کھنکتے ہوئے لفظ ادا کیے۔ وہ جزیرۂ اسسار کی بہت سی ناظموں کی ناظمِ اعلا تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے خود کو انشام کے مقابلے میں کیوں پیش نہیں کیا؟ اس بات سے مجھے دکھ ہوا کہ میری وجاہت میں کوئی خامی ہے کہ میں اس حسین عورت کی نظروں میں نہیں آ سکا۔ وہ اعلان کر رہی تھی۔ وہی دوشیزہ ادائیں تھیں مگر یہی ادائیں وہاں دوسرے جزیروں کی مردانہ صفات کے مقابل سمجھی جاتی تھیں۔

"جزیرۂ اسسار کی معزز عورتو! اسسار کی ناظمِ اعلا قسریم تم سے مخاطب ہے۔ دیوتا اشمار اور انشام پر رحم کریں۔ صحیح فیصلہ کرنے والے وہی ہیں۔ مقدس شوطار اپنے قصرِ خاص میں اس مبارزت سے لطف اندوز ہو رہی ہو گی۔ یہ مقابلہ اشمار اور انشام کے درمیان ہے جو اجنبی مرد جابر بن یوسف کی طلب گار ہیں۔ اگر کوئی فریق اپنی شکست قبول کرنے پر اب بھی آمادہ ہے تو اسے اس کی اجازت دی جاتی ہے بصورتِ دیگر وہ اپنے انجام سے باخبر ہو گا۔ دورانِ مقابلہ بھی شکست قبول کی جا سکتی ہے۔ مقابلے میں ہر قسم کی طاقت کا آزادانہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ فتح مند کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ اپنے مطلوب مرد کی بند شیں خود کھولے اور اس کے ساتھ وصل کی لذتوں سے سرشار ہو۔ دیوتاؤں نے یہ سرزمین وصل کے متبرک جذبے ہی کے لیے بنائی ہے۔ مقدس شوطار کے فیصلے سب سے بالا ہیں۔ وہ اپنے فیصلے کسی بھی لمحے جاری کر سکتی ہے۔ جو فتح مند ہو گی، وہ مرد کی کفالت اور اس کی نقل و حرکت کی ذمے دار ہو گی۔ اور اگر فتح مند اپنے مرد سے وصال نا آسودہ ہے تو کسی وقت بھی اس سے دست بردار ہو سکتی ہے۔ ایک چاند گزر جانے کے بعد کوئی بھی پھر مقابلے کا دعوا کر سکتی ہے۔ جزیرۂ اسسار کے تمام مرد تمام عورتوں کے لیے ہیں۔"

حسین و جمیل قسریم اپنا حکم سنا کے بیٹھ گئی۔ سیاہ فام لڑکیوں نے ڈھول پیٹنے شروع کر دیے۔ یہ گویا مقابلے کے آغاز کا اعلان تھا۔ اشمار اور انشام، برہنہ پا، برہنہ بدن اپنی نشستوں سے اُٹھ کر ڈھول کی پہلی چوٹ پر تیزی سے ایک دوسرے کے مقابلے پر آ گئیں۔ میں اپنا مذاق دیکھ رہا تھا۔ اشمار اور انشام کے خوبصورت بدن پر پڑتی ہو

دھوپ نے ان کا رنگ سرخ کر دیا تھا۔ اشمار الیشام کی طرح پُرامید معلوم نہیں ہوتی تھی۔ الیشام نے آتے ہی آناً فاناً اپنے لمبے بال ایک جھٹکے کے ساتھ چہرے کے آگے کر لیے۔ اس کا چہرہ چھپ گیا اور اس نے اپنے سر کو گردش دینی شروع کر دی۔ اشمار خاموش کھڑی تھی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ اشمار کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا ہے اور اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا ہے اور وہ زرد دکھائی دے رہی ہے۔ اس کا لرزتا ہوا سراپا اپنا بوجھ سنبھالنے سے گریزاں ہے۔ الیشام کے سر کی گردش جاری رہی۔ پھر اس نے بال پشت پر کر کے فخر کی نگاہ سے اشمار کو دیکھا اور نگاہوں نگاہوں میں اس سے کوئی سوال کیا۔

یہ وہی اشمار تھی جس نے مجھے پُراسرار علوم کی ابتدائی تعلیم دی تھی۔ میری پلکیں بار بار جھپک رہی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اشمار کے پاس اس افتاد سے بچنے کا کوئی وسیلہ نہ ہو۔ الیشام نے اپنی گردش روک کر سوال کیا تو اشمار کو ہوش آیا۔ میں نے الیشام کی پہلی ہی یلغار میں اس مقابلے کی تقدیر کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اشمار صرف میری خاطر میدان میں کودی تھی۔ ورنہ اسار کی سرکردہ ناظم اور اس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ اشمار کی شکست کے تصور ہی سے مجھ پر کبیدگی چھانے لگی۔ اشمار کی رفاقت میں جو معلومات اور آسانیاں مجھے فراہم ہو سکتی تھیں وہ کسی اور کی محبت سے ممکن نہیں تھیں۔ یہاں کاروبارِ عشق گرم کرنے کی آزادی ہوتی تو میرے تیور کچھ اور ہوتے، میں اُن کے سامنے عربی کے غنائیے سناتا اور فضا میں حسن کے جادو جگاتا، اگر میں آزاد ہوتا تو مہذب دنیا کی عورتوں کی طرح عشوہ گری کرتا اور اپنے غمزہ و ناز سے کسی کا محبوب بن جاتا۔ دوشیزاؤں کی نازک ادائی اور اُن کے شاداب رخسار کا غرور دیکھ کر مردوں کے دل میں یہ خواہش کبھی اٹھتی تو ہو گی کہ وہ ایک نازک اندام عورت ہو جاتے لیکن جب سے میں آیا تھا، کئی ہاتھوں میں منتقل ہو چکا تھا اور کئی نظروں میں سما گیا تھا۔ خود میرا اختیار کہاں تھا؟ اشمار کا رویّہ عام عورتوں سے یقیناً مختلف ہوتا اور افسوس یہ تھا کہ اشمار جابر بن یوسف اور اس کے نوادر کی موجودگی میں پہلے ہی وار میں شکست کھا رہی تھی۔ میری رگوں میں کھنچاؤ پیدا ہونے لگا اور میری ہتھیلیاں جلنے لگیں، میرا بدن مچلنے لگا اور میں نے ایک انگڑائی لے کر اپنے ستون کی رسیاں کاٹ دیں۔ انھیں میرا عرفان نہیں تھا کہ میں نے ڈگی سے نبرد آزمائی کی ہے انھیں معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں سے گزر کر کہاں آیا ہوں حالانکہ میرے نوادر میری شناخت کے ثبوت کے طور پر میرے گلے کا ہار بنے ہوئے تھے۔ جیسے ہی مجھے بندشوں سے آزاد پھنکارتے ہوئے دیکھا گیا، سب کی نگاہیں میری جانب ہو گئیں، میں آگے بڑھ کر الیشام کے جسم کے ٹکڑے کر دیتا، دوسرے ہی لمحے سیاہ فام نیزہ بردار عورتوں کے غول نے مجھے گھیرے میں لے لیا، انھوں نے دوبارہ مجھے ستون سے باندھ دیا اور میری سرکشی پر مصلحتیں غالب آ گئیں۔ پھر میں نے ایک عجیب تبدیلی دیکھی۔

میں نے دیکھا کہ میدان میں اُن کے بدن بجلیوں کی طرح چمک رہے تھے جیسے وہ آسمانی بجلیاں ہوں جو کئی سمتوں سے زمین کے سلگتے ٹکرا رہی ہوں اور زمین انکے عتاب سے دہل رہی ہو۔ ان دو خوبصورت عورتوں میں بلا کی پھرتی، تیزی اور تندی آ گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو تول رہی تھیں۔ میری جانب الیشام اور مجمع کے متوجہ ہونے کا یہ نتیجہ نکلا کہ اشمار کو اُس لمحے کی فرصت مل گئی جو ایسے معرکوں میں بڑا اہم ہوتا ہے۔ میں نے تاریک برّاعظم میں کئی مقابلے لڑے تھے، مجھے یاد آیا کہ اشمار کو الیشام کے حملوں سے بچانے کے لیے بار بار ایسے لمحے ضرور ملنے چاہئیں۔ اشمار نے وہ لمحہ ضائع نہیں کیا، الیشام کا حال دیدنی تھا، اس کے لانبے ریشمی بال اُس کے پیروں اور بدن پر جھڑ رہے تھے اور اس کی وحشت کا حال ناقابلِ بیان ہے، وہ انھیں سمیٹ رہی تھی، کبھی پکڑتی، کبھی اٹھاتی اور سر کے بال تیز ہوا میں دور دور تک بکھر جاتے۔ اشمار نے سکوت اختیار کر لیا تھا، وہ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے ایک مخصوص انداز میں کھڑی تھی جیسے کسی سے فریاد کر رہی ہو اور کسی نادیدہ دیوتا سے مخاطب ہو۔ وہ اسی طرح اُس وقت تک منہمک رہی جب تک الیشام کے منہ سے سسکیاں نکلنی شروع نہ ہو گئیں۔ پھر الیشام کی ایک فلک شگاف چیخ سے میدان لرز گیا۔

کاش اشمار کا یہ انہماک نہ ٹوٹتا۔ یہی ایک چیخ اشمار کے حق میں تازیانہ ثابت ہوئی۔ اس نے اپنا زاویہ بدل دیا اور الیشام کی طرف سوال طلب نظروں سے دیکھا کہ شاید وہ آمادۂ شکست ہے۔ اشمار، الیشام کے دام میں آ گئی۔ الیشام کے سر کے بیشتر بال جھڑ چکے تھے اور وہ اپنی اس بدصورتی پر شدید غصے میں نظر آتی تھی۔ اس کا کینہ اور جولانی پر آ گیا اور اعترافِ شکست کا جواب دینے کے بجائے وہ آگ کی طرح اشمار کے جسم کی طرف بڑھی اور اس نے اپنے بازو پھیلا کر اشمار کا نازک بدن محاصرے میں لے لیا۔ بظاہر یہ منظر بڑا پُرلطف تھا، ایک بدن دوسرے بدن سے برسرِ پیکار تھا۔ حسن اپنے آپ سے جنگ آزما تھا مگر میرے حواس اتنے مشتعل تھے کہ مجھے اس منظر سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں ملا۔ الیشام کی پشت میری طرف تھی۔ میں اس کی پشت کے حسن کا ذکر نہیں کروں گا۔ میرا ہاتھ خود بخود شپالی کی طرف چلا گیا اور میرے جی میں آئی کہ شپالی الیشام کی پیٹھ پر داغ دوں یا اپنا چوبی اژدہا چھوڑ دوں جو اس کا رس چوس لے یا ڈگی کے سینگوں سے اس کا جسم چھید دوں۔ میں کیا کروں؟ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور ان کی نظروں میں میرے لیے کوئی ہمدردی نہیں، صرف ہوس تھی، میری فریاد کہاں کارگر ہوتی؟ اب میں ستون سے تنہا بندھا نہیں کھڑا تھا، میرے اردگرد سیاہ فام عورتیں بھی تھیں جن کے نیزے میرے حلق کے نزدیک تھے۔ سو میں پیچ و تاب کھا کے رہ گیا۔ میں کبھی آنکھیں بند کر لیتا۔ اشتعال فرو کرنے کی ایک ترکیب یہ بھی ہے کہ کچھ دیکھا اور سنا ہی نہ جائے۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے پیوستہ و وابستہ تھیں، ان میں زیر کوئی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اسی طرح دیر تک میدان میں ایک دوسرے کو دھکیلتی رہیں۔ ان کی جیتی اور بڑھ گئی تھی۔ اس عالم میں انھیں دیر ہو گئی تو میں نے سوچا، میں اپنی جگہ کھڑے کھڑے جسموں کو پتھر میں مقید کرنے کا عمل پڑھوں اور الیشام کا جسم پتھر بنا دوں۔ کاہنِ اعظم سمورال نے بوڑھے زاہد کی عبادت گاہ میں مجھے پُراسرار علوم کے بعض نکتے تعلیم کر کے مجھے بڑا اعتماد بخشا تھا۔ مجھے بڑی حیرت تھی کہ اشمار اپنی تمام طاقتیں بروئے کار نہیں لا رہی ہے جب کہ اُسے اقابلا کی خاص کنیز ہونے کا شرف حاصل ہے جب اُسے کچھ نہیں آتا تھا تو اس نے یہ مقابلہ کرنے کی کیوں ٹھان لی تھی۔ وہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیتی۔ میں اشمار کے لیے تو یہاں نہیں آیا تھا۔

انھوں نے ایک دوسرے کو نہیں چھوڑا، نہ اُن کی پیوستگی میں کوئی فصل حائل ہوئی۔ کبھی اشمار، الیشام کا جسم دھکیلتی ہوئی آگے لے آتی، کبھی الیشام اشمار کو دھکا دے دیتی۔ مقابلہ دیکھنے والوں کی نظروں میں بے چینی بڑھ گئی تھی۔ مقابلے کے طول اور شدّت سے میری قدر و منزلت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میں ہر طرف مطلوب تھا۔ یکایک الیشام نے اشمار کو چھوڑ دیا اور پھرتی سے پیچھے کی طرف بھاگی لیکن چلتے چلتے گر پڑی۔ وہ ایک خاص مقام پر جا کر کوئی طلسمی عمل کرنا چاہتی ہو گی کہ راستے ہی میں اشمار نے اسے مفلوج کر دیا، اشمار نے خلا میں ایک جانب اشارہ کیا اور سب کی نظریں آسمان کی طرف لگ گئیں، سرخ رنگ کے شیشے کے ایک طلسمی خول نے اچانک کہیں سے اُتر کے الیشام کو اپنے اندر قید کر لیا۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ تماش بین دوشیزائیں اپنی نشستوں سے اٹھ گئیں۔ اشمار کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا اور میری سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی۔ الیشام اپنے دفاع میں شیشے کا خول توڑنے کی جدوجہد کر رہی تھی مجھے اپنے نوادر کی اہمیت کا احساس ہوا۔ اگر الیشام کے پاس دیوتاؤں کے نوادر ہوتے تو وہ یہ طلسم آسانی سے توڑ دیتی۔ ان سرخ و سپید لڑکیوں کے برہنہ اجسام پر صرف پھول ہوتے تھے۔ دیوتاؤں نے انھیں غیر معمولی طاقتوں سے نوازا تھا۔ یہ رمز غالباً الیشام کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ وحشت اور تیزی کے بجائے وہ اطمینان سے اشمار کے حملوں کا مقابلہ کرے۔ پہلے اس کا ارادہ ہو گا کہ وہ جزیرۂ اسار میں نووارد اشمار کو ایک دو حملوں میں زیر کر لے گی لیکن اشمار کی ہنرپیشگی و ہنرمندی کے آگے اس نے اپنے تیور بدل دیے۔ اب وہ پوری سنجیدگی سے خول کے اندر بیٹھی مختلف حرکتیں کر رہی تھی۔ ادھر اشمار کا بھی یہی عالم تھا۔ معاً ایک دھماکا ہوا اور سرخ خول کے ٹکڑے چھن چھنا کے فضا میں بکھر گئے۔ الیشام کا گلنار چہرہ پھر فاتحانہ ابھرا، خول کے شیشوں نے اشمار کا جسم چھید دیا۔ وہ کرب سے چیختی ہوئی ایک طرف بھاگی۔ الیشام اس کے پیچھے پیچھے تھی اور اس کے ہاتھ دائیں بائیں نیچے اوپر گر رہے تھے۔ پھر اس کے ہاتھوں میں ریشم کی ڈوریاں نظر آئیں اور وہ اس نے اشمار کی طرف اچھال دیں۔ اشمار ان سے الجھ کر گر پڑی اور زمین پر گیند کی طرح لڑھکنے لگی، ساتھ ساتھ وہ ڈوریوں میں بندھتی چلی گئی۔ میرے لیے یہ شعبدے نئے نہیں تھے۔ میں یہاں اُن سے زیادہ کی توقع کر رہا تھا۔ میں بھول گیا تھا کہ اشمار اور الیشام دونوں نے مشروبِ حیات پیا ہو گا۔ چنانچہ وہ انتہا پسندانہ حملے کرنے سے گریزاں ہیں اور صرف شکست چاہتی ہیں، کسی ایک کی طرف سے اعلانِ شکست اور میری بازیابی۔ وہ زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہی تھیں، اشمار ڈوریوں میں بندھ گئی۔ اب الیشام بھاگتی ہوئی اُسے کھینچ رہی تھی۔ اشمار کا پھول بدن زمین پر رگڑتا اور خاک میں اٹا ہوا دیکھ کر میری کیفیت پاگلوں کی سی ہو گئی۔ یہ بدن یہ میرا مانوس بدن، یہ شفیق بدن کبھی میری آغوش کی زینت ہوا کرتا تھا۔ میں کبھی اس کا احترام کرتا تھا، میں نے اپنے دائیں بائیں دیکھا اور اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کو آہستگی سے جنبش دینا چاہا۔ ساری نگاہیں اس تماشے کی طرف مرکوز تھیں، میری طرف پہرے دار عورتوں نے بھی توجہ نہیں دی، میں اپنا ہاتھ رسیوں ہی میں کسی قدر اوپر کرنے میں کامیاب ہو گیا اور شپالی پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ اس کی رگڑ

یعقوب کندی

> یعقوب کندی سے کسی نے پُوچھا "حسین اور اچھی چیز کی کیا تعریف ہے؟"
> یعقوب کندی نے جواب دیا "ہر حسین چیز اچھی نہیں ہو سکتی لیکن ہر اچھی چیز لازماً حسین ہو گی"

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

سے میں نے چند رسیاں توڑ دیں اور اس حد تک انھیں ڈھیلا کر لیا کہ میں کسی بھی وقت اپنے ہاتھ مکمل آزاد کرا سکوں۔ میں اپنی جگہ منجمد کھڑا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ اشمار کی حالت میں کوئی تبدیلی خود بخود واقع ہو جائے۔ الیشام لڑھکاتی ہوئی میری سمت آگئی۔ اس کے ہاتھ میں ڈوری کا سرا تھا، اس نے میری سمت اشتیاق آمیز نگاہوں سے دیکھا میں بھی مسکرا دیا اور میں نے اس کی توجہ دوبارہ مبذول کرنے کے لیے خوش ادائی سے کہا، "تم فتح یاب ہو۔"

"میں تم سے دست بردار ہو سکتی تھی جابر بن یوسف؟" اس نے دلربائی سے کہا۔ اس کے سر کے بال بہت کم ہو گئے تھے اور اسی لیے اس کی خوبصورتی میں خاصی کمی آگئی تھی۔ میری اس جرأت اور اقدام کا اثر ہوا اور اشمار کو سنبھلنے کا موقع پھر فراہم ہو گیا۔ الیشام مجھے قریب دیکھ کے اشمار کی طرف سے بے خبر ہو گئی تھی۔ میں نے بھی مردانہ ادائیں اس پر نثار کی تھیں۔ الیشام نے میرے ردِّعمل سے متاثر ہو کے مجھے ایک والہانہ بوسہ دیا، میں نے اسے طویل تر کرنے کے لیے کچھ زیادہ ہی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ دفعتاً الیشام کے جسم میں انتشار سا پیدا ہوا اور وہ میرے پاؤں پر گر کر تڑپنے لگی۔ اشمار نے ڈوری کا وہ سرا نذر اُٹھالیا تھا جو الیشام کے ہاتھ میں تھا، وہ اس کے سر کی چوٹی تھی اور اب الیشام کے بقیہ بال اس کے ہاتھ میں تھے۔ طوفان کی طرح الیشام کو کھینچ کر وہ میدان کے وسط میں لے گئی اور اسے زمین پر پٹخ دیا۔ اشمار کو یہ دوسرا موقع بھی میں نے فراہم کیا تھا۔ اس کے بعد یہی ایک صورت رہ گئی تھی کہ میں اشمار کی مدد اپنے نوادر سے کروں۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ ایک لمحے میں الیشام کے گرد گہرا دھواں چھا گیا اور چشم زدن میں اس کا سراپا دھوئیں نے چاٹ لیا۔ الیشام سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ عورت کو اس جارحانہ اور ظالمانہ تیوروں میں دیکھ کے میری حسِّ جمال نے بڑے کرب محسوس کیے۔ اشمار کے رخسار شعلہ ہو رہے تھے اور اس کی تیز آواز سے میدان گونج رہا تھا، میں اس زبان سے ناواقف تھا جس میں اشمار مخاطب تھی۔ وہ لہرا رہی تھی، اس کا بدن سیماب بن گیا تھا اور یہ سیماب دھوئیں کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ وہ دیوانہ وار دھوئیں کے گرد رقص کر رہی تھی۔ اتنی تیزی اور دیوانگی کے ساتھ کہ مہذب دنیا کے مشہور بیلے فنکار دیکھیں تو پاگل ہو جائیں۔ ایسا ایک رقص جس میں جسم پگھل جاتے۔ ایسا ایک دائرہ جس کے گرد اتنی مرتبہ طواف کرنے میں عام انسانی طاقت چند ثانیوں میں بہہ جاتے۔ اشمار میرے لیے شدید کشمکش میں مبتلا تھی۔ اس کا اضطراب، خلجان، اس کی برق

رفتاری سے مجمع پر سکوت کی مہر لگ گئی تھی۔ میں چیخ کر کہنا چاہتا تھا، "اشمار! اے میری محبوب! اپنا نازک بدن اتنا نہ تھکا۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میرے پاس زرانشی کا عطیہ شپالی موجود ہے۔ اب کچھ بھی ہو جائے۔ ایک مرد کے لیے اتنا ایثار کیوں کر رہی ہے ہمیں شرمندہ نہ کر، مجھے اجازت دے کہ میں اس دھوئیں میں اپنا چوبی اژدہا چھوڑ دوں جو الیشام کے جسم سے آبِ شباب چوس لے گا۔" اگر میں اس مرحلے پر دخل اندازی کرتا تو کیا ہوتا؟ ہاں میں شوطار اور دیوتاؤں کی عتاب کی زد پر آجاتا اور اس سا میں میری تقدیر کا فیصلہ ہو جاتا لیکن اشمار کو تو یہ جبر، یہ اذیت برداشت نہ کرنی پڑتی۔

دھوئیں کے اس بڑے مرغولے نے الیشام کو اپنے اندر چھپائے رکھا اور اشمار کے جنون میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس کا تھرتھراتا بدن رقص کرتا رہا۔ اب نظر آتا تھا جیسے اشمار نے آج اپنی روح آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ کہیں نہ رکی، اس نے ٹھیر کر کوئی سانس نہیں لیا۔ وہی اس کی چیخیں، وہی اس کی فریادیں، وہی رقص کناں محشر بداماں اعضا یہاں تک کہ بے شمار لمحے بیت گئے اور اشمار کی ذہنی حالت پر بدگمانی ہونے لگی۔ میرے قریب کھڑی ہوئی نگراں عورتوں کے نیزے زمین سے ٹک گئے تھے، ہر عورت مبہوت تھی۔ اشمار رکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ وہ رقصِ بسمل جاری رہا تا ایں کہ میدان میں پُرشور گھنٹیاں بجنے لگیں اور ناظمِ اعلا قسریم نے کھڑے ہو کر اپنے حسین ہاتھ لہرائے۔ میں اس سُرخ بالوں والی عورت کے بارے میں عرض کر چکا ہوں۔ وہ سراپا تجلی تھی، قسریم نے اشمار کو یہ رقص بند کرنے کا حکم دیا مگر وہ ناچتی رہی، اس کے کانوں میں گھنٹیوں کی آواز نہیں پہنچ رہی تھی، معلوم ہوتا تھا اس نے ایک ابدی رقص کا فیصلہ کر لیا ہے، قسریم کی آواز بھی گھنٹیوں سے مشابہ تھی، وہ خراماں خراماں چلتی ہوئی میدان میں اس جگہ پہنچ گئی جہاں دھواں چھایا ہوا تھا اور اشمار محوِ رقص تھی۔ اس نے سختی سے اشمار کا بازو پکڑ لیا، اشمار پھرکی کی طرح اسے بھی مرغولے کے گرد نچا لے گئی لیکن قسریم نے اس پر جلد ہی قابو پا لیا اور اس نے اپنے پیچھے آتے ہوئے مردوں کو اشارہ کیا۔ مردوں نے قسریم کے ہاتھ میں ایک جام دے دیا۔ قسریم نے یہ جام اشمار کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اسے پی کر اشمار کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گئی۔ یہ ماجرا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مجھے گمان ہوا کہ قسریم نے اشمار کے ساتھ کوئی ناانصافی کی ہے۔ میں نے اپنے نوادر ٹٹولے۔ قسریم ایک مخصوص انداز میں زمین پر بیٹھ گئی اور اس نے دھوئیں میں پھونکیں مارنی شروع کر دیں، یہ اس کی طلسمی پھونکوں

ہمارے ہاں فنّی مہارت قوم کی امانت ہے

حکومت کے زیرِ انتظام پاکستان انجنیئرنگ کمپنی انجنیئرنگ کے میدان میں فرم دار قیادت کے بلند سے بلند مقامات کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ یہ قیادت ہمیں پُرمعنی ٹیکنالوجی کے ذریعے پچھلے چالیس برس میں اہم ترین خدمات ادا کرنے کے صلے میں حاصل ہوئی ہے۔ — پیکو کے نام سے تیار کردہ برقی موٹریں اور ٹربائن پمپ پاکستان کے وسیع علاقوں میں سیم اور تھور کا مقابلہ کرنے میں مصروف ہیں۔ — ہمارے اپنے ہی بنائے ہوتے برقی ترسیل کے فولادی کھمبے ملک بھر میں برق رسانی کے اہم ستون ہیں۔ ریڈیو بیکل ریگولیٹر گیٹ اور ہمارے نہری نظام کے آلات بھی پیکو ہی کے نام کو سربلند کیے ہوتے ہیں۔ بھاری مصنوعات کی تیار کنندہ کمپنی کی حیثیت سے ہم اپنے ملک کی بڑی اہم ترین صنعتوں کے لیے مکمل پلانٹ اور متبادل پُرزے تیار کرنے میں ہردم مصروفِ کار ہیں۔

پاکستان انجنیئرنگ کمپنی لمیٹڈ

PEC-13/73BL

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

ہی کا اثر تھا کہ دھواں ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر فضا میں تحلیل ہونے لگا اور اندر الیشام کا بدن جھانکنے لگا۔ الیشام بے ہوش تھی۔ قسریم نے اس کے لبوں پر ہاتھ پھیرا اور غلام مردوں کو حکم دیا کہ وہ اُسے اٹھائیں۔ میدان صاف ہونے کے بعد دوسری ناظموں کا دستہ قسریم کی پشت پر کھڑا ہو گیا اور کامیابی کی موسیقی نے فضا کا تکدّر دور کرنا شروع کر دیا۔

قسریم نے الیشام کے ماتھے پر پھولوں کا ایک گجرا باندھا اور میدان میں گویا کسی نے دریائے نشاط کا بند کھول دیا۔ قسریم کو سیاہ فام مردوں نے اپنے کاندھے پر اٹھا لیا اور اس نے باوازِ بلند اعلان کیا: "مقدس شوطار دیکھ رہی ہو گی کہ ہم نے دیوتاؤں کے مسلک کی پیروی کی ہے۔ اشمار ہی اس مرد کی رفاقت کا حق رکھتی ہے کہ اس نے ناظم الیشام کو شکست دے دی ہے۔" پھر وہ براہِ راست اشمار سے مخاطب ہوئی۔ "سن لے اشمار! جزیرۂ اسمار کی روایت کے مطابق یہ اجنبی مرد تیرے حوالے کیا جاتا ہے۔ اب یہ تیرا فرض ہے کہ تو اسے سرکشی سے روک اور تیرا حق ہے کہ تو اس کے وصال کی لذت سے بہرہ ور ہو۔ کوئی شبہ نہیں کہ دیوتاؤں نے اسے تجھے تفویض کیا ہے۔ ہاں تجھے اختیار ہے کہ تو اس سے جب چاہے دست بردار ہو جا، جب چاہے عطیے کے طور پر عارضیاً یا مستقلاً کسی کو بخش دے۔" اشمار ابھی تک ہانپ رہی تھی۔ اس نے سنبھل کر قسریم کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا اور جھک کر سرشاری سے کہا: "مقدس شوطار دیکھ رہی ہو گی کہ میں نے اس مرد کے حصول کے لیے دیوتاؤں کی عطا کردہ ہر قوت آزمائی ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ مجھے ان کی طرف سے جو کچھ بخشا گیا ہے، میں نے اسے فراموش نہیں کیا۔ مقدس شوطار اسمار کی امین ہے۔ وہ دیکھ رہی ہو گی کہ جابر بن یوسف کے لیے میری طلب زیادہ شدید تھی۔ میں عہد کرتی ہوں کہ اس مرد کو اپنی تحویل میں رکھوں گی اور اسے وصال کی تمام لذتوں سے ہمکنار کروں گی۔"

اشمار یہ رسمی عہد نامہ ادا کر کے میرے پاس آئی۔ اس کی نگاہوں میں خمار کی کیفیت تھی۔ برتری کا ایک احساس۔ اس نے بے اختیار میری بندشیں کھولنی شروع کر دیں۔ حالانکہ وہ پہلے ہی ڈھیلی ہو چکی تھیں۔ نیزے بردار سیاہ فام لڑکیوں کا غول پیچھے کی طرف جا چکا تھا۔ اشمار نے میرے لبوں پر اپنے لب پیوست کر دیے۔ جزیرے کی خوش جمال عورتیں ہمارے گرد حلقے کی صورت میں ناچ رہی تھیں اور اشمار کی فتح پر دیوتاؤں کی عظمت کا غنائی اعتراف کر رہی تھیں۔ وہ مجھے آزاد کر کے میدان میں گھسیٹتی ہوئی محلات کی جانب بڑھنے لگی، یہ تماشا دیکھ کر عورتوں کے قہقہے نکل گئے۔ اس کی گرفت میری کلائی پر بہت سخت تھی۔

توری میں وہ موم کی طرح نرم اور ریشم کی طرح ملائم تھی مگر اس وقت اُس کے بدن میں بلا کی طاقت تھی، مجھے اشمار کے اس رویّے پر حیرانی ہوئی۔ میں نے ضبط سے کام لیا اور اس کے ساتھ زرخرید غلاموں کی طرح گھسٹتا رہا۔ سُرخ و سپید لڑکیوں کا پرا جلوس کی صورت میں اشمار کے ساتھ تھا۔ آبادی کی حدود میں غلغلہ مچا رہا، پھر جب اشمار مجھے اپنی گرفت میں لیے لیے ایک عمارت میں داخل ہو گئی تو ان لوگوں کے نعرہ ہائے تحسین اور مژدہ ہائے مسرت کا واویلا ختم ہو گیا۔ یہ اشمار کی قیام گاہ تھی۔ اس کی سفید دیواریں میناکاری سے مرقع تھیں اور یونان و مصر کے کسی گم شدہ طرزِ تعمیر کی یاد تازہ کرتی تھیں، مجھے وہاں کئی سیاہ فام مرد بھی نظر آئے جو اشمار کو دیکھ کے احتراماً خمیدہ ہو گئے۔ انھوں نے میری آمد معنی خیز نظروں سے دیکھی۔ اشمار فاخرانہ انداز میں مجھے ساتھ لیے ایک چھوٹے سے باغ میں داخل ہوئی۔ یہ باغ عمارت کے اندر ہی واقع تھا۔ وہاں پھولوں کے جھرمٹ کے درمیان ایک لمبی چوڑی چوکی پر اشمار نے مجھے ترنگ میں جھٹکا دیا تو میں لڑکھڑاتا ہوا گر پڑا۔ چوکی پر پھول ہی پھول بکھرے ہوئے تھے۔ قریب ہی پرانے طرز کی صُراحیاں رکھی تھیں اور درختوں میں پھول جھول رہے تھے، یہ جگہ واقعی جابر بن یوسف کے شایانِ شان تھی مگر جس طرح وہ یہاں لایا گیا تھا وہ جابر بن یوسف کی اہانت تھی۔ اشمار کا رویّہ اجنبیوں جیسا تھا جیسے وہ مجھے پہچانتی ہی نہ ہو۔ وہ میرے سرہانے بیٹھ گئی اور غور سے میری آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے لگی۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں اور ان میں ہزاروں سوال مچل رہے تھے۔ اشمار اسمار میں میری منزل کی کلید تھی۔ میں نے اس سے اب تک کوئی بات نہیں کی تھی، میں اس کی وارفتگی کا خواہش مند تھا، ایسے جذبوں کا جو مدت بعد کوئی شناسا چہرہ دیکھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر اشمار نہ ملتی تو کیا ہوتا؟ میری مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ تھا مگر اشمار کی نظروں میں گزشتہ تعلق کی کوئی رمق نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ بات سوہانِ روح کا باعث تھی، میں چاہتا تھا وہ خود ہی کلام کا آغاز کرے۔ اس نے میرے لبوں سے کھیلنا چاہا تو میں نے اپنے لبوں پر عمداً سے ہاتھ رکھ لیا۔ وہ تنک گئی۔ "جابر بن یوسف!" اس نے تندی سے کہا: "اب تم میرے محکوم ہو۔"

"کس نے انکار کیا ہے؟" میں نے برجستہ کہا: "ہاں میں تمھارا محکوم ہوں، تم نے ایک صبر آزما مقابلہ کر کے مجھے حاصل کیا ہے اور مجھے احساس کہ میں توری کی سرزمین پر نہیں ہوں۔ دیوتاؤں کی اس جگہ کا نام اسمار ہے مگر میرا تمھارا ایک اور رشتہ بھی ہے۔ وہ ہے متبرک وصال کا رشتہ جو ایک بار اگر قائم ہو جائے تو ہمیشہ کے لیے قلبی تعلق پیدا کر دیتا ہے۔ ہم اجنبی نہیں ہیں۔"

"تم اسمار میں ہو اور ہمارے تمھارے درمیان ایک مکانی بُعد قائم ہے۔ یہاں میں مقدس آقابلا کی طرف سے تمھیں ودیعت نہیں کی گئی ہوں، اسمار میں مردوں کی حیثیت قانونی ہے، وہ عورتوں کے کھلونے ہیں۔" اشمار کے لہجے میں غیر متوقع مغائرت کی بُو تھی۔ "یہاں تمھارے نوادر اور تمھاری طاقت کی نہیں، تمھاری وجاہت کی طلب ہے۔ یہاں کی عورتیں خود دیوتاؤں کی اعلا طاقتوں سے مزیّن ہیں۔ ماضی کا باب بند کر کے ایک نیا رشتہ استوار کرو اور گلے لگ جاؤ۔"

"میں خود تمھیں آغوش میں سمیٹنے کے لیے تڑپ رہا ہوں۔" میں نے لہجہ بدل کے اشتیاق سے کہا: "جب تم اپنے حریف سے زور آزمائی کر رہی تھیں تو میری حالت عجیب تھی۔ کئی بار میرا ہاتھ اپنے نوادر کی جانب اُٹھ گیا تھا۔ سچ پوچھو تو مجھے یقین نہیں تھا کہ تم الیشام کے مقابلے میں جیت جاؤ گی۔ شاید تم تسلیم کرو گی کہ میں نے خلافِ روش دو مرتبہ دخل اندازی کی کوشش کی اور اس طرح تمھیں سنبھلنے کے دو مواقع فراہم کیے اور اس طرح تم الیشام کو زیر کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں تمھاری طاقت و عظمت سے منحرف ہوں۔ اسمار کی عورتوں نے مہذب دنیا کے اس مرد کو خاصا ہراساں کر دیا ہے مگر میں تم سے درخواست کروں گا کہ تم اپنا رویّہ تبدیل کر لو۔ نہیں تو پھر مجھ سے بھی اسمار کی زمین کا احترام نہ ہو گا، میں مزاحمت کروں گا۔"

"تم مزاحمت کرو گے؟ ایسا کرو گے تم بڑی ناوانی کرو گے۔" اشمار نے میری گردن پر اپنا آہنی ہاتھ رکھ کے مجھے بے بس کر دیا۔ باقی تفصیل بیان کرنے کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔

اس کی شقاوت پر میں جھرجھری لے کر اُٹھ کھڑا ہوا اور میں نے تلخی سے کہا: "اشمار! کیوں میرا خوب صورت تصوّر مجروح کر رہی ہو؟ یہ زلفیں اور رخسار میں نے پرکھے ہیں، میں تمھارے لیے ہوں اور تم مجھے جانتی ہو کہ میری سرشت میں کیسی بغاوت بھری ہوئی ہے؟ آؤ اطمینان سے بیٹھو اور مجھے بتاؤ کہ یہاں کتنی آنکھیں ہماری وابستگی سے محظوظ ہو رہی ہیں۔"

اشمار نے میری تلخیاں اس بار توجہ سے سُنیں اور اس کے بے باک ہاتھوں میں ایک جھجک سی نظر آئی۔ وہ باغ میں کچھ سوچتی رہی اور اس نے چند پتّے توڑ کر انھیں چوکی کے اِردگرد پھیلا دیا اور مجھ سے کسی قدر نرم لہجے میں رازداری سے مخاطب ہوئی: "تم یہاں تک آ کیسے گئے؟" میں اس کے محتاط انداز اور لہجے سے یہ سمجھ گیا کہ اس کا رویّہ بدلا ہوا کیوں ہے؟ میرے خشک گلے میں کسی نے رس ٹپکا دیا۔ میں نے شگفتگی سے کہا: "تم جب توری سے چلی آئیں تو میں نے ایک مدت مختلف جزیروں، صحراؤں اور غاروں میں گزاری۔ میں

تین قبیلوں کا سردار بنا اور میں اپنی شجاعت سے مقدس آقابلا کے برگزیدہ لوگوں کی صف میں شمار ہونے لگا۔ اسی اثنا میں مجھے انگرو ملک کے باغیوں نے کھینچ لیا لیکن میں نے وہاں سے بھی نجات حاصل کر لی۔ تم جانتی ہو کہ مجھے مقدس آقابلا کے خیرہ کن حسن نے پاش پاش کر دیا ہے۔ سو میں نے اس کے بیش از بیش قرب کے لیے کسی ایک جگہ قناعت نہیں کی۔ میں بھٹکتا رہا اور آخر مجھے اسمار آنے کا حکم ملا۔ تم مجھے اسمار کے اسرار سے آگاہ کرو تاکہ میں یہاں کی خوابیدہ سرزمین...." میں جوش میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اشمار نے میرے منھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

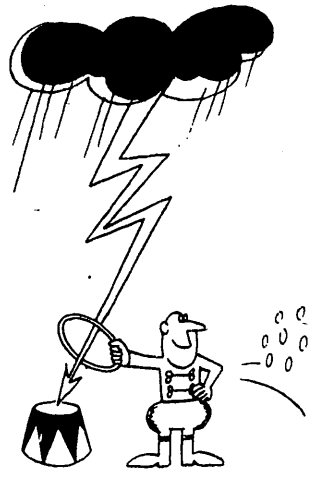

"جابر بن یوسف!" اس نے تمکنت سے کہا: "اسمار اُن سب جزیروں سے مختلف ہے جنھیں تم نے دیکھا ہے اور جن کا ذکر تم نے سُنا ہے۔ یہاں مقدس شوطار آقابلا کی نیابت کرتی ہے۔ اسے غیر معمولی صفات سے نوازا گیا ہے۔ کیا تم سوچ سمجھ کر یہاں آئے ہو؟ تمھیں معلوم ہے کہ مقدس شوطار کو ساحرِ اعظم جاملوش کی تائید حاصل ہے، اور جاملوش بیزنار میں اقامت گزیں ہے۔ جاملوش کاہنوں میں سب سے بڑا کاہن اور ساحروں میں سب سے بڑا ساحر ہے۔ اس کی آنکھیں ہر سو دیکھتی ہیں۔" اشمار نے کسی قدر خوف سے کہا۔

"میں جاملوش کی عظمت کا احوال سُن چکا ہوں۔ کیا میں یہ سمجھوں؟" میں نے ترشی سے پوچھا: "کہ تم نے میری معروضات پر ہمدردانہ غور کیا ہے؟ اور کیا میں دیوتاؤں کو درمیان میں لا کر تم پر اعتماد کر سکتا ہوں؟"

"میں اسمار میں مقدس شوطار کی بلند اقبالی کے سوا کچھ نہیں جانتی۔" اشمار کا مصنوعی انداز میری سماعت بھانپ گئی۔ میں نے گفتگو کا رُخ بدل

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

دیا۔" کیا کبھی مقدس شوطار مجھے اپنی دید کے شرف سے نوازے گی؟"

"وہ جب چاہے گی تمھیں اپنے قصر میں طلب کر لے گی۔"

"اور وہ کیوں چاہے گی؟" میں نے زیرِ لب کہا۔ "مگر میں اس سے نیاز حاصل کرنے کے لیے یہاں آیا ہوں۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

اور مجھے احساس ہوا کہ اشمار مجھ سے کھل کر بات کرنے سے پہلو تہی کر رہی ہے، وہ کہتے کہتے رک جاتی اور بے اختیار اس کی زبان پر شوطار کا نام آجاتا۔ میں نے یہ گفتگو کسی اور وقت کے لیے ملتوی کر دی اور پوچھنے لگا۔

"تمھیں پہلے کیا ہو گیا تھا؟"

اس کے خوب صورت لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ "میں تمھارا وزن کر رہی تھی۔"

"تم نے مجھے بہت پریشان کیا۔" میں نے اس کی زلفیں چوم لیں۔

"میں تمھارے سپرد ہوں۔ ابھی کیا ہے؟ میں اسمار کی نازنینوں میں تمھارے لطف کا چرچا کروں گی اور تمھیں یہاں کی ہر آسودگی سے متمتع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔"

"میں ایک متحرک شخص ہوں۔ مجھ سے ایک جگہ نہیں بیٹھا جاتا۔"

"میں تمھیں اسمار میں ہر جگہ گھماؤں گی۔ جالوکش نے اس جزیرے کا حسن اپنے سحر سے سنوارا ہے۔ میں زندگی بھر تمھارے لیے مقابلے کرتی رہوں گی۔"

"اوہ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ اسمار ہی میرا مرکز ہے؟ کیا میں یہاں ٹھیر جاؤں گا؟"

"یہاں کی زندگی تمھارے اندر اس طرح شامل ہو جائے گی کہ تم واپس جانے کا نام نہیں لو گے۔"

"تم دیکھنا۔" میں نے شوخی سے کہا۔ "بس تم میری رہبری کرتی رہنا۔"

"یہاں کے اسرار تمھارے لیے ناقابلِ فہم ہیں۔" اشمار نے خوف زدگی سے کہا۔

"میں مایوس نہیں ہوتا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اشمار کو اپنے زانو پر گرا لیا اور چوکی سے پھول بدست ہو ہو کر نیچے گرنے لگے اور ڈالیاں شرما شرما گئیں اور ہر طرف ایک خوشبو چھا گئی اور میں نے آقابلا کے فسوں خیز حسن کا تصور کیا۔ وہ تصور جو مجھ سے ہوش چھین لیتا ہے اور مجھے کچھ خبر نہیں رہتی وہ تصور جس نے جابر بن یوسف کو سحر و اسرار کی اس زمین میں زندہ رکھا اور اسے نہایت اہم شخصیت بنا دیا۔

اشمار سے دوبارہ ملاقات کی پہلی شب کا حال کیا کہوں؟ وہ مہکتی ہوئی رات بے خبری میں گزر گئی۔ صبح تک ہم ایک دوسرے میں مدغم رہے۔ صبح ہوئی تو اشمار کا اُجلا سراپا سامنے تھا اور اس کے چہرے پر سدا بہار تازگی اور شادابی تھی۔ صبح ہوتے ہی میری خدمت میں اشمار کے غلام مردوں نے نفیس غذائیں اور مشروبات پیش کر دیے لیکن ایک بے چینی سی میرے دماغ پر چھائی رہی۔ وصل کے یہ ہنگام تو توری میں میسر تھے گو وہاں خانوادۂ آقابلا کی کوئی پری جمال میرے تصرف میں نہیں تھی۔ میں نے اشمار سے کہا کہ وہ مجھے اسمار کی وادیوں اور بستیوں میں لے چلے۔ اس کے مردوں نے مجھے غسل دیا۔ پھر میرے گلے میں پھولوں کا اضافہ کر دیا گیا۔ پھر اشمار مجھے ایک شانِ ایک ادا سے آبادی کی جانب لے کر چلی۔ اس کے ہاتھوں میں میرا ہاتھ تھا اور وہ مجھ سے ایک قدم آگے کسی ہرنی کے مانند چل رہی تھی۔ میرے چہرے پر بھی مسکراہٹ طاری تھی۔ میں اپنے جلوے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ نگاہیں میری جانب اُٹھتیں اور حسرت کا اظہار کرتی ہوئی بجھ سی جاتیں۔ اسمار باغات و محلات کی زمین تھی۔ ہر طرف پہاڑ، ہر طرف وادیاں، پہاڑوں پر بنے ہوئے خوب صورت قصر اور اُبلتے ہوئے چشمے۔ مخملیں سبزہ اور مخملیں جسم۔ آب نشاط انگیز میں مخمور بدن، سیاہ و سفید کا حسین امتزاج، کہیں کوئی بڑا میدانی سلسلہ، کہیں پہاڑ ہی پہاڑ۔ میں جہاں جہاں سے گزرا میری اور اشمار کی طرف قدم اُچھالے گئے اور جگہ جگہ اشمار کے بوسے لیے گئے کیونکہ اس کے رخساروں میں میری حلاوت شامل تھی۔ مہذب دنیا میں کچھ نہیں ہے وہاں سارے نظارے مصنوعی ہیں، انھوں نے خوب صورت وادیوں، خوش رنگ نظاروں اور حسین و جمیل جسموں کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے جہاں یہ سب اکٹھے ہو جاتے ہیں وہاں تہذیب کا جبر عائد کر دیا جاتا ہے اور آدمی آدمی سے دور رہتا ہے۔ قوانین اسمار میں بھی عائد تھے مگر صرف اس قدر کہ اس طلسمی نظام میں لوگ سرشور نہ ہو جائیں۔ بہرحال میرا منصب اس وقت مہذب دنیا اور تاریک تیرۂ اعظم کی فسوں کار سرزمین کا موازنہ کرنا نہیں ہے یہ کام میں اس سرگزشت کے تمام ہونے تک اُٹھا رکھتا ہوں۔

خوش آمدید کہتے ہوئے اس غول میں فناسر بھی نظر آئی جس نے بقولِ خود سب سے پہلے مجھے اسمار میں دریافت کیا تھا اور ناظم تلراش کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ میں اشمار سے اجازت لے کر اس کی طرف بڑھا۔ اس نے بے باکانہ اپنی آغوش کشادہ کر دی اور مجھے اس میں سمو لیا۔ پھر میرا یہ وتیرہ ہو گیا کہ میں مختلف مرکزوں اور جگہوں پر اشمار سے اجازت لے کر تشنہ کام ہونٹ سیراب کرتا اور تڑپتی آغوشوں میں گداز تقسیم کرتا۔ اس میں اشمار کی برتری اور عالی ظرفی کا ایک پہلو نکلتا تھا۔ چنانچہ وہ مجھے فراخ دلی سے اجازت دیتی تھی۔ پہلا دن اسی کھیل تماشے میں گزر گیا۔

رات کو اشمار مجھے اسمار کے شبستانوں میں لے گئی۔ میں ناظموں کی جلوہ گاہ کی شرربایاں بیان کر چکا ہوں۔ مجھے بیروت، پیرس اور قاہرہ کے پُرشکوہ عشرت کدے یاد آ گئے۔ بس فرق یہ تھا کہ یہاں عورتوں کو بالادستی حاصل تھی اور داخلے پر کوئی ٹکٹ نہیں تھا۔ یہاں بھی میں نے اپنی عشرتیں عام کیں اور ایک آغوش سے دوسری آغوش میں منتقل ہوتا رہا۔ میں نے کئی عورتوں کو اُٹھا لیا اور انھیں وسیع ہال میں گھماتا رہا۔ وہ اس کھیل سے بہت محظوظ ہوئیں کیسی مرد سے وہ اتنی طاقت کی توقع نہیں رکھتی تھیں، ان کی نظروں سے حیرت ہویدا تھی۔

اور پھر یوں ہی کئی راتیں گزر گئیں کئی دن گزر گئے، مجھے اشمار نے بتایا کہ اب شبستانوں میں میری وجاہت میرے حسن میرے جمالیاتی برتاؤ کا ذکر خوب دھوم سے ہو رہا ہے اور میں نے بہت کم مدت میں اسمار کی نازنینوں کے دل میں گھر کر لیا ہے۔ وہ میری وجاہت سے متاثر ہیں اور میرے طرزِ عمل کی والہ و شیدا ہیں۔ میں نے یہ دن اسمار کا چپا چپا دیکھنے میں صرف کیے اور ساتھ ہی اسمار کی روایتوں میں ایک دلچسپ تغیر پیدا کرتا رہا۔

رات کے آخری پہر جب ہم تھکے ہارے اپنی اقامت گاہ میں لوٹتے تو میں اشمار سے اسمار کے بارے میں کرید کرتا۔ میرے اصرار سے اشمار تنگ آ گئی تھی، اس نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں میری کوئی اعانت نہیں کر سکتی لیکن اتنی بات ضرور جابر بن یوسف کے ذہنِ رسا میں آ گئی تھی کہ اشمار شوطار سے کبیدہ خاطر ہے اور مقدس آقابلا کا ذکر احترام سے کرتی ہے جب کہ اسمار میں لوگ آقابلا کا ذکر صرف گاہے گاہے کرتے تھے ہر زبان پر شوطار کا نام رہتا تھا۔ اشمار کسی پہلو میرے سوالوں کے دام میں نہیں آتی تھی اور مجھے کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ میں یہاں ماہِ عسل منانے نہیں آیا تھا میرے پاس ایک ہی ذریعہ تھا کہ میں اشمار کو تنگ کروں۔ میں اسے تنگ کرتا رہا اور اشمار کی صحبت سے کم از کم مجھے اتنا فائدہ ضرور تھا کہ میں آزادی کے ساتھ گھوما کرتا تھا اور نازنینوں کے دلوں پر اپنے گہرے نقش بٹھایا کرتا تھا۔ اسمار میں کوئی سرگرمی دکھانے سے پہلے اس کے مشاہدے اور مطالعے کے مرحلے سے گزرنے کا کام ضروری تھا۔ یہ مشاہدہ جان کا عذاب ہو جاتا ہے۔ اتنے دنوں میں مجھے صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ میں نے اپنی شناخت اسمار کی طرب گاہوں میں خوب کرا دی۔

اسمار کا سفر باگمان اور توری سے مختلف تھا، مجھے خوش قسمتی سے وہاں دوسری طاقتوں کی مدد حاصل ہو گئی تھی مگر اسمار میں ابھی تک میں کوئی ایسا گوشہ ڈھونڈنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا جہاں میرے بہی خواہ ہوتے جن سے میں اسمار کے طلسمی رموز و اسرار کے معانی سمجھ سکتا۔ توری میں سموال تھا، سرنگا تھا، انگروما میں نیشا اور کیشا تھیں، گرمے تھا گرونا تھا۔ باگمان میں کاہو کی روح نے میری مدد کی تھی اور اسٹالا نے مجھے اکسایا تھا۔ یہاں صرف اشمار تھی جس پر اسمار کا سحر اتنا غالب تھا کہ وہ اس ذکر ہی سے گریز کرتی تھی پھر میں نے اشمار سے اجازت لے کر راتوں کو تنہا گھومنا شروع کر دیا۔ میں ناظم تلراش کے پاس بھی گیا اور میں نے دوسری ناظموں کے بہشت بدن کی گلچینی بھی کی، یہ ایک دلچسپ مہم تھی کہ اسمار کی تمام عورتوں کی قربتیں حاصل کی جائیں اور اس امر پر فخر کیا جائے کہ میں نے دنیا کی حسین عورتوں سے لذت کشی کی ہے میری اس مہم کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ میری خوش دلی و فیاضی سے متاثر ہو کے وہ مجھے چند مبہم نشانات کا پتہ بتا سکیں، وہ تو وصال کے سوا کچھ جانتی ہی نہیں تھیں، بہرحال میں کسی سراغ رس کی طرح راستے سونگھتا رہا اور اسی دوران میں مجھے فناسر سے معلوم ہوا کہ اسمار میں ایک بڑی عبادت گاہ ہے جہاں کا سحر سب سے اونچا ہے اور مقدس شوطار کے قصر میں نصب عکس نما پتھر میں عبادت گاہ کی عمارت اوجھل رہتی ہے۔ فناسر نے مجھے بتایا کہ جب اسمار میں کسی کو ناانصافی کی شکایت ہوتی ہے تو وہ اسی عبادت گاہ کا رُخ کرتا ہے اور دیوتاؤں کے ذریعے شوطار کی توجہ اپنی جانب منعطف کراتا ہے۔ یوں بھی اس عبادت گاہ کی بڑی فضیلتیں ہیں، یہاں اسمار کی جلیل القدر کاہنائیں ریاضت و عبادت میں مصروف رہتی ہیں اور شوطار کے لیے دیوتاؤں کو راضی رکھنے کا کام سرانجام دیتی ہیں۔

اس رات میں نے اشمار سے تذکرہ کیا کہ وہ مجھے اسمار کی عبادت گاہ میں لے چلے، اشمار اس ذکر پر حیرت زدہ رہ گئی اور چراغ پائی سے اس نے مجھے منع کر دیا۔ مگر میں نے آقابلا کے واسطے دے کر اُسے راضی کر لیا اور وعدہ کیا کہ اسمار میں جب کبھی میں کوئی مشکوک قدم اُٹھاؤں گا تو اُسے ضرور مطلع کروں گا۔ میں رات بھر اشمار کو آمادہ کرنے کے لیے اس کی خوشنودی حاصل کرنے میں مصروف رہا اور صبح اپنے زاد و سجا کر اشمار کے ساتھ اسمار کی آبادی سے دور ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع عبادت گاہ کی طرف چلا۔ عبادت گاہ کی

شراب

کی خالی بوتلیں مسہری کے نیچے پڑی ہوئی تھیں، باپ کمرے میں داخل ہوا اور مسہری کے نیچے خالی بوتلیں دیکھ کر بیٹے سے سوال کیا۔ "جب میں نے تمھیں شراب نوشی سے منع کیا تھا تو پھر یہاں خالی بوتلیں کیوں پڑی ہیں!"

لڑکے نے حیرت سے خالی بوتلوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس بات پر تو میں بھی حیران ہو رہا ہوں کہ میں کمرے میں خالی بوتلیں لے کر کبھی بھی نہیں آیا، پھر یہ کہاں سے آگئیں؟"

وقار عظیم پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

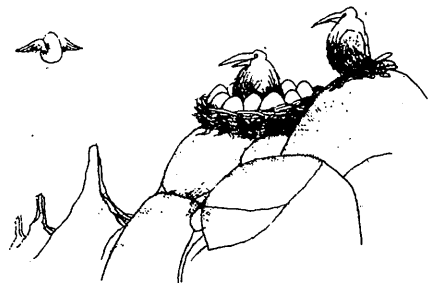

عمارت کا جو خاکہ میرے ذہن نے فناسر کی گفتگو سے مرتب کیا تھا، وہ اسی کے مطابق تھا۔ سرخ و سفید پتھروں کی اس عمارت میں قدیم ہیکلوں کی سی شان و شوکت تھی۔

عبادت گاہ پوری پہاڑی پر پھیلی ہوئی تھی، وہ عمارت بالکل نئی نظر آتی تھی جیسے اسے کل ہی بنایا گیا ہو۔ وہاں جگہ جگہ مجسمے اور جانوروں کی شبیہیں ایستادہ تھیں اور بڑے بڑے کمروں میں بُت خانے بنے ہوئے تھے، ہر طرف زنانِ اسمار اور سیاہ فام مردوں کی ٹولیاں گھوم رہی تھیں، ایک عجیب قسم کی لطیف خوشبو سے ساری فضا آلودہ تھی۔ اشمار مجھے سب سے بڑی عمارت میں لے گئی جس کے در و دیوار پہ وصال کے مختلف مناظر بڑی خوب صورتی سے کندہ کیے گئے تھے اور قدِ آدم مورتیوں کے ستونوں پر عمارت اٹھی ہوئی تھی۔ جارا کاکا کے ایک بڑے مجسمے کے سامنے جاکے اشمار رک گئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پیٹھ پر کر لیے اور مورتی کے سامنے جھک گئی۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ دیوتا بت کے کھلے ہوئے منہ سے دھواں نکل رہا تھا جو تمام عبادت گاہ معطر کر رہا تھا۔ اشمار دونوں ہاتھ پھیلا کر ایک گوشے میں کھڑی ہو گئی اور اس نے خانوادۂ آقابلا کی کنیزوں کے سے تاثر انگیز انداز میں کہا۔ ”مقدس جارا کاکا! میں اس سرکش مرد کو تیری خدمت میں لائی ہوں، اسے بتا کہ تو شوطار کو پسند کرتا ہے اور میری رہبری کر کیونکہ میں فیصلے کی قوت سے محروم ہوں، میں نے اسے تیری طاقتوں کے طفیل حاصل کیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ اسے اسمار کا پروانہ مقدس آقابلا نے عطا کیا ہے۔ مجھے اس عذاب سے بچا جو اس کے فتنہ جو دماغ میں میرے لیے ہے۔“

اشمار عاجزی کے ساتھ جارا کاکا کے مجسمے کے سامنے دعا گو تھی۔

جب وہ خاموش ہوئی تو میں نے اس سے کہا۔ ”شوطار کے عکس نما ہیں جارا کاکا کی یہ عبادت گاہ اوجھل رہتی ہے، بس اے میری ہم نشیں! کسی خوف کے بغیر مجھے بتا کہ میں صدیوں بعد اسمار میں انقلاب برپا کر کے مقدس آقابلا کی خوشنودی کس طرح حاصل کر سکتا ہوں؟“

اشمار کے چہرے پہ ویرانی چھا گئی۔ وہ دوبارہ جارا کاکا سے مخاطب ہوئی۔ ”مقدس جارا کاکا! اسے راستی کا راستہ دکھا۔ ورنہ آسمان سے کہہ دے کہ وہ اس پہ بجلی گرا دے۔“

میں نے اشمار کو کھینچ لیا۔ ”اگر جارا کاکا کو میری اعانت منظور نہیں تو میں یہاں سے ناکام واپس ہو جاؤں گا۔ اشمار تم کیوں خوف زدہ ہوتی ہو؟ کیا تم جارا کاکا کی اس عبادت گاہ کی پناہ میں بھی شوطار سے ڈرتی ہو؟“

”تم چاہتے کیا ہو؟“ وہ اداس آواز میں بولی۔

”میں شوطار سے اسمار کا اقتدار چھین لینا چاہتا ہوں۔“

”نہیں نہیں۔ شوطار دیوتاؤں کی پناہ میں ہے۔“

”اوہ اشمار۔ مقدس آقابلا کی کنیزِ خاص۔ کیا اس عبادت گاہ میں بھی مصلحتیں تمہارے دماغ سے وابستہ رہیں گی؟ یقین رکھو، یہاں جارا کاکا کے سوا کوئی کچھ نہیں سن رہا ہے۔ تم یہاں آزادی سے گفتگو کر سکتی ہو۔ کاش تم نے اس جگہ کا پتہ پہلے بتا دیا ہوتا۔“ میں نے اسے جھنجوڑ کر کہا۔

”دیوتا مجھے معاف کریں جابر بن یوسف! تم یہاں کی زمینوں اور آسمانوں سے واقف نہیں ہو۔ تمھیں شوطار کی طاقت کا بھی اندازہ نہیں ہے۔ آقابلا نے اسے اپنی نیابت دیوتاؤں کی ایما ہی پر تفویض کی ہوگی۔ پھر شوطار نے خود دیوتاؤں سے رابطہ قائم کر لیا۔ اس نے ایک بہترین نائب کے فرائض حسن و خوبی سے انجام دیے، اب وہ مقدس آقابلا کی قلم رو میں ہونے کے باوجود محض رسمی طور پر اس سے وابستہ ہے۔“ اشمار نے اپنی مخفی گفتگو میں بھی کئی نکتہ رس باتیں مجھے بتا دیں۔

”اور اسی لیے اس نے تین جزیروں کے ذہین اور جری سردار جابر بن یوسف کو اسمار بھیجا ہے کہ وہ شوطار سے عنانِ اقتدار چھین لے، اس نے اپنے ایک اعلا غلام کی آزمائش کا کیا خوب عذر تراشا ہے۔ کیا میں اسے مایوس کر دوں؟“ میں نے اشمار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

وہ میرے جوشیلے لہجے سے گھبرا گئی اور کہنے لگی ”تمھارے لیے یہ مشکل ہے، ممکن ہے وہ یہ نہ چاہتی ہو اور یہ محض تمھارا قیاس ہو۔“

”میں اس کے قرب کے لیے یہ کارنامہ ضرور انجام دوں گا چاہے اس میں میری تمام عمر صرف ہو جائے۔“ میں نے ولولے سے کہا۔ ”اور اگر میں غلطی پر ہوں تو یہ دیوتا مجھے اس کا خمیازہ بھگتنے میں کوئی رعایت نہیں دیں گے اور میں دیوتاؤں کو اپنے حق میں آمادہ کرنے کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کروں گا۔“

”اسرار و طلسم کے اس کارخانے میں تم اپنے قدم جمانے کے باوجود ابھی بہت دور کھڑے ہو۔“ اشمار نے کرب سے کہا۔

”سنو اشمار!“ میں نے اس کا بازو پکڑ کے کہا۔ ”کیا تم مجھے آزاد کر سکتی ہو؟“

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ ”پھر تم کیا کرو گے؟“

”میں یہیں سے اپنے کام کا آغاز کروں گا، میں اس عبادت گاہ میں بیٹھ کر ریاضت کر کے دیوتاؤں سے اپنی برتری تسلیم کراؤں گا اور انھیں اپنے حق میں ہموار کروں گا۔“

”اگر کوئی مرد اس عبادت گاہ میں پناہ حاصل کرے تو اسمار کی عورتیں اس سے دست بردار ہو جاتی ہیں۔ میں مقدس آقابلا کے لیے تمھیں آزاد کر سکتی ہوں۔“

”شجاعت اور ذہانت کے کھیل اسے پسند ہیں۔ تم مجھے اس اجنبی سرزمین میں ایک موقع فراہم کر رہی ہو۔ میں تمھارا یہ احسان کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ تمھارا یہ اقدام یقیناً مقدس آقابلا کو مرغوب ہوگا۔“ وہ سہمی ہوئی تھی۔ میں نے سرگوشی میں ایک چبھتی ہوئی بات کہی۔ ”میرا خیال ہے۔ اس نے تمھیں یہاں اسی لیے بھیجا ہوگا کہ تم اسمار میں مقدس آقابلا کے نام نامی کا اعادہ کر کے مجھ سے کھل کر بات کر و اے عزیزۂ گرامی!“

”تم سچ کہتے ہو۔“ وہ تعجب سے بولی۔ ”معلوم ہوتا ہے تم نے توری میں سرداری کے سوا حصولِ علم میں بھی وقت گزارا ہے، ہاں وہ شوطار سے ناخوش معلوم ہوتی ہے۔“

”اور وہ اس کی دست برداری کے احکام بھی ریہنائے مصلحت صادر کرنے سے قاصر ہے۔ کیوں؟“

”میں نہیں جانتی ایسا کیوں ہے؟ شاید وہ کسی نیک وقت کی منتظر ہو، ممکن ہے اسے بہتر شگون نہ ملا ہو اور اس کی سماعت اچھی پیش گوئیاں سننے سے محروم رہی ہو اور اس نے حالات کا جوں کا توں رہنا قبول کر لیا ہو۔“

میں نے کسی خوف و خطر کے بغیر اشمار سے ناگفتنی باتیں بیان کر ڈالیں۔ ان باتوں سے میری استقامت میں ایک نیا جوش پیدا ہوا۔ میں نے اس کے آتشیں رخسار کا بوسہ لے لیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ گاہے گاہے آتی رہا کرے کیونکہ میں ایک نامعلوم

”جنابِ والا!

میں فکری اعتبار سے ایک بڑا آدمی ہوں لیکن کامیابی کے اعتبار سے نہایت معمولی بلکہ ناکام انسان، آخر اس کا سبب کیا ہے؟“ پریشان اور ناکام نوجوان نے اپنے اُستاد سے سوال کیا۔

اُستاد نے شاگرد کے چہرے پر پڑی ہوئی ناکامی کی سلوٹیں غور سے دیکھیں

”اگر سمندر کسی طرح بیچ سے کاٹ دیا جائے تو اس کا کیا حشر ہوگا؟“ اُستاد نے سوال کیا۔

شاگرد نے جواب دیا۔ ”سمندر کے کٹے ہوئے دونوں حصوں کا زور کم ہو جائے گا اور اس کی سرکش قوت میں ضعف آجائے گا۔“

استاد نے جواب دیا۔ ”بعینہٖ یہی حال اس شخص کا ہوتا ہے جو اپنے مقصد کے ٹکڑے کر دیتا ہے، یاد رکھو۔ کامیابی کو انتشار سے دشمنی ہے اور ان دونوں کو کبھی ایک جگہ نہیں دیکھا جا سکتا۔“

مدت کے لیے عبادت گاہ ہی میں رہوں گا۔ اشمار کے چمکتے ہوئے چہرے کی روشنی بجھنے لگی، وہ مجھ سے وعدہ کر کے دل گرفتہ چلی گئی۔ میں تنہا رہ گیا۔

عبادت گاہ کے اس ایوان سے باہر آکے میں نے اس وسیع و عریض پہاڑی کے گوشے گوشے سے آگاہی حاصل کی اور ایک چھوٹی عمارت کے خاموش گوشے کو اپنا مستقر بنا لیا۔ میرا سلسلۂ خیال اب کسی حد کا پابند نہیں تھا، خیال کا اسپ بے لگام خلاؤں میں اڑ رہا تھا۔ اسمار میں اس عبادت گاہ سے نقطۂ آغاز نظر آتا تھا، آقابلا نے شرادڈ کے معاملے میں مجھے زنداں میں ڈال دیا تھا اور خود تین مہینے کے لیے برہنہ جسم کے ساتھ عبادت میں مصروف ہو گئی تھی پھر جب اس کی عبادت کی مدت ختم ہوئی تھی تو کاہنِ اعظم سموراں نے مجھے اسمار آنے کا حکم دیا تھا۔ کیا وہ سب میرے اسمار آنے کے سلسلے کی ایک کڑی تھی؟ کیا آقابلا نے تاریک برِ اعظم میں صرف مجھے اس اہم کام کے لیے موزوں ترشخص سمجھا تھا؟ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے مجھے قریب سمجھا اور میری طلب نے اثر کیا؟ آہ آقابلا۔ تیرا غلام تیرے لیے کیا نہیں کر سکتا؟ بس ذرا التفات کی ایک نظر تو کر۔ بس ایک لمسِ جاوداں کی بخشش دے دے اور پھر اپنے ہاتھ سے میری شہ رگ کاٹ دے۔ اس کے بعد کسے زندہ رہنا ہے؟ اور کون زندہ رہ سکتا ہے؟

میں نے اپنے سامنے آگ روشن کر لی۔

میرے سامنے آگ روشن تھی اور میں زراشی کے صحرا کے عمل کا ورد کر رہا تھا۔ میں نے شپالی آگ میں ڈال دی، اس کے لیے یہی

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

مناسب جگہ تھی۔ آگ خود بخود روشن رہی اور میں اُس سے کھیلتا رہا اور اس روشن آگ کے سامنے شب و روز گزرنے رہتے رات کو میں بڑے ایوان میں جارا کا کا کے مجسمے کے سامنے چلا جاتا اور صبح اپنے مستقر پر واپس آجاتا۔ رفتہ رفتہ عبادت گاہوں کے مستند کاہنوں نے میری ریاضت دیکھ کے میری جانب توجہ دینا شروع کیا اور میرے جذبِ کامل سے متاثر ہو کے مجھے مشترکہ عبادت میں شامل کر لیا۔ یہیں میرا ربط ضبط دیوتاؤں کے ان برگزیدہ خدمت گزاروں سے ہوا۔ ان میں مہ جمال کاہنائیں بھی تھیں اور بوڑھے عبادت گزار بھی۔ پھر عبادت گاہ کے زائرین دوسرے کاہنوں سے سعادت سمیٹنے کے اطوار میں میرے پاس بھی خیر و برکت کے لیے آنے لگے اور میرے سامنے جلتی ہوئی آگ میں پھول نچھاور ہونے لگے۔ دن بھر زائرین کا تانتا بندھا رہتا مگر میں ان تمام لوگوں سے بے نیاز ہو کے اپنے آپ میں گم رہتا۔

شوطار عبادت گاہ میں میرے مستقل قیام پر یقیناً برہم ہوتی ہوگی میں نے اسسار کے قوانین کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا تھا اس لیے میں مطمئن تھا، عبادت گاہ کے کسی معاملے پر شوطار کو اختیار نہیں تھا۔ شکست خوردہ اور پریشاں حال زائرین شوطار کے خوف سے بے پروا ہو کے یہاں آتے اور دیوتاؤں کے سامنے مطالبے پیش کر دیتے۔ عبادت گاہ میں جنس کو ایک مقدس درجہ حاصل تھا، چنانچہ وہ کسی امتناع کے بغیر جارا کا کا کے مجسمے کے سامنے جنسی افعال کا مظاہرہ کرتے۔ کبھی کبھی کاہن اور کاہنائیں بھی اس عمل میں شریک ہو جاتیں۔ یہ ان کے لیے کوئی غیر معمولی مظاہرہ نہیں تھا۔ کئی دن بعد اشمار بھی عبادت گاہ میں داخل ہوئی اور اس نے جارا کا کا کے مجسمے کے سامنے مجھ سے وصال کی تمنا ظاہر کی۔ میں انکار کی جرأت نہیں کر سکا حالانکہ میری طبیعت اُس ماحول میں ایسے فعل سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ کاہن خود کبھی پیش قدمی نہیں کرتے تھے لیکن وہ دستِ زن خوار ٹھکراتے بھی نہیں تھے، یہی حال کاہناؤں کا تھا، وہ کسی تشنہ کام مرد کی خواہش پر اسے وصال کی لذت سے سرشار کرتی تھیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ دیوتاؤں نے انھیں خلق کی آسودگی کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ ان کی عبادت کا ایک حصہ ہے۔ اشمار نے مجھے بتایا کہ جزیرۂ اسسار کی ناظموں نے مجھے آزاد کرنے پر اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھا لیکن چونکہ یہ عمل اسسار کی روایتوں کے مطابق تھا اس لیے انھوں نے اشمار سے کوئی جرح بھی نہیں کی۔ میں نے شوطار کے محل کا حال پوچھا، اس نے بتایا کہ حسن و جمال میں آقابلا کے بعد شوطار کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اشمار آسودہ ہو کے چلی گئی اور وداع کے وقت اس نے پھر مجھے متنبہ کیا کہ میں جذبات اور عجلت میں کوئی قدم اُٹھانے سے گریز کروں۔ میں نے اشمار سے کہا کہ وہ مجھے عبادت گاہ سے باہر ہونے والے ہر تغیّر سے مطلع کرتی رہے اور اطمینان رکھے کہ اگر دیوتاؤں کو شوطار کی معزولی منظور ہے تو اسے کوئی طاقت نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

❋

عبادت گاہ کا عظیم الشان کاہنِ اعظم قرسام میری فصاحت، میرے اطوار اور میری ریاضت سے اس قدر متاثر ہوا کہ مجھے رات کو عبادت گاہ کے خاموش علاقوں میں لے گیا اور اس نے مجھے سمورال کی طرح سرپرستانہ انداز میں حیرت انگیز طلسمی اعمال کی تربیت دینے کا آغاز کیا۔ قرسام کی توجہ کا حصول ایک دقت طلب کام تھا، جابر بن یوسف ہی یہ سخت گزش مرحلہ طے کر سکتا تھا۔ قرسام کی اعانت دیکھ کے میں نے اپنی شدت اور ریاضت بڑھا دی اور ہر لمحے اس کے تعاقب اور خدمت میں رہنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے جلد ہی اس کے عزیز نائب کی حیثیت اختیار کر لی، یہ شخص بڑا نیک نفس ذہین اور شجیع تھا۔

میں غالباً عبادت گاہ کی مشقت کا حال بیان کرنے میں کوتاہی کر رہا ہوں۔ قرسام ہی کا معاملہ لیجیے۔ قرسام کے حصول کے لیے ایک بڑا وقت صرف ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے سامنے عجیب و غریب مظاہرے کیے۔ تب کہیں جا کر اس کی جوہر شناس نگاہ میری جانب اٹھی اور ٹھہر گئی۔ میں نے ان محیر العقول واقعات کے اظہار میں عجلت سے کام لیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سنسان علاقوں اور ویران راتوں میں بیٹھ کے دل پر جو کیفیت گزرتی تھی، اسے وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو ان حادثات سے وابستہ رہ چکا ہو۔ بہر حال میں نے ایک مدت گزار کے عبادت گاہ سے اوپر پہاڑ پر جا کے تن تنہا ایک جگہ پڑاؤ ڈال دیا۔ یہاں مخالف ہوائیں چلنے لگیں اور نادیدہ طلسمی قوتوں نے مجھے ہیجان میں مبتلا کر دیا۔ کہیں بدہیئت اور مہیب ہیولے میرا سکون درہم برہم کرتے، کہیں خوفناک آوازیں مجھ پر حملہ آور ہوتیں، کہیں نوچنے کھسوٹنے والے جنگلی پرندے میرے گرد پرواز کرتے، کہیں سے بین کی آوازیں میری شقی القلبی کا امتحان لیتیں اور کبھی چنگاریاں سی میری جانب لپکتیں۔ ان تمام ہولناکیوں کے باوجود میں ایک پتھر کی طرح اپنی جگہ ایستادہ رہتا اور آخر کاہنِ اعظم قرسام کے حکم سے میں چند عشرے وہاں گزارنے کے بعد واپس عبادت گاہ میں آگیا۔ قرسام مجھے اپنے قریب بٹھانے لگا اور میں نے اس کے سامنے خود کو ایک ایثار پیشہ شاگرد ثابت کیا۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

پھر ایک دن جب میں جارا کاکا کے مجسمے کے سامنے نرا رشی کی ابدی آگ جلائے بیٹھا تھا اور میرا چوبی اژدہا میں کار ڈھے آگ کے گرد مستانہ رقص کر رہا تھا، میرے پاس اشمار آئی اور میری آغوش میں جھول گئی اور اس نے مجھے بتایا کہ شوطار نے اپنی نازنینوں کا ایک پُر اہتزین تحائف کے ساتھ ساحرِ اعظم جالوش کی خدمت میں روانہ کیا ہے اور اگلی چاندرات میں شوطار نے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے ایک جشن کا اعلان کیا ہے جسے جشنِ بہار کا نام دیا گیا ہے۔

میں اشمار سے یہ اطلاع سننے کے بعد ایک تاریک علاقے میں بیٹھ کر اپنے آپ سے ہم کلام رہا اور میں نے قرسام کی خدمت میں حاضری دی اور اس سے عبادت گاہ سے باہر جانے کی اجازت طلب کی۔ قرسام میری اچانک آمد پر جزبز ہوا اور اس نے مزید چار روز قیام کا حکم دیا۔ میں نے قرسام کی بات مان لی اور قرسام نے ان چار دنوں میں مجھ سے اذیت ناک مشقیں کرائیں۔ اس نے اپنے حجرے میں بند کر کے مجھے بدذائقہ غذائیں کھلائیں اور کسیلے کڑوے مشروبات سے میری تواضع کی، وہ میرے جسم پر ایک خاص قسم کا تیل چھڑکتا رہا اور اس نے مجھے کسی رات سونے نہیں دیا اور اپنے حجرے میں لٹکے ہوئے متعدد سانپوں اور اژدہوں سے مجھے جگہ جگہ سے ڈسوانے کا تکلیف دہ عمل جاری رکھا۔ کئی چوبی بزدلیلوں نے متحرک ہو کے میرے جسم میں ٹھونگیں مار مار کے مجھے لہولہان کر دیا۔ چار روز بعد جب میں اس حجرے سے باہر نکلا تو میری آنکھیں غنودہ تھیں اور قدم ڈگمگا رہے تھے۔ کاہنوں نے مجھے احترام سے رخصت کیا اور میرے گلے میں موتیوں کا ہار ڈال دیا جو اس بات کی سند تھی کہ میں نے اس عبادت گاہ میں کاہنوں کو خوش کیا ہے اور میری ریاضت کے صدق میں کوئی اشتباہ نہیں ہے۔ میں عبادت گاہ سے چلتا ہوا امسار کے محلات میں داخل ہوا۔ اپنی شکستہ حالی اور پس ماندگی کے باوجود میرا ذہن مستقبل کے منصوبوں کے تانے بانے بن رہا تھا۔ راستوں میں حسین عورتوں نے جگہ جگہ میری پذیرائی کی اور میرے جسم پر شراب پھینکی۔ میں مسکراتا ہوا گلیوں سے گزرتا رہا۔ سب کو معلوم تھا کہ اشمار نے مجھے حاصل کیا ہے لیکن میرے قدم اشمار کے محل کی طرف نہیں اٹھ رہے تھے۔ مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں؟ یا مجھے کہاں جانا چاہیے؟ میرے پیچھے پیچھے عورتوں کا ایک جلوس چلنے لگا۔ پھر اچانک میں نے مڑ کے ان سے دریافت کیا۔ ”ناظم الیشام کا علاقہ کون سا ہے؟“

”آؤ میرے ساتھ۔“ ان میں سے کئی نے بیک وقت کہا۔

”چلو مجھے ناظم الیشام کے محل میں پہنچا دو۔“ میں نے ان سب کو فریب کرتے ہوئے کہا۔

”آہ۔ تم کتنے وجیہہ ہو۔“

”تمھیں مقدس شوطار کے محل جانا چاہیے۔“

میں مسکراتا ہوا ان کی جلو میں الیشام کے محل تک گیا۔ الیشام کے محل کی سیاہ فام دربان کنیزوں نے میرا راستہ روک دیا، مجھے اس وقت تک باہر رکنا پڑا جب تک اندر سے باریابی کی اجازت نہ مل گئی۔ ایک مرصّع کمرے کے دروازے پر مجھے حیرت زدہ الیشام نظر آئی۔ اس کی آنکھوں میں تجسّس تھا۔ میں نے نہایت احترام سے اسے مخاطب کیا۔

”معزز ناظم الیشام! اشمار سے آزاد ہونے کے بعد میں عبادت گاہ میں چلا گیا تھا۔ وہاں سے سیدھا تمھارے پاس آ رہا ہوں۔ تم نے میرے لیے جنگ کی تھی اور میں سمجھتا ہوں، اشمار کے بعد تمھی مجھ سے قریب ہو۔“

اشمار کو شاید اپنی سماعت پر شبہ تھا۔ وہ گنگ ہو گئی اور اس نے میرے سراپا کا بغور جائزہ لیا۔ یقیناً اسے وہ ہار بھی نظر آیا ہو گا جو میرے گلے میں امسار کی عبادت گاہ کے کاہنوں نے ڈال دیا تھا۔ اس نے اپنے غلام مردوں کو اشارہ کیا۔ انھوں نے مجھے اندر ایک نشست پر بٹھا دیا اور پتھر کی تھالی پر رنگ برنگے مشروبات میرے سامنے پیش کر دیے۔ الیشام مجھے تک رہی تھی۔ میں نے اس کی حیرت دور کرنے کے لیے کہا۔ ”میں اب خود تمھارے پاس آ گیا ہوں کیوں کہ اشمار مجھ سے کنارہ کش ہو گئی ہے۔ آؤ میرے لبوں پر اپنی محبتوں کی مہر ثبت کر دو۔ تمھاری طاقت نے میرے دل کے نہاں خانے میں اپنا رنگ جمایا ہے۔ ہر چند کہ یہ مقابلہ اشمار نے جیتا تھا مگر تم نے اپنی قوت کا بے مثال مظاہرہ کیا تھا۔“

”جابر بن یوسف!“ وہ پُر تجسّس آواز میں بولی۔ ”میں تمھاری آمد پر بے حد شاداں ہوں، مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم از خود میرے پاس آ گئے ہو۔“

”میں تمھارے سامنے بیٹھا ہوں، مجھے امسار میں رہنے کا طریقہ نہیں آتا کیوں کہ میں نے یہاں کے نشاط کدوں میں چند ہی دن گزارے تھے پھر میں عبادت گاہ میں چلا گیا تھا اور اب میری خواہش ہے کہ تم مجھ سے سلوک میں مجھے میری سابق عادتوں کی رعایت ضرور دو کہ میں امسار میں نو وارد ہوں اور وہاں سے آیا ہوں جہاں مردوں کو برتری حاصل ہے۔“ کہتے کہتے میری آواز جذبات میں ڈوب گئی۔

اس کے نازک لب پھڑپھڑانے لگے اور اس کے شہابی رخساروں پر شفق کا رنگ گہرا ہو گیا۔ اس کے ہاں جھجک تھی، میں نے خود بڑھ کے اس کی جھجک دور کر دی۔

”روحِ الیشام!“ اچانک وہ پھٹ پڑی۔ ”اور قریب ہو جاؤ۔ آہ میرے لیے یہ تصور ہی روح فرسا تھا کہ تم اشمار جیسی حقیر عورت کے قبضے میں ہو، تمھیں تو کسی ناظم کے محل کی آرائش بننا چاہیے تھا۔ امسار کے بے شمار خوبصورت مرد میری قربتوں میں سما چکے ہیں۔ لیکن تم۔ تمھارے لمس میں ایک سحر ہے۔“

”مجھے معلوم تھا تم میری قدر کرو گی، مجھے صدمہ ہے کہ یہاں پہلے پہل میرے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا۔ میں نے امسار کی روایتوں کا احترام کیا، ورنہ میں اپنے نوادر سے انھیں داغ دار کر دیتا۔“

الیشام لمحوں میں جنون کی حدیں چھونے لگی اور میں نے سب کچھ گوارا کر لیا کیونکہ شوطار تک پہنچنے کے لیے الیشام کا ذریعہ ہی سب سے کارگر معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس دن کچھ نہیں کہا۔ اس کے پھول دار بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔

اور اسی عالم مدہوشی میں امسار کی رات آ گئی۔

میں اپنی فریفتگی اور شیدائیت سے الیشام کے دل میں اعتماد کا بیج ڈال چکا تھا، رات تک جذباتی کشمکش اور معاملاتِ نشاط کے سبب یہ بیج نمو پانے لگا۔ ایسے معاملات ہی تمام عاقبت اندیشیوں اور مصلحت کوشیوں سے بالاتر ہوتے ہیں۔ الیشام تو یوں بھی کچھ دیوانہ طبیعت کی عورت تھی اور پھر میرے سلسلے میں اس نے بڑی ندامتیں اٹھائی تھیں، بڑے دکھ سہے تھے۔ جب میں اس کے سامنے پہنچا تو وہ گم سی ہو گئی، اسے ہوش ہی نہ رہا کہ اپنے اردگرد بھی نظر ڈال لے۔

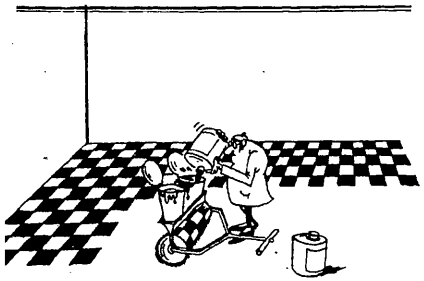

چنانچہ رات کو جب میں نے اس سے ناظموں کی خصوصی نشست گاہ میں جانے کی خواہش ظاہر کی تو وہ کچھ اکراہ کے بعد آمادہ ہو گئی کیوں کہ اسے میری خاطر بہر طور عزیز تھی، میں امسار میں صرف اس کے پاس آیا تھا، اس نے میرے جسم پر خوشبوئیں چھڑکیں اور اپنے غلام مردوں کے ہمراہ مجھے اس محل میں لے گئی جہاں رات کو امسار کی تمام ناظموں کا اجلاس ہوتا تھا۔ اجلاس کیا ہوتا تھا، لطف و سرور کا بازار سجتا تھا اور حصولِ لذت کے نئے نئے ہنگامے برپا کیے جاتے تھے۔ عورتیں اور مرد باہم رقص کرتے تھے۔ الیشام کے ہمراہ مجھے دیکھ کے امسار کی ناظموں کے چہرے عجیب کیفیت کی غمازی کرنے لگے۔ میں نے ایک ادا سے اپنی گردن تان لی اور انھیں ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں کسی کو دیکھ نہیں رہا ہوں، میں نے الیشام سے والہانہ لگاؤ کا اظہار اور دوسروں سے بے نیازی اور الیشام میں سما جانے کے انداز میں لیا۔ میں نے کسی کی طرف مسکرا کے نہیں دیکھا میرے ان سنگدلانہ تیوروں

نے ناظموں کے اجلاس میں ایک آگ سی لگا دی۔ میں نے دانستہ عبادت گاہ کے کاہنوں کا عطا کردہ ہار نہیں پہنا تھا، وہ میرے ہاتھ میں چھپا ہوا تھا۔ ناظمِ اعلا قسریم بھی وہاں موجود تھی، الیشام فخر کے ساتھ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ گئی۔ قسریم نے میری حاضری پر سب سے مختلف ردِ عمل کا اظہار کیا، اس کے ماتھے پر شکنیں پیدا ہو گئیں۔ میں نے اس کی جانب دیکھ کے منہ بگاڑ لیا، اسی طرح تلراش کی نگاہوں میں بھی میرے لیے کوئی پذیرائی نہیں تھی، اسے بھی میں نے اپنی بے نیازی سے اور بد دل کر دیا۔ ہماری آمد پر رقص رک گیا تھا اور ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی تھی۔ ناظمِ اعلا قسریم نے پھر الیشام کو اپنے پاس بلایا اور اس سے سرگوشی میں کچھ کہنے لگی۔ ناظم الیشام پہلے تو توجہ سے اس کی باتیں سنتی رہی پھر اس کے رخسار دہکنے لگے اور میں نے سمجھ لیا کہ ان کے درمیان کسی موضوع پر تلخی شروع ہو گئی ہے۔ ناظم الیشام دیر تک وہیں ٹھہری رہی۔ میں اس دوران میں روایتوں کے خلاف حرکتیں کرتا رہا۔ میں نے رقص میں شامل ہو کے ایک حسین عورت پکڑ لی۔ میری اس حرکت پر محفل کی برہمی اور بڑھ گئی۔ میں نے اپنے ہاتھ کا قدح اس کے بدن پر ڈال دیا، وہ ایک سسکی کے ساتھ مجھ سے ہم آغوش ہو گئی۔ ناظم تلراش بھی الیشام اور قسریم کی گفتگو میں شریک ہو گئی تھی۔ یکایک گھنٹیوں کا شور ہوا۔ رقص تھم گیا اور ناظمِ اعلا قسریم نے اپنا ہاتھ ہلا کے تلراش کو کوئی اشارہ کیا۔ تلراش نے اپنی ساقِ سیمیں پر ایک ضرب لگائی۔ پلک جھپکنے میں دروں اور ستونوں کے درمیان سیاہ فام نیزہ بردار عورتوں کی فوج جمع ہو گئی، ان کی مستعدی پر میں دنگ رہ گیا، میں نے الیشام کی جانب حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ مغموم بیٹھی تھی۔ اس نے گردن جھکا لی۔ ناظم تلراش نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے حکم دیا کہ میں ناظموں کی اس خصوصی نشست گاہ سے نکل جاؤں۔ میں جہاں کھڑا تھا، وہیں کھڑا رہا اور میں نے بہکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے محترم ناظم الیشام یہاں لائی ہے، میں اس کے ساتھ واپس جاؤں گا، میں اس کا مہمان ہوں“

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

"ناظمِ الیشام اب مزید تمھاری رفاقت کی خواہاں نہیں ہے۔" تلراش نے گرج کر کہا۔ "تم یہاں سے جا سکتے ہو۔"

"میں کہاں جاؤں؟ میرا یہاں کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ کیا اسمار میں مردوں کی یہی قدر کی جاتی ہے؟"

"جابر بن یوسف! تم سے جو کچھ کہا جا رہا ہے، اس کی تعمیل کرو اور بہتر ہے کہ اسمار کا جزیرہ چھوڑ دو۔"

"یہ ظلم ہے۔ میں مقدس آقابلا کی اجازت سے یہاں آیا ہوں۔ میں احتجاج کرتا ہوں۔"

"احتجاج؟" تلراش نے طنزاً کہا اور اپنی ناظموں سے مخاطب ہو کے پوچھا۔ "کیا تمھیں اس لفظ کا مطلب معلوم ہے؟" وہ تلراش کے تخاطب پر ہنس پڑی۔

"ناظمِ الیشام نے مجھے پناہ دی ہے، میں اس کے بغیر کیسے جاؤں؟"

"اگر تم یہاں سے خود نہ گئے تو تمھیں نکال دیا جائے گا۔" تلراش غصے میں بولی۔

"میں مقدس شوطار کی خدمت میں تمھاری اس بدسلوکی کی شکایت کروں گا۔" میں نے برہمی سے کہا۔

میں نے الیشام کی طرف تائیدی نظروں سے دیکھا، وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ وہ پشت کیے ایک طرف کھڑی تھی۔ میں نے ایک چیخ مار کر الیشام کی طرف دوڑنا چاہا۔ سیاہ فام نیزا بردار عورتوں نے اپنے نیزے میرے آگے کر دیے۔ میں نے کسی پاگل کی طرح ان کے نیزے ہٹانے چاہے تو ان کی نگاہوں میں اور سختی آ گئی اور انھوں نے مجھے پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ "ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔" میں نے دہاڑتے ہوئے کہا۔ ان میں اور شدت پیدا ہو گئی اور وہی ہوا جس کی مجھے توقع تھی۔ ایک عورت نے میرے حلق پر نیزا تان لیا لیکن اس نے اسے میرے گلے میں اتارا نہیں۔ میں نے وہ نیزا اپنے ہاتھ سے قابو میں کر کے ایک جھٹکا دیا۔ عورت چکراتی ہوئی زمین پر گری، دوسرے نیزے میرے قریب تھے مگر میں بہت تیزی سے تیورا کر اٹھا اور میں نے ان سب پر نیزا تان لیا۔ ادھر میں نے اشارے سے اپنا چوبی اژدہا متحرک کیا۔ تلراش نے مجھے پھر حکم دیا کہ میں نیزا بردار عورتوں کا مقابلہ ترک کر دوں ورنہ مقدس شوطار کے قہر سے مجھے کہیں امان نہ ملے گی۔ میں نے اس کے حکم پر کان نہیں دھرے اور الیشام کی طرف دوبارہ جانا چاہا، اس بار انھوں نے شعلہ بار نظروں سے میرا راستہ روکا اور میں نے پہلے تو اپنے واحد نیزے سے ان کا مقابلہ کیا، تین سیاہ فام عورتیں

میری مستعدی کی تاب نہ لا سکیں اور وہیں ڈھیر ہو گئیں۔ پھر میں نے نیزا پھینک کر شپالی اپنے ہاتھ میں لے لی اور اسے اچھال کے ان پر تولنے لگا، میں نے ان کے دوسرے حملے کا انتظار بھی نہیں کیا اور جو سامنے آیا، اسے پھینک دیا۔ شپالی جیسے ہی سامنے والی ایک نیزا بردار عورت سے مس ہوئی، وہ جہاں کھڑی تھی وہیں ایک دردناک کراہ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ میرے چوبی اژدہے نے اسے حاصل کر لیا۔ جب وہ اسے واپس لے آیا تو میں دیوانہ وار نیزا بردار عورتوں کے درمیان گھس گیا اور میں نے وحشت میں ان کے نیزے آپس میں ٹکرا دیے اور ڈگبی کے سینگ ان کے جسموں میں چبھو دیے۔ میں ایک بپھرا ہوا درندہ تھا۔ میں انھیں چیرتا ہوا الیشام کے پاس پہنچ گیا اور دیوانہ وار اس کی پشت سے لپٹ گیا۔ الیشام نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں سے چھپا لیا اور مجھے اپنے پیچھے نیزوں کی چبھن محسوس ہوئی۔ انھوں نے مجھے نرغے میں لے لیا تھا۔ مجھے پیچھے مڑنے کا موقع نہیں ملا۔ الیشام نے بھی اپنا چہرہ میری طرف نہیں کیا۔

"جابر بن یوسف۔" ناظمِ اعلا قسریم کی کھنک دار آواز گونجی۔

"تم نے اسمار میں سرکشی کی ہے۔ اسمار میں کسی مرد کو آج تک یہ جرأت نہیں ہوئی۔ تم اپنے نوادر قابو میں رکھو اور خود کو ہماری تحویل میں دے دو۔"

"معزز قسریم!" میں نے اپنا چہرہ اس کی جانب موڑے بغیر ادب سے کہا۔ "اسمار کی معزز عورتوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ جابر بن یوسف تاریک برِاعظم کے تین قبیلوں کا سردار ہے اور اس نے یہ مناصب یقیناً بھی برتری کے سبب سے حاصل کیے ہوں گے۔ پھر اسے اسمار کی عبادت گاہ کے مقدس کاہنوں نے سرفرازی کی سند دی ہے۔ یہ طور طریق اس کے رتبے کے خلاف اور اس کے مزاج کے منافی ہیں۔"

"مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم اس زمین پر فیصلے کرنے کے مختار ہو گئے ہو۔ یہ تمھارا زیرِ نگیں علاقہ نہیں ہے اور یہاں تمھیں کسی نے مدعو بھی نہیں کیا ہے۔ مقدس شوطار نے مجھے یہاں کا ناظمِ اعلا مقرر کیا ہے اور اسی کی وساطت سے میں تمھاری حراست کا حکم دیتی ہوں۔" قسریم کے لہجے میں سفاکی تھی۔

"پھر تم کیا کرو گی؟" میں نے بے پروائی سے پوچھا۔

"تمھارا فیصلہ مقدس شوطار کرے گی کہ اس کے فیصلے شک اور شبہے سے بالاتر ہوتے ہیں اور وہ تمھارے حق میں کوئی اچھا فیصلہ نہیں کرے گی۔"

"میں مقدس شوطار کی فضیلت پر اعتبار کرتا ہوں۔" میں نے

مضبوط لہجے میں کہا۔ "اور اس شرط پر اپنے آپ کو حراست میں دیتا ہوں کہ میرا مقدمہ اس کی خدمت میں پیش کیا جائے اور میرے ساتھ ایک معزز مہمان کا رویّہ اختیار کیا جائے۔ ہر چند کہ میں ایک زنداں میں محبوس ہوں گا۔"

میری پشت سے نیزے ہٹ گئے اور میں نے الیشام کے کاندھے چھوڑ دیے۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ اسمار کی تمام ناظمیں ایک صف میں کھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے کاہنوں کا عطا کردہ ہار پہن لیا۔ ان کے چہروں پر کئی رنگ آئے اور گزر گئے۔ نیزا بردار عورتوں کا دم خم پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ میں خود ہی آگے بڑھ گیا۔ میرے اردگرد پہرے دار عورتیں تھیں۔ میں نے پھر پیچھے مڑ کر ان کے تاثرات نہیں دیکھے۔ شپالی اچھالتا ہوا میں عمارت میں قید کر دیا گیا۔

میں اپنے حبس کا حال مختصر بیان کر رہا ہوں، میرا خیال تھا کہ مجھے جلد ہی شوطار کے محل میں پیش کر دیا جائے گا لیکن انھوں نے پلٹ کے میری خبر نہیں لی۔ میری نگراں محافظوں میں اور اضافہ کر دیا گیا اور مجھے بدترین غذائیں فراہم کی گئیں۔ کوئی انتہا پسندانہ قدم اٹھانے سے پہلے میں شوطار کو ایک نظر دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ میں اس کے محل میں کسی طور رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ ایک مشکل امر تھا، شوطار میرے ارادوں سے آگاہ ہو گی۔ اس نے میرے گرداب سیاہ دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔ میں اگر اسمار کی عبادت گاہ میں نہ جاتا تو مختلف عورتوں میں منتقل ہوتا رہتا۔ مجھے کاہنوں نے بتایا تھا کہ اب اسمار میں میرا درجہ میری عبادت و ریاضت کی وجہ سے بلند ہو گیا ہے اور میرا احترام اسمار کے جملہ باشندوں پر فرض ہے مگر شوطار اور اس کی ناظمین نے وہ سارا احترام بالائے طاق رکھ کے مجھے زنداں میں ڈال دیا تھا۔ کئی دن تو میں انتظار کرتا رہا کہ شاید حالات کوئی مثبت رُخ اختیار کر لیں۔ الیشام کے پاس جانا اور اس سے ناظموں کی خصوصی طرب گاہ میں جانے کا اصرار کرنا اور پھر ایسے حالات پیدا کرنا کہ میں وہاں ایک نزاعی شخصیت بن جاؤں، یہ سب میں نے اسی منصوبے کے تحت کیا تھا کہ مجھے کسی نہ کسی طرح شوطار کے محل میں باریابی کی اجازت مل جائے گی۔

جب کئی دن بیت گئے تو میں نے نیزا بردار عورتوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا اور میں نے اپنے پُراسرار و طائف سے زنداں میں ایک خوف ناک صورتِ حال پیدا کر دی۔ میں نے کئی عورتوں کو شپالی سے داغ دار کر دیا اور میرا چوبی اژدہا متحرک ہو کے ان کے پیروں سے لپٹ گیا۔ وہ میری اس دہشت گردی سے ہراساں ہونے لگیں۔ میں نے غذاؤں

مولانا رومیؒ معصیت کی اقسام بیان کر رہے تھے۔ فرمایا "وہ کھانا جو پوری اشتہا کے بغیر کھایا جائے ایک طرح کی معصیت ہے۔"

کے تھال ان کے منہ پر مار دیے اور شپالی کی مدد سے زنداں میں آگ روشن کر دی اور بلند آواز میں زارشی کے صحرا کا ورد کرنے لگا۔ اس آگ کی لپٹیں اتنی بلند اور شدید تھیں کہ میری نگراں محافظوں کا وہاں ٹھیرنا دوبھر ہو گیا اور وہ شوطار سے فریاد کرنے لگیں۔ انھوں نے اپنی جگہیں چھوڑ دیں اور زنداں سے باہر نکل گئیں۔ میں نے یہ آگ سرد نہیں کی۔ زنداں کی سیاہ دیواریں تپنے لگیں۔ میں اس میں بیٹھا رہا۔ میرے اس ہذیان اور دہشت کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ اسی روشن آگ سے گزرتی ہوئی تلراش کی آواز میرے پاس آئی۔ "جابر بن یوسف! یہ آگ بجھا دو۔ یہ آگ بجھا دو۔ دیوتاؤں کے لیے خاموش ہو جاؤ۔ تمھیں مقدس شوطار نے طلب کیا ہے، تمھیں مقدس شوطار نے طلب کیا ہے۔"

"نہیں، تم جھوٹ کہتی ہو۔" میں نے اندر سے جواب دیا۔

"مقدس شوطار اپنے قصر میں تمھاری منتظر ہے۔ دیوتاؤں کا واسطہ میں سچ کہہ رہی ہوں، آؤ باہر آ جاؤ۔" تلراش نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے شپالی آگ کے اندر سے نکالی اور لمبے قدم اٹھاتا ہوا زنداں سے باہر آ گیا۔ باہر تلراش اور دوسری ناظمین میری منتظر تھیں۔ تلراش مجھے اپنے محل میں لے گئی۔ انھوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ جزیرے کی حسین لڑکیوں اور مردوں نے مل کے مجھے خوشبودار تیلوں سے غسل دیا۔ میرے بال نئے سرے سے سنوارے گئے۔ جسم پر صندلی خوشبو کا عرق چھڑکا گیا۔ میں نے اپنے نوادر چمکائے۔ روانگی سے پہلے ناظمِ اعلا قسریم، تلراش اور دوسری ناظمین نے مجھے شوطار کے محل کے آداب سے آگاہ کیا۔ پھر میری آنکھوں پر ایک پٹی باندھ دی گئی اور مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا گیا۔ نشیب میں ایک طویل سفر کیا گیا۔ چلتے چلتے میری آنکھوں کی پٹی کھول دی گئی۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ اب میں کسی عالی شان محل میں کھڑا تھا۔ سیاہ فام مردوں اور حسین و جمیل عورتوں نے تلراش کی جگہ لے لی لیکن ناظمِ اعلا قسریم ان کے ساتھ چلتی رہی۔ محل کی سجاوٹ قابلِ دید تھی۔ میں وہاں کے نوادر کا جائزہ لیتا ہوا اور اپنی آنکھیں خیرہ کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ محل قصرِ آقابلا کے ہم پلّا تو نہیں تھا مگر اسی کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا۔ جگہ جگہ جو عورتیں اور مرد مجھے راستے میں ملے،

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

وہ پُرتپاک نظروں سے میرے خد و خال کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ طویل راہداری کے دونوں طرف کمرے تھے اور راہداری میں مجسّموں کی بھرمار تھی۔ ایسے مجسّمے جو جنسی خواہشات میں ہیجان برپا کر دیں۔ رنگ برنگے دروازے۔ تمام دروازے بند تھے۔ آخری سرے پر ایک دروازہ کھُلا ہوا تھا اور وہیں راہداری ختم ہو جاتی تھی۔ قسریم مجھے اُس دروازے میں لے گئی۔ میں نے بے جھجک قدم بڑھا دیے اور کچھ نہ سوچا کہ آگے کیا ہے۔ میں قصر کے تشکوہ میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ مجھے کچھ خبر ہی نہ ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے خوف و دہشت کی ایک لہر میرے جسم میں تیر کی طرح لہرا گئی —— پناہ بخدا، یہ جہنّم کا کوئی منظر تھا۔ یہاں بے کفن لاشوں کا ایک انبار تھا۔ ہر طرف ان کی کھوپڑیوں اور ٹوٹے پھوٹے پنجروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ایک جانب نیم جاں انسان موت و زندگی کی کش مکش سے دوچار تھے۔ معاً میری نظر چھت کی جانب اُٹھی۔ میں اپنی چیخ پر قابو نہ پا سکا۔ چھت سے متعدد مرد اس طرح پھانسی کے پھندے سے لٹکے ہوئے تھے کہ ان کی گردنیں ٹوٹ گئی تھیں۔ آنکھیں حلقوں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ ان کے جسم سڑ گل چکے تھے اور گلتا ہوا گوشت قطرے ہو کر ہڈیوں کا ساتھ چھوڑ رہا تھا۔

اس تعفّن سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ مجھے اعتراف ہے، زندگی میں پہلی بار میرے حلق سے ایک گھُٹی ہوئی چیخ نکلی تھی۔ اسی وقت یہ دہشت ناک خیال میرے ذہن میں آیا کہ کہیں اس مردہ خانے میں قید کرنے کے لیے تو مجھے شوطار نے اپنے محل میں طلب نہیں کیا ہے؟ پھر اس مظاہرے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پایا اور قسریم کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

" قصرِ شوطار میں حیرت انگیز نوادر موجود ہیں جابر بن یوسف!" وہ بولی۔ "جو یقیناً تمھاری دلچسپی کا باعث ہوں گے۔"

" ہاں۔" میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "یہ ایک خوش رنگ منظر ہے، اس سے شوطار کی فضیلت اور برتری کا اندازہ ہوتا ہے۔"

" جو اطاعت کرتے ہیں، ان کے لیے شوطار کی فیاضیاں بے پناہ ہیں اور جو......"

میں نے قسریم کی بات کاٹ دی۔ "بس بس۔ میں دیکھ چکا۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ میرے دل میں مقدس شوطار کی دید کی خواہش دوچند ہو گئی ہے۔ مقدس شوطار کو میری آمد کی اطلاع کی جائے۔"

قسریم کو اس جواب کی توقع نہیں تھی، اُسے میرا تحکمانہ لہجہ یقیناً گراں گزرا تھا۔ اس نے مجھے نفرت انگیز نظروں سے دیکھا اور راہداری سے واپس ہونے لگی۔ میں اس کی پیروی میں قدم بڑھانے لگا۔ میں نے اپنے ذہن سے وہ خوف ناک منظر فراموش کرنے کی ناکام کوشش کی جو ابھی ابھی میری گنہ گار آنکھوں نے دیکھا تھا۔ قسریم مجھے محل میں گھماتی رہی اور اس عرصے میں مجھے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ میں شوطار سے ملنے کے لیے اپنے حواس و اعصاب کو آمادہ کرتا رہا۔

پھر قسریم مجھے ایک وسیع و عریض ایوان میں لے گئی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک بلند دروازے پر پہنچ گئی۔ پہلی بار میں نے اس کے چہرے پر سراسیمگی کے تاثرات دیکھے۔ فرش کا رنگ گہرا سُرخ تھا اور چھت پر روشنی سی چھائی ہوئی تھی۔ قسریم نے آگے بڑھ کر دروازے کو بوسہ دیا۔ چند لمحوں بعد وہ اُٹھی اور پنجوں کے بل میرے قریب آئی اور سرگوشی کے لہجے میں بولی۔ "جابر بن یوسف! یہ دروازہ شوطار کی دید کا دروازہ ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ مقدس شوطار کی عظمت اور جلال کا خیال رکھنا۔" پھر اس سے قبل کہ میں کوئی جواب دیتا وہ تیزی سے پیچھے مڑ گئی اور ایک موڑ پر جا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اب میرے اِرد گِرد شوطار کی خاص کنیزیں اور غلام مرد رہ گئے —— جو آہستہ آہستہ واپس ہونے لگے۔ پھر صرف میں تنہا رہ گیا۔

یہ لمحے بڑے صبر آزما تھے۔ میں نے بلند دروازے کی جانب دیکھا، اس کے نقش و نگار میرے دل میں عجب ولولے پیدا کر رہے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو سمیٹا اور دروازے پر نہایت احتیاط سے ہاتھ رکھا۔ میرا ہاتھ رکھنا تھا کہ نقرئی گھنٹیوں کی مسحور کُن آوازیں در و دیوار سے پھوٹنے لگیں۔

دروازہ آہستہ آہستہ وا ہو رہا تھا۔ اندر سے مجھے رنگ برنگے بادلوں کے جھرمٹ نظر آئے اور کیف آور خوشبوئیں میرے جسم سے لپٹ گئیں۔ میں نے کچھ سوچا۔ پھر ایک عزم کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔

تاریک برِّاعظم میں جابر بن یوسف الباقر کے ساتھ حیران کُن پُراسرار واقعات پیش آئے۔ اِس فسوں کار سرگزشت کے باقی واقعات آیندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے۔

بیوی کی تدفین سے فارغ ہو کے راجر گھر آ گیا۔ وہ تنہائی چاہتا تھا اس لیے اس نے ملازمہ کو کام پر نہ آنے کی ہدایت کر دی تھی۔ پورے مکان پر ایک سوگوار خاموشی طاری تھی۔ وہ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا اپنی بیوی کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ تصویر دیوار پر آویزاں تھی۔ بے شک حسین بہت خوبصورت عورت تھی۔ اُس نے سوچا۔ پھر اچانک اس کے دل میں نفرت کی لہریں اُمڈنے لگیں۔ اس کا دل چاہا کہ وہ تصویر پر گرم گرم کافی سے بھری ہوئی پیالی کھینچ مارے۔ اس نے بڑی مشکل سے اس خواہش پر قابو پایا۔ پھر اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ راجر نے کافی کی پیالی میز

جب اِس زمین پر کوئی نہیں بولتا تو آسمان بولنے لگتا ہے

اِس شمارے کے لیے **بطورِ خاص** مغرب سے تازہ تر **تین چٹکلے**

ناآسودہ وقت میں زندہ دلوں کے لیے تین مکار، سنگ دل کہانیاں

جرڈ ایم ایلی — وسیلہ خاتون

پر رکھی اور ٹیلیفون اٹھایا۔ دُوسری طرف سے لفٹیننٹ ملر بول رہا تھا۔

"کوئی نئی بات معلوم ہوئی لفٹیننٹ؟" راجر نے دریافت کیا۔

"نہیں جناب! ہم اب تک مکمل تاریکی میں ہیں" لفٹیننٹ نے جواب دیا۔ "اگر حالات میں کوئی تبدیلی نہ آئی تو شاید ہم کبھی آپ کی بیوی کے قتل کا معمّا حل نہ کر سکیں۔ مجرم بہت چالاک اور تیز معلوم ہوتا ہے۔ اس نے کوئی بھی ایسی غلطی نہیں کی ہے جس سے ہمیں قتل کی تفتیش میں کوئی مدد مل سکے۔"

راجر کے پتلے پتلے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ اس نے خشک لہجے میں کہا۔ "لفٹیننٹ! میں بہت مصروف آدمی ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ اس مکان میں تالا لگا کر کچھ دنوں کے لیے اپنے کلب میں قیام کروں۔ اس لیے......"

"مجھے آپ کے دلی جذبات کا پورا احساس ہے جناب!" لفٹیننٹ نے جلدی سے کہا۔ "اس وقت میں نے صرف یہ پوچھنے کے لیے ٹیلیفون کیا تھا کہ کیا آپ نے اپنی ڈاک کا مطالعہ کر لیا ہے؟"

راجر نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ اس نے سر موڑ کر میز پر رکھے ہوئے وہ بے شمار خطوط دیکھے جو اس کے دوستوں اور عزیزوں نے اس کی بیوی کی موت پر بطورِ تعزیت اسے بھیجے تھے۔ اس نے ہیلن کی موت کے بعد ایک ہفتے کے دوران میں کئی مرتبہ خطوط کا یہ انبار ٹٹولا تھا کہ کہیں ان میں کوئی کاروباری خط شامل نہ ہو مگر اس نے کوئی تعزیتی خط کھولنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ "ابھی تو نہیں۔" راجر نے فون پر جواب دیا۔ "لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"ہمیں یقین ہے کہ قاتل نے آپ کو تعزیتی خط ضرور لکھا ہوگا۔ اُس کا آپ کے حلقۂ احباب میں شامل ہونا ایک یقینی امر ہے اس لیے دوسروں کی طرح اس نے بھی آپ کو تعزیتی پیغام لازماً بھیجا ہوگا۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو خود کو مشکوک بنا لے گا۔ اتنی بات تو اسے بھی معلوم ہوگی۔"

"ہو سکتا ہے اس نے کوئی خط بھیجا ہو لیکن وہ خط اعترافنامہ تو ہرگز نہیں ہوگا جسے پڑھ کر ہم اسے گرفتار کر لیں۔" راجر نے تلخ لہجے میں کہا۔

"درست ہے جناب لیکن ماضی کے تجربات کے پیشِ نظر یہ امکان رد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے تعزیتی خط میں غلطی سے کوئی ایسی بات لکھ جائے جس سے ہمیں تفتیش میں مدد مل سکے۔ میری خواہش ہے کہ آپ پہلے اپنی ڈاک کا مطالعہ کیجیے اس کے بعد میں بھی وہ خطوط پڑھنا پسند کروں گا۔"

"بہتر ہے۔" راجر نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔ "لیکن میں اب بھی اس بات پر یقین نہیں کر سکتا کہ میرا کوئی دوست ہیلن کا قاتل ہو سکتا ہے۔ اُس رات دعوت میں جتنے لوگ مدعو تھے وہ سب میرے دوست تھے۔ میں ان میں سے ہر شخص کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا شقی القلب اور بے رحم نہیں ہے جو اتنی سفّاکی سے میری بیوی کو قتل کر دے اور پھر اس کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے، خواہ مخواہ کون کسی کو قتل کرتا ہے؟"

دوسری طرف کچھ دیر سکوت طاری رہا۔ "بات یہ ہے کہ پارٹی میں شریک ہونے والے ہر فرد کا بیان یہ تھا کہ ان سب نے خوب شراب پی تھی۔ خود آپ نے بھی یہی کہا تھا۔ اس لیے کوئی بھی شخص نشے میں ہوش و حواس کھو جانے کے باعث اس جرم کا مرتکب ہو سکتا ہے۔"

راجر کے ہونٹوں پر ایک مرتبہ پھر مسکراہٹ عود کر آئی۔ گزشتہ سنیچر کی رات کو اُس نے اپنے گھر پر کاک ٹیل پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ اگر اس کا مکان شہر سے باہر نہ ہوتا تو شاید اُس رات محلّے والوں کی نیند حرام ہو جاتی۔ ہر مہمان نے دل کھول کر کاک ٹیل پی تھی اور تقریباً سبھی نشے میں دُھت ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے خوب اُدھم مچایا تھا۔

لفٹیننٹ ملر دوسری طرف سے کہہ رہا تھا۔ "کوئی مہمان رات کو کسی وقت مکان سے باہر نکل آیا ہوگا اور اس نے آپ کی بیوی کو مکان سے کچھ فاصلے پر درختوں کے درمیان تنہا ٹہلتے ہوئے اور چاندنی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ چونکہ شراب اس کے اعصاب پر سوار تھی اس لیے وہ بُری نیت سے آپ کی بیوی کے پاس گیا ہوگا پھر اس نے ضرور آپ کی بیوی کو اپنی پیاس بجھانے کے لیے مجبور کیا ہوگا اس پر مقتولہ نے مدافعت کی ہوگی۔ نشے میں مدہوش مجرم نے قریب پڑے ہوئے پتّھر سے آپ کی بیوی کے سر پر چوٹ لگائی ہوگی۔ ظاہر ہے اُس کا ارادہ آپ کی بیوی کو ہلاک کرنے کا نہیں ہوگا لیکن شراب کی وجہ سے اس کے اعصاب اُس کے قابو میں نہیں تھے اس لیے پتّھر کی ضرب غیر معمولی طور پر کاری ثابت ہوئی اور آپ کی بیوی ضرب کی تاب نہ لا کر وہیں ہلاک ہو گئیں۔ حالات مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کے سوا اور کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔"

راجر یہ واقعات دہرانا پسند نہیں کرتا تھا پھر بھی اس نے کہا۔ "کیا آپ کو یقین ہے کہ مجرم کوئی آوارہ گرد نہیں ہو سکتا؟"

"نہیں مسٹر راجر! اس کے امکانات بہت کم ہیں۔"

"بہت اچھا لفٹیننٹ! میں اپنی ڈاک کے بارے میں آپ کی فرمائش یاد رکھوں گا۔" راجر نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اسے شدّت سے شراب کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے دیوار میں بنی ہوئی الماری کھول کر اسکاچ کی بوتل نکالی اور گلاس بھر کر ہیلن کی تصویر دیکھتے ہوئے چُسکیاں لینے لگا۔

ہیلن کے لبوں پر تبسّم تھا۔ اس کی نظریں اپنے شوہر پر جمی ہوئی تھیں۔ راجر غور سے اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اُس رات جب ہیلن کی لاش دریافت ہوئی تھی تو لاش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ وہ مکان کے پچھواڑے کچھ فاصلے پر درختوں کے درمیان ایک صاف جگہ پڑی ہوئی تھی اور چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔ اس کا لباس تار تار تھا اور سر کے گرد خون کا ایک تالاب سا جما ہوا تھا۔ لاش بالکل اسی انداز میں پڑی تھی جس طرح راجر نے اسے چھوڑا تھا۔ اس نے پہلے اپنی بیوی کے سر پر پتّھر مار کر اُسے ہلاک کیا تھا پھر اس کا لباس پھاڑا تھا۔ اس نے سر ہلا کر یہ یادیں اپنے ذہن سے جھٹک دیں۔ اب یہ باتیں سوچنے سے کیا فائدہ تھا؟ اس کا منصوبہ کامیاب رہا تھا حالانکہ یہ منصوبہ اس نے بہت عجلت میں بنایا تھا۔ وہ ہیلن کی لاش کے ساتھ پولیس کو ایک عدد قاتل دینے کا ارادہ بھی رکھتا تھا تاکہ پولیس سے اس کی جان ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے لیکن عین وقت پر منصوبے کے آخری حصّے میں کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی چنانچہ پولیس کو ہیلن کی لاش ہی مل سکی۔ اسے قاتل نہیں مل سکا جس کی تلاش سے اب وہ مایوس ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے باوجود پولیس نے اس پر قطعاً شک نہیں کیا تھا۔ یہ بھی اس کے منصوبے کی کامیابی کا ثبوت تھا۔

اس کا ارادہ تھا کہ وہ اپنی بیوی کے قاتل کی حیثیت سے الفرڈ کو پولیس کے سامنے پیش کرے اس نے اس کا پورا انتظام بھی کیا تھا۔ اس نے الفرڈ کو ہیلن کی لاش کے قریب بے ہوش کر کے ڈال دیا تھا اور جس پتّھر سے اس نے ہیلن کو ہلاک کیا تھا وہ پتّھر اس نے بے ہوش الفرڈ کے ہاتھ میں تھما دیا تھا اور واپس گھر آ گیا تھا۔ اب یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ الفرڈ کو وقت سے پہلے ہی ہوش آ گیا اور جب راجر اپنے چند دوستوں کے ساتھ ہیلن کو تلاش کرتا ہوا اُس جگہ پہنچا تو وہاں صرف ہیلن کی لاش پڑی تھی۔ الفرڈ غائب تھا۔ اگر الفرڈ کچھ دیر اور بے ہوش رہتا تو پولیس کو لاش کے ساتھ مجرم بھی مل جاتا اور سارا قصّہ وہیں ختم ہو جاتا۔ راجر نے ایک گہرا سانس لے کر اسکاچ کا گلاس خالی کیا اور میز پر رکھ دیا۔

اطلاعی گھنٹی کی آواز نے راجر کو چونکا دیا۔ گھنٹی کی آواز بہت دھیمی تھی جیسے کہیں بہت دُور بج رہی ہو۔ یہ داخلی دروازے کی گھنٹی نہیں تھی۔ آنے والے نے اندر داخل ہونے کے لیے مکان کا بغلی دروازہ پسند کیا تھا۔ راجر اس بے وقت ملاقاتی کو کوستا ہوا بغلی دروازے پر پہنچا۔ دروازہ کھولتے ہی اسے حیرت کا ایک جھٹکا لگا کیونکہ اس کے سامنے الفرڈ کھڑا تھا۔

الفرڈ کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ بال اُلجھے ہوئے تھے۔ شیو بڑھا ہوا تھا اور چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ کسی بھی لمحے رونا شروع کر دے گا۔ راجر کو دیکھ کر اُس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم نے میرا خط پڑھ لیا راجر؟"

"کون سا خط؟" راجر نے اسے حیرت زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تم نے اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے الفرڈ؟ اور تم پچھلے دروازے سے کیوں آئے ہو؟"

الفرڈ راجر کے سوالات نظر انداز کرتا ہوا اندر گھس آیا۔ وہ باورچی خانے سے ہوتا ہوا سیدھا ڈرائنگ روم میں آ کر ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا اور اس طرح ہانپنے لگا جیسے بہت دُور سے بھاگتا ہوا آ رہا ہو۔ راجر بھی اس کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں آیا اور قریب کھڑا ہو کر چند لمحوں تک اسے تیز نظروں سے گھورتا رہا۔ "میں پوچھتا ہوں یہ سب کیا ہے الفرڈ؟"

الفرڈ نے رومال سے رگڑ کر اپنا چہرہ صاف کیا۔ "میں ہیلن کا قاتل ہوں راجر۔" اس نے کہا۔

"تم؟ ——؟"

"ہاں —— کل رات میں نے تمھیں ایک خط بھیجا تھا جس میں سب کچھ لکھ دیا تھا۔ تمھاری حیرت بجا ہے راجر! میں خود نہیں جانتا کہ میں نے ہیلن کو کس طرح ہلاک کیا؟ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں اُس وقت نشے میں بالکل مدہوش تھا لیکن قتل جیسے معاملے میں یہ عذر قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ مجھے یاد ہے، ہیلن وہاں اکیلی چاندنی رات میں ٹہل رہی تھی۔ وہ کس قدر خوبصورت نظر آ رہی تھی —— اُف۔" الفرڈ نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اُس کے ہاتھ بُری طرح لرز رہے تھے۔

راجر خاموش رہا۔ یہ خیال تو اُس کے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا کہ الفرڈ بھی خود کو ہیلن کا قاتل تصور کرنے لگے گا۔ حالانکہ یہ اس کے منصوبے کا منطقی ردِ عمل تھا۔ نشے میں مدہوش آدمی کو جب ہوش آئے گا اور وہ خود کو ایک عورت کی لاش کے قریب پڑا ہوا پائے گا اور آلۂ قتل اس کے ہاتھ میں ہوگا تو ظاہر ہے وہ یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ نشے کی حالت میں خود اُسی نے عورت کو ہلاک کیا ہے۔ "مجھے کچھ یاد نہیں آتا۔" الفرڈ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے بڑبڑا رہا تھا۔ "البتہ یہ یاد آتا ہے کہ میں نے ہیلن سے کچھ کہا تھا —— اُس نے مجھے کچھ جواب دیا تھا۔ پھر میں اس کی طرف بڑھا تھا۔ اس کے بعد پتہ نہیں کیا ہوا؟ پھر پتہ نہیں کب میں نیند سے بیدار ہوا تھا؛ ہیلن مردہ پڑی تھی —— میں نے اس کے سر پر پتّھر مار کر اسے ہلاک

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

کر دیا تھا۔ وہ پتھر اس وقت بھی میرے ہاتھ میں تھا۔"

" تم کسی خط کا ذکر کر رہے تھے؟" راجر نے اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھا۔

" ہاں، گزشتہ رات جب مجھ سے اپنے ضمیر کی ملامت برداشت نہ ہو سکی اور میری حالت بالکل پاگلوں جیسی ہو گئی تو میں نے تمھیں ایک خط لکھا۔ میں نے اس خط میں اپنے جرم کا اعتراف کیا تھا۔ پھر میں نے فوراً وہ خط لیٹر بکس میں ڈال دیا تھا لیکن خط ڈالنے کے بعد اپنے ارادے کے مطابق میں خودکشی نہیں کر سکا۔۔۔ ہاں راجر! میں اپنے جرم کا اعتراف کر کے خودکشی کرنا چاہتا تھا لیکن افسوس میں خودکشی نہیں کر سکا۔ میں اپنے آپ میں اتنی جرأت پیدا نہیں کر سکا۔" الفرڈ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر سے پستول نکالا اور اسے اُلٹ پلٹ کر غور سے دیکھنے لگا۔

پستول دیکھ کر راجر کا حلق خشک ہونے لگا۔" سنو الفرڈ! میں نے اب تک تمھارا خط نہیں پڑھا۔ میں نے اب تک اپنی ڈاک نہیں دیکھی۔ تمام خطوط، وہ دیکھو۔۔۔ وہ میز پر اسی طرح بند رکھے ہوئے ہیں۔"

" راجر میں قسم کھاتا ہوں، میں ہیلن کو ہلاک کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ یقین کرو راجر! یہ ہولناک جرم میں نے ہوش و حواس کے عالم میں نہیں کیا۔" الفرڈ نے رنج و غم میں ڈوبی ہوئی آواز سے کہا۔ "جب سے مجھے اپنے جرم کا احساس ہوا تو مجھ پر سونا حرام ہو گیا۔ یقین کرو راجر! میں اُس وقت سے آج تک ایک پل کے لیے بھی نہیں سو سکا ہوں۔ کل رات خط لکھنے کے بعد میں خودکشی کر لینا چاہتا تھا۔ جب میں رات بھر خودکشی نہ کر سکا تو آج صبح مجھے اپنے بیوی بچّوں کا خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں خودکشی کر لیتا تو میرے بچّوں کا مستقبل کیا ہوتا؟ وہ زندگی بھر کسی سے نظریں ملا کر بات کرنے کے قابل نہ رہتے اس لیے اب میں وہ خط واپس لینے آیا ہوں راجر!"

راجر کو الفرڈ کا پستول پکڑنے کا انداز بالکل پسند نہیں آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اسے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔" اپنا خط لے جاؤ الفرڈ!" اُس نے جلدی سے کہا۔" ہاں، اسے واپس لے جاؤ اور فوراً تلف کر دو۔ یقین کرو دوست! تمھارا یہ راز ہمیشہ میرے سینے میں دفن رہے گا۔ تم مجھ پر پورا اعتماد کر سکتے ہو۔"

" مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو راجر!" الفرڈ نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔" مجھے معلوم ہے تم اپنی بیوی سے کتنی محبت کرتے تھے۔ ظاہر ہے، تمھاری کوشش یہی ہو گی کہ تمھاری بیوی کا قاتل کیفرِ کردار کو پہنچے۔۔۔ مجھے واقعی بہت افسوس ہے راجر لیکن تم خود دیکھ رہے ہو، حالات نے مجھے کتنا مجبور کر دیا ہے۔۔۔ مجھے اب تمھیں بھی قتل کرنا پڑے گا راجر!"

" ٹھیرو الفرڈ!" راجر زور سے چلّایا۔" پہلے میری بات سُن لو۔ تم ہیلن کے قاتل نہیں ہو۔۔۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے۔"

" تم پھر مجھے بہلانے لگے راجر! مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے ہیلن پر دست درازی کرنے کی کوشش کی تھی اور ہیلن نے مزاحمت کی تھی جس پر۔۔۔۔۔۔"

" اُس نے مزاحمت نہیں کی تھی۔" راجر اس کی بات کاٹتے ہوئے چلّایا۔" میں اُس وقت وہیں موجود تھا اور درختوں کے پیچھے چھپا ہوا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ہیلن نے تمھاری دست درازی کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ پھر تم دونوں وہیں گھاس پر لیٹ گئے تھے اور تم شراب کی زیادتی کے باعث اچانک بے ہوش ہو گئے تھے۔ ہیلن جھک کر تمھیں بیدار کرنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ اُس وقت میں نے ہیلن کے سر پر پتھر سے پہلی ضرب لگائی تھی اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مر چکی ہے تو میں نے وہ پتھر تمھارے ہاتھ میں تھما دیا تھا تاکہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ ہیلن کو تم نے قتل کیا ہے۔"

الفرڈ کچھ دیر تک فرش گھورتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر سر اٹھایا۔" کاش میں تمھاری بات پر یقین کر سکتا راجر!" اس نے کہا۔" لیکن تمھی سوچو، میں کس طرح یقین کروں؟ وہ پتھر میرے ہاتھ میں تھا۔"

"لیکن وہ پتھر تو میں نے تمھارے۔۔۔۔۔۔"

" نہیں راجر! مجھے معلوم ہے کہ ان باتوں سے تمھارا کیا مقصد ہے۔ اس میں تمھارا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔ اگر تمھاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی اپنی جان بچانے کے لیے وقتی طور پر قتل کا الزام اپنے سر لینے کی کوشش کرتا۔۔۔ مجھے بے حد افسوس ہے راجر! اب میں اتنا آگے بڑھ چکا ہوں کہ واپس نہیں جا سکتا۔ کاش میں نے تمھیں وہ خط نہ لکھا ہوتا۔" الفرڈ نے پستول سے راجر کا نشانہ لیا اور گولی چلانے سے پہلے کہا۔" کاش اس مصیبت سے نکلنے کا کوئی اور راستہ ہوتا۔"

گولی چلنے سے چند لمحے قبل راجر سوچ رہا تھا کہ کاش وہ کسی طرح الفرڈ کو یہ یقین دلا سکے کہ قاتل تم نہیں ہو، میں ہوں۔ آخری ہچکی لینے تک وہ اسی مسئلے کا حل تلاش کرتا رہا۔

ایک تنگ دست دولت مند کے بُرے وقت کی عبرت انگیز کہانی

کوڑیوں کے مول

زندہ دلوں کے لیے مغرب سے تازہ تر

دُوسرا چٹکلا

ایک دُوسری مکّار کہانی

★ نسیم سحر

ایک مرتبہ ایک ادبی تنظیم کی سالانہ تقریب منعقد ہوئی تھی۔ مجھے اُس میں خصوصی مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا۔ آپ اگر چاہیں تو ہنس لیں لیکن یقین کیجیے کہ میں ایک ادیب ہوں، کم از کم میرے ذاتی خیال کے مطابق، میرے پائے کا ادیب اس ملک میں کوئی دُوسرا نہیں ہے۔ حالانکہ دُنیا بھر میں سب سے اچھے ادیب اسی ملک میں رہتے ہیں۔ اس عزّت افزائی پر میں نے ادبی تنظیم کے سیکرٹری کو یہ نہیں لکھا کہ میں خوشی سے پھولا نہیں سما رہا ہوں لہٰذا سر کے بل چل کر حاضر ہو جاؤں گا بلکہ میں نے یہ لکھا کہ مجھے مصروفیات تو بے شمار ہیں لیکن چونکہ اتنے مختصر عرصے میں آپ کسی اور خصوصی مہمان کا انتظام نہیں کر سکیں گے اس لیے بادلِ نخواستہ میں ہی آ جاؤں گا۔

اِس سے زیادہ کمال کی بات یہ ہے کہ وہاں کھانے کی جو چیزیں موجود تھیں، وہ میں نے خوب ڈٹ کر کھائیں اور ایک عدد بصیرت افروز تقریر بھی فرمائی۔ میں ایک اچھا ادیب ہونے کے علاوہ

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

ایک اچھا مقرر بھی ہوں۔ میں نے اپنی تقریر میں بعض بڑے دلچسپ اور پُرلطف لطیفے بھی سنائے۔ چند بے وقوف مجھ سے بھی زیادہ کھا پی چکے تھے۔ شاید اسی لیے اُنھیں میری باتیں سُننے کے باوجود ہنسنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ بہر حال میں خود تقریر کے دوران میں زور زور سے قہقہے لگاتا رہا۔ یہ عظیم تقریب محض میری زندہ دلی اور شگفتہ بیانی کے باعث ساڑھے دس بجے تک مسلسل جاری رہی حالانکہ شاید سوا دس بجے تک سب لوگ کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔

ابھی میں ہال سے باہر نکل کر گھر کی طرف چلا ہی تھا کہ ایک قدر دان بڑے تپاک سے میری طرف بڑھا "ہیلو۔ آپ شاید مسٹر ایلن ہیں؟"

"جی ہاں" مجھے سخت غصّہ آیا کہ آخر اُس نے 'شاید' کا لفظ کیوں استعمال کیا؟ بھلا شہر کا کون سا آدمی مجھ سے واقف نہیں ہے؟

"مجھے افسوس ہے جناب کہ آپ مجھے پہچان نہیں رہے ہیں" اس نے جھینپتے ہوئے کہا "ہم دونوں ایک بار بی بی سی میں ملے تھے۔ یاد آیا آپ کو؟"

مجھے خاک یاد نہیں آیا۔ سچ پوچھیے تو میں نے بی بی سی کا دفتر صرف باہر سے دیکھا تھا اور شاید میں اس شخص کو واقعی نہیں جانتا تھا لیکن یہ اعتراف کرنا کہ میں اُسے نہیں پہچان سکا ہوں، میری شان کے خلاف تھا اس لیے میں نے کہا "ارے ہاں، آپ کا چہرہ جانا پہچانا سا لگ رہا ہے لیکن معاف کیجیے گا، میرا حافظہ کچھ کمزور ہو گیا ہے۔ آپ کا نام بھول رہا ہوں"

"آپ جیسے عظیم ادیب کو میرا نام یاد رکھنا یقیناً مشکل ہے آپ کے لیے اس سے زیادہ اہم باتیں یاد رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ بہر حال میرا نام اسکائی ہے۔ رابرٹ اسکائی"

"مجھے آپ سے دُوسری مرتبہ مل کر مسرّت ہوئی مسٹر اسکائی! بالکل پہلی مرتبہ کی طرح" میں نے اس کی خفگی اور اپنی خفت مٹانے کی کوشش کی۔

"تو آئیے اس خوشی میں آپ کو کسی کیفے میں کوئی مشروب پلایا جائے" وہ بولا

میں لوگوں کی دل شکنی کا باعث بننے سے گریز کرتا ہوں اور یہ موقع تو سراسر اپنے فائدے کا تھا اس لیے ہم دونوں ایک قریبی ہوٹل میں چلے گئے۔

رابرٹ اسکائی ایک اطالوی شخص تھا۔ اسے بیرونی ممالک کی سیر و سیاحت کا خاصا تجربہ تھا اس لیے وہ بڑی دلچسپ باتیں کر رہا تھا لیکن اب میں گھر جانا چاہتا تھا۔ جب ہم دونوں باہر نکلے تو اس نے پیش کش کی کہ وہ مجھے اپنی کار میں میرے گھر تک پہنچا دے گا۔ اُس نے میرے گھر کا پتہ پوچھنے کے بعد خوش ہو کر بتایا کہ وہ میرے گھر سے زیادہ دُور نہیں رہتا اس لیے مجھے گھر تک پہنچانے میں اسے قطعاً تکلیف نہیں ہو گی (اگر تکلیف ہوتی بھی تو، میں ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا) راستے میں بھی وہ بڑی دلچسپ گفتگو کرتا رہا۔ باتیں کرتے کرتے اُس نے مجھ سے پوچھا کہ "کیا آپ نوادر سے بھی کچھ دلچسپی رکھتے ہیں؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا اور کہا کہ "ہاں، خاص طور پر پُرانا فرنیچر مجھے بہت پسند ہے (یہ ذرا سستا مل جاتا ہے) اسکائی نے بتایا کہ اس کے پاس لکڑی کا ایک پُرانا اور نفیس گل دان ہے جو وہ مجھے دکھا کے مسرّت محسوس کرے گا۔ "کیا آپ چند لمحات کے لیے غریب خانے تک چل سکتے ہیں؟" اُس نے سوال کیا۔

اتنی محبت سے کی جانے والی درخواست ٹھکرانا اہلِ دل کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ میں اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ واقعی میرے گھر سے ذرا آگے ایک مختصر سے مکان میں رہتا تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر میں اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ اس نے مجھے اپنی قبول صورت اور ادھیڑ عمر بیوی سے بھی متعارف کرایا۔ میں نے ڈرائنگ روم کی آرائش اور نفاست دیکھ کر اندازہ لگایا کہ اس پر خاصی رقم صرف کی گئی ہے تاہم فرنیچر اتنا قیمتی نہیں تھا۔ ڈرائنگ روم کی دیدہ زیبی میں غالباً قیمت سے زیادہ سلیقے کو دخل تھا۔

"اور ہاں۔ میں وہ گل دان آپ کو دکھاتا ہوں" اسکائی نے کمرے کے کونے میں رکھی ہوئی شیشے کی ایک خوب صورت میز کا ڈھکنا اُٹھایا اور اس میں سے ایک شان دار گل دان نکال لیا۔ میں نے میز کے اندر رکھی اور چھوٹی چھوٹی نفیس چیزیں بھی دیکھیں لیکن ابھی ہماری واقفیت زیادہ نہیں تھی اس لیے میں نے انھیں دیکھنے اور پرکھنے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔

اسکائی نے رازدارانہ لہجے میں کہا کہ "ایک شخص نے بتایا تھا، یہ ایک نادر ترین گل دان ہے اور بہت مہنگا فروخت کیا جا سکتا ہے کیا آپ اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں مسٹر ایلن؟"

میں نے جواب دیا کہ "گل دان واقعی نادر اور قیمتی نظر آتا ہے

لیکن میں اس کی قیمت کا اندازہ لگانے میں شاید کامیاب نہ ہو سکوں"

اسکائی نے کچھ مایوس ہو کر کہا "اگر آپ خود اندازہ نہیں لگا سکتے تو مجھے کم از کم کسی ایسے دکان دار سے ملوا دیجیے جو نادر اشیا کی پرکھ اور پہچان رکھتا ہو"

فوری طور پر میرے ذہن میں کوئی نام نہیں آیا اس لیے میں نے بات بنانے کے لیے اس سے یوں ہی پوچھا "کیا آپ یہ فروخت کرنا چاہتے ہیں؟ ایسی عمدہ چیز؟"

"جی ہاں۔ آپ جانتے ہیں، آدمی کبھی کبھی ایسے قدم اٹھانے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے"

پھر اس نے مجھے گل دان فروخت کرنے کی یہ وجہ بتائی کہ آج کل اس کا ہاتھ تنگ ہے کیونکہ اس کا زیادہ تر سرمایہ امریکی کمپنیوں میں لگا ہوا ہے۔ عالمی منڈی میں کساد بازاری کا دور دورہ ہے۔ ہر شے کی قیمتیں گر رہی ہیں اور اس کے حصص پر بہت بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ وہ واقعی مشکل میں گرفتار معلوم ہوتا تھا۔ میں نے دل میں اُس بیچارے کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ آخر مجھے یاد آیا کہ نوادر خریدنے اور بیچنے کے معاملے میں میرے دو جاننے والے اس کے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ میرے ایک دوست اور اس کے باپ کا یہی کاروبار تھا۔ ان کی ایک دُکان بھی تھی جس میں صحیح معنوں میں کوئی قیمتی چیز کم نظر آتی تھی۔ میں آپ کو ان دونوں کے اصل نام نہیں بتاؤں گا۔ اس کی وجہ آپ کو بعد میں معلوم ہو جائے گی، بہر حال لڑکے کا نام آپ آزل سمجھیے۔

میں نے اسکائی سے وعدہ کیا کہ میں اُسے آزل سے متعارف کرا دوں گا۔ ہو سکتا ہے وہ اِس معاملے میں اُس کی کوئی مدد کر سکے۔

"آپ اُسے کسی دن میرے ہاں کھانے پر مدعو کر لیجیے۔ ہمیں مہمانوں کی آمد سے بڑی مسرّت ہوتی ہے۔ آیندہ ہفتے کا کوئی بھی دن مقرر کر لیجیے اور آپ خود تو اس دعوت میں شریک ہوں گے ہی"

میرے لیے یہ کہنا بڑا مشکل تھا کہ ہمیں دعوت وغیرہ کے تکلف میں پڑنے کے بجائے آزل کی دُکان پر چلنا چاہیے۔ مجھے بھی تو دعوت دی جا چکی تھی۔ چنانچہ میں نے اُس سے دوسرے دن ملنے اور دعوت کی تاریخ مقرر کرنے کا وعدہ کر لیا۔ وہ بے حد ممنون ہوا اور اپنی کار میں مجھے گھر پہنچانے بھی آیا۔ بڑا نیک آدمی تھا۔

میں دوسرے ہی روز صبح آزل کو فون کر رہا تھا۔ اس نے میری بات مکمل ہوتے ہی کہا کہ اسے اس قسم کے گل دان وغیرہ خریدنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کیونکہ وہ آج کل قدیم مصوّری کے شاہکار تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ تاہم اس نے کہا کہ میری خاطر وہ اسکائی کے ہاں جانے کی دعوت قبول کر رہا ہے اور وہ اُسے کم از کم یہ تو بتا ہی دے گا کہ گل دان کس کے ہاتھ فروخت کیا جا سکتا ہے؟

"لیکن میں اُس شخص سے کل ہی واقف ہوا ہوں۔ اُس کے متعلق مجھے زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ ویسے دیکھنے میں وہ کوئی بُرا آدمی نظر نہیں آتا" میں نے اپنی پوزیشن واضح کرتے ہوئے کہا۔ میں اسکائی کی ہر ممکن مدد کرنا چاہتا تھا لیکن نوادر کے سودے میں دھوکے کا خطرہ بھی ہوتا ہے اس لیے میں خود کو اس معاملے سے الگ تھلگ رکھنا چاہتا تھا۔ البتّہ میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ شخص اپنی چیزیں کساد بازاری سے متاثر ہو کر فروخت کر رہا ہے۔ اس طرح آزل بہت کم قیمت لگاتا۔ بہر حال پیر کو سوا آٹھ بجے اسکائی کے ہاں پہنچنا طے پا گیا۔

اتفاق سے ہم دونوں بالکل ایک وقت پر وہاں پہنچے۔ خادمہ نے معذرت طلب لہجے میں بتایا کہ مسٹر سکائی اپنی بیوی کے ساتھ ابھی ابھی کہیں سے گھر لوٹے ہیں اس لیے ہمارا خیر مقدم کرنے دروازے تک نہیں آ سکے۔ اُس نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا اور مشروبات وغیرہ لے آئی۔ میں نے آزل کو شیشے کی وہ میز دکھائی جس میں گل دان تھا اور دُوسری چھوٹی چھوٹی چیزیں تھیں۔ آزل نے بہ ظاہر کسی خاص دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس نے یہی کہا کہ کوئی بھی چیز بہت زیادہ قیمتی نہیں ہے اور اس ساری میز کے بمشکل ساٹھ ستّر پونڈ مل سکیں گے۔ پھر اچانک آزل خاموش ہو گیا اور میز کے قریب جا پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ وہ میز کے پاس دیوار پر لگی ہوئی ایک پُرانی تصویر غور سے دیکھ رہا ہے۔ اس نے مجھ سے کچھ کہا نہیں لیکن کمرے کی تمام تصویریں توجّہ سے دیکھتا رہا۔ وہ تصویریں تھیں بھی دیکھنے کے قابل۔ ایک تو اتنی پُرانی تھی کہ میں سمجھ ہی نہیں سکا مصوّر نے کس چیز کی تصویر بنائی ہے؟ لیکن باقی اچھی حالت میں تھیں۔ یہ لکڑی کے آٹھ دس انچ چوکور ٹکڑوں پر نہایت نفاست سے بنائی گئی تھیں۔ ان پر قدیم ترین داستانوں کے کرداروں کی شکلیں بنی ہوئی تھیں۔ میں آزل سے پوچھنے ہی والا تھا کہ یہ تصویریں تاریخ کے کس عہد سے تعلق رکھتی ہیں؟ اُسی وقت اسکائی اپنی بیوی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

مجھے اس دعوت کی کوئی خاص بات یاد نہیں ہے مگر یہ ضرور یاد ہے کہ آزل میری توقع سے زیادہ خوش اخلاقی کے ساتھ ان سے گفتگو کر رہا تھا۔ اسے جب وہ میز دکھائی گئی تو اُس نے واضح طور پر وہی بات کہہ دی جو تھوڑی دیر پہلے مجھے بتا چکا تھا۔ پھر اسکائی اور آزل تصاویر کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ اسکائی نے اُداس لہجے میں کہا "کتنے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

ایک شخص ہوٹل میں کھانا کھا رہا تھا۔ کھاتے کھاتے اس نے بیرے کو ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا اور پوچھا "کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ یہ مچھلی جو میں کھا رہا ہوں کب خریدی گئی تھی؟"

بیرے نے لجاجت اور انکسار سے جواب دیا "جناب والا! میں کچھ نہیں جانتا کیونکہ مجھے یہاں ملازم ہوئے صرف بیس دن ہوئے ہیں!"

افسوس کی بات ہے کہ یہ تصویریں اصلی نہیں ہیں بلکہ نقلی ہیں۔ یہ میں نے اٹلی کے ایک کباڑی سے بے حد سستے داموں خریدی تھیں اور اب تو میرے نزدیک یہ دو کوڑی کی بھی نہیں ہیں۔ میں انھیں جلد ہی اتار پھینکوں گا۔"

"نہیں مسٹر اسکائی" آزل کی آواز میں دبی دبی دلچسپی تھی۔ "اب یہ ایسی بُری بھی نہیں ہیں۔ کم از کم اصلی تصویروں سے کچھ نہ کچھ مشابہت تو رکھتی ہی ہیں۔"

اس کے بعد ہم دوسرے موضوعات پر گفتگو کرنے لگے۔ آزل نے برسبیلِ تذکرہ کہا کہ اُس کے ڈیڈی کے پاس بدھ کے لیے سنیما کے کچھ پاس رکھے ہوئے ہیں۔ کیا ہم سب بدھ کو اُس کے ساتھ کسی جگہ کھانا کھانے کے بعد فلم دیکھنا پسند کریں گے؟ اسکائی اور اس کی پُرکشش بیوی نے کسی تکلف کے بغیر حامی بھر لی لیکن میں خاموش رہا۔ آپ میری پوزیشن تو سمجھ رہے ہوں گے؟ میں نہ تین میں، نہ تیرہ میں۔ بسا اوقات لوگوں کو آپ کی طرف محض اس لیے توجہ دینی پڑتی ہے کہ آپ سامنے موجود ہوتے ہیں ورنہ اُنھیں آپ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر آپ کسی پروگرام میں اُن کے ساتھ شامل نہ ہوں تو ہرگز کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آزل نے مجھے بھی مدعو کیا۔ میں نے معذرت چاہی لیکن دونوں فریقوں نے مجھ پر کچھ زور دیا تو میں راضی ہو گیا۔ دل سے میں بھی یہی چاہ رہا تھا۔

میں اصل میں اب کچھ متجسس ہو گیا تھا۔ آزل کا حُسنِ سلوک، اُس کی میٹھی میٹھی باتیں، اس کی خوش اخلاقی۔ یہ سب کچھ اس کے عمومی رویے اور عادات سے یکسر مختلف تھا۔ اسکائی کی قبول صورت اور ادھیڑ عمر بیوی کو دیکھ کر آزل سے متعلق مجھے کوئی ایسا ویسا شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا اور اگر ایسا ہوتا تو وہ اس پروگرام میں اپنے باپ کو کبھی شامل نہ کرتا۔ آزل کا باپ نہ صرف ایک نظر باز شخص تھا بلکہ آزل پر کڑی نظر بھی رکھتا تھا۔ بہرحال کوئی نہ کوئی وجہ ضرور تھی جس نے آزل کو اتنا خوش اخلاق اور متواضع بنا دیا تھا۔

اسکائی اور اس کی عفیفہ بیوی نے کہا کہ وہ دعوت کے روز ٹھیک وقت پر ہوٹل پہنچ جائیں گے مگر توبہ کیجیے صاحب، آزل تو فرشتہ تھا۔ اُس نے اصرار کیا کہ وہ اور اُس کے ڈیڈی اپنی کار میں اُنھیں لینے یہیں آئیں گے سوا سات بجے انھیں تیار رہنا چاہیے اور مجھے بھی۔ میں نے اسکائی کے ہاں پہنچ جانے کا وعدہ کر لیا۔

میں بُدھ کی شام پورے سوا سات بجے اسکائی کے ہاں پہنچا۔ گھر کے باہر ایک لمبی سی کار کھڑی تھی۔ گویا آزل اور اس کا باپ مجھ سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے۔ خادمہ مجھے یہ بتاتے ہوئے ڈرائنگ روم میں لے گئی کہ مسٹر اور مسز اسکائی چند منٹ بعد تشریف لانے والے ہیں۔

آزل اور اس کا باپ میز کے پاس کھڑے ہوئے تصاویر دیکھ رہے تھے۔ مجھے آتے دیکھ کر وہ اس طرح ایک طرف ہٹ گئے جیسے انھیں تصاویر سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ "معاف کیجیے گا۔ مجھے شاید کچھ دیر ہو گئی۔" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا حالانکہ مجھے معلوم تھا میں بالکل صحیح وقت پر پہنچا ہوں۔

"ارے نہیں۔ یہ آزل کی غلطی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ شاید سات بجے کا وقت دیا گیا ہے۔"

چند منٹ بعد مسٹر اسکائی اپنی بیوی کے ساتھ آ گئے۔ "حضرات! میں بے حد معذرت خواہ ہوں۔" اسکائی نے ہم سب کا خیر مقدم کرنے کے بعد کہا۔ "اصل میں ہم لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ ساڑھے سات بجے کا وقت مقرر ہوا ہے۔"

میں نے سوچا، عجیب بے ہوش لوگ ہیں یہ، کوئی وقت سے پہلے آ گیا اور کوئی بعد میں آ رہا ہے، صرف میں وقت پر آیا ہوں۔

شان دار دعوت کھانے اور فلم دیکھنے کے بعد اسکائی نے کہا کہ کیوں نہ ہم سب ایک ایک گلاس مشروب پینے کے لیے ان کے ہاں چلیں۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ گھر پہنچ کر اسکائی نے ذرا جھجکتے ہوئے اپنے کاروباری نقصانات اور حصص کی قیمت کم ہونے کا ذکر کیا۔ اس نے کہا۔ "ہم لوگ بعض وجوہ سے سال کا کچھ حصہ یہاں لندن میں اور کچھ حصہ اٹلی میں گزارتے تھے لیکن اب ہمیں مجبوراً یہ مکان اور فرنیچر وغیرہ فروخت کر کے اٹلی میں مستقل آباد ہونا ہے۔"

مسز اسکائی نے شیریں اور مترنم لہجے میں آزل سے دریافت کیا "کیا آپ کی نظر میں کوئی ایسا شخص ہے جو یہ سب چیزیں خریدنے سے دلچسپی رکھتا ہو؟"

باپ اور بیٹے نے اس طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی بات کر رہے ہوں، پھر آزل نے اسکائی سے کہا "ہاں کوئی نہ کوئی خریدار تو مل ہی سکتا ہے بشرطیکہ قیمت مناسب ہو۔"

اسکائی نے کہا کہ وہ چھ ہزار پونڈ میں سب کچھ فروخت کرنے کے لیے تیار ہے۔ میں سمجھا کہ اُس نے مذاق کیا ہے۔ چھ ہزار پونڈ تو بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے، صرف چھ سو پونڈ بھی کچھ زیادہ ہی قیمت تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اتنی مبالغہ آمیز قیمت سُن کر باپ اور بیٹا دونوں اُچھل پڑیں گے لیکن نہیں، وہ خاموش بیٹھے رہے۔ چند لمحوں بعد آزل نے خیال ظاہر کیا کہ یہ قیمت کچھ زیادہ ہے۔ اس کی رائے میں تمام سامان کی قیمت دو ہزار کے لگ بھگ تھی، اِس سے زیادہ نہیں۔ میں نے سوچا کہ اگر کسی پاگل نے اسے دو ہزار میں بھی خرید لیا تو بعد میں کفِ افسوس ملتا رہے گا لیکن اب دونوں فریق مختلف اشیا کی قیمتوں کے تعین میں سر کھپا رہے تھے۔ مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ یہ فرنیچر آزل کو پسند آ چکا ہے اس لیے وہ یہی چاہتا ہے کہ سودا ہو ہی جائے۔ باقی چیزیں وہ غالباً بعد میں کسی اور کے ہاتھ بیچ دے گا۔

"اچھا تو جناب!" اسکائی نے آخر میں کہا۔ "بات یہ ہے کہ میں نے تصویروں کے سوا ہر چیز انتہائی معقول قیمت دے کر خریدی تھی۔ تصویریں تو کاٹھ کباڑ ہیں لیکن دوسری چیزوں پر میں نے بہت کچھ خرچ کیا ہے۔ ملا جُلا کر کوئی چار ہزار پونڈ کی رقم بنتی ہے۔ آپ کی خاطر میں چار ہزار پونڈ لے لوں گا، شرط یہ ہے کہ رقم نقد ادا کی جائے۔"

چند لمحوں بعد چار ہزار پر سودا ہو گیا۔ مجھے تعجب اس بات پر ہوا کہ آزل اور اس کا باپ نقد رقم ادا کرنے کے لیے کیسے رضامند ہو گئے؟ نوادر کے تاجروں کو تو بہت محتاط ہونا چاہیے۔ نقد رقم کے بجائے چیک دینا بہتر ہوتا ہے تاکہ کسی گڑبڑ کا احتمال نہ رہے۔ البتہ ایک بات سے ان کی احتیاط پسندی ظاہر ہوتی تھی۔ اُنھوں نے کہا کہ کل اُن کا کلرک آکر تمام اشیا کی فہرست بنائے گا۔ محفل برخاست ہو گئی۔ میں اب تک یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ دونوں فریقوں میں سے کون گھپلا کر رہا ہے اور کس سے؟

میں نے سوچا کہ ان دونوں کی مہمان نوازی کا بدلہ مجھے بھی چکانا چاہیے۔ چنانچہ میں نے ان سب سے وعدہ لے لیا کہ جمعے کو یعنی جس دن رقم ادا ہونی تھی، وہ سب کلب میں دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیں۔

میرا خیال تھا کہ رقم ادا ہوتے وقت کوئی حیران کن موڑ آئے گا مگر یہ خیال خام ثابت ہوا۔ ادائی اور وصولی کے وقت کوئی مشکل پیدا نہیں ہوئی۔ اسکائی نے نوٹ گن کر بڑے اطمینان سے جیب میں ڈال لیے اور رسید پر دستخط کر دیے۔ پھر ہم سب نے کلب میں کھانا کھایا۔ اسکائی میرے متعلق بار بار اچھے جذبات کا اظہار کر رہا تھا۔ اس کی مہذب بیوی بھی مجھے

مشہور

مقرر برک پارلیمنٹ میں دھواں دھار تقریر کر رہا تھا۔ برک کا بھائی حیرت سے یہ تقریر سُن رہا تھا اور کچھ سوچ رہا تھا۔ کسی ممبر نے برک کے بھائی کا شانہ پکڑ کے ہلا دیا، پوچھا "تم کیا سوچ رہے ہو میرے دوست؟"

برک کے بھائی نے جواب دیا "برک میرا بھائی ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس نے ہمارے پورے خاندان کی دماغی قوت پر کس طرح قبضہ کر لیا ہے!"

ممبر نے ہنس کر سوال کیا "پھر کس نتیجے پر پہنچے؟"

برک کے بھائی نے ہنس کر جواب دیا "اس نتیجے پر کہ جب ہم لوگ کھیلا کرتے تھے یا باتوں میں مشغول ہوتے تھے تو برک کسی نہ کسی کتاب کے مطالعے میں مشغول ہوتا تھا!"

ایک دل آویز تبسم کے ساتھ تشکر کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ان کے خیال میں میرے بغیر یہ سودا مشکل سے تکمیل کو پہنچتا۔ اسکائی نے آزل سے خاص طور پر یہ درخواست کی کہ شیشے کی میز میں سے کوئی چیز تحفے کے طور پر مجھے بھی دی جائے۔ میں نے بار بار انکار کیا لیکن جب آزل بھی مصر ہوا تو میں آمادہ ہو گیا۔

کھانا ختم ہوتے ہی اسکائی نے معذرت کرتے ہوئے درخواست کی کہ انھیں ایک دوست نے میٹنی شو کے لیے مدعو کیا ہوا ہے اس لیے وہ اجازت چاہتے ہیں۔ وہ روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد آزل اور اس کے باپ نے کہا کہ وہ ذرا مسٹر اسکائی کے مکان تک جانے کا ارادہ رکھتے ہیں، اگر میں چاہوں تو اُن کے ساتھ چل کر ابھی اپنے لیے کسی شے کا انتخاب کر سکتا ہوں۔ میں ساتھ ہو گیا۔ جب ہم اسکائی کے گھر پہنچے تو دروازہ آزل کے کلرک نے کھولا۔ "وہ لوگ یہاں سے روانہ ہو چکے ہیں۔۔۔ ابھی ابھی۔"

آزل نے کہا۔ "تم ہوش میں ہو یا نہیں؟ وہ تو چند لمحے پیشتر ہم سے رخصت ہو کر فلم دیکھنے گئے ہیں؟"

"جی نہیں۔ وہ فلم دیکھنے نہیں گئے تھے بلکہ یہاں آئے تھے۔ اُن کا سامان پہلے ہی سے تیار تھا لہٰذا آتے ہی رخصت ہو گئے۔ خادمہ بھی اُن کے ساتھ گئی ہے۔"

"لیکن ہم نے جو چیزیں خریدی ہیں، وہ تو یہیں ہیں نا؟" آزل کے باپ نے گھبرا کر پوچھا۔

"جی ہاں۔ آپ مطمئن رہیے، میں نے فہرست کے مطابق تمام اشیا گن لی ہیں۔"

آزل اور اس کا باپ دوڑتے ہوئے ڈرائنگ روم میں پہنچے۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

ORIENT

میں بھی ان کے پیچھے تھا۔ انھوں نے اندر پہنچتے ہی فرنیچر یا میز پر نگاہ نہیں ڈالی بلکہ سیدھے پُرانی تصویروں کی طرف بڑھے۔ پھر انھوں نے جلدی جلدی سب تصویریں دیوار سے اُتاریں اور انھیں دیکھنے کے بعد افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے بولے "آہ ___ یہ ___ یہ جعلی ہیں۔ یہ نقلی ہیں۔"

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔ "یہ تو تھیں ہی نقلی۔ مسٹر اسکائی نے مجھے بتایا تھا۔ شاید آپ سے بھی ذکر ہوا تھا۔"

"ہاں ذکر ہوا تھا لیکن جو تصویریں ہم نے یہاں دیکھی تھیں، وہ اصلی تھیں۔ اُن میں سے ہر تصویر اصلی تھی۔ وہ چودھویں صدی کی نادر ترین تصویریں تھیں۔ ایک ایک تصویر کم از کم پانچ پانچ ہزار پونڈ میں بِک سکتی تھی۔"

"لیکن یہ سب ہوا کیسے؟ میں تو کچھ سمجھا نہیں؟" میں نے کہا۔ "کیا یہ وہی تصویریں نہیں ہیں؟"

"نہیں، یہ وہ نہیں ہیں۔ یہ سب جعلی ہیں۔ آخر ہم اتنے گدھے تو نہیں ہیں کہ اس گھٹیا فرنیچر کے لیے چار ہزار پونڈ ادا کرتے۔ ہم نے اصلی تصویریں دیکھی تھیں۔ آہ!"

آزل کے باپ کی حالت آزل سے بھی بُری تھی۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ یہ بوڑھا شخص شیر کی طرح غرّاتا ہوا کہیں جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے لیکن تھوڑی دیر بعد ان دونوں کی پریشانی کچھ کم ہوگئی۔ آزل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ہم سے بہت بڑا دھوکا ہوا ہے خیر..... اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ میرا خیال ہے، اگر ہم یہ تصویریں ملیگن کے ہاتھ بیچ دیں تو کچھ نہ کچھ رقم ضرور مل جائے گی۔ اُسے کیا پتہ چلے گا کہ یہ اصلی ہیں یا نقلی؟"

میں نے اُن سے دریافت کیا کہ ملیگن کون ہے اور وہ نقلی تصویریں کیسے خرید سکتا ہے؟ انھوں نے بتایا کہ وہ ایک امریکی باشندہ ہے جسے پرانی تصویروں سے بہت دلچسپی ہے۔ اسے خاص طور پر چودھویں صدی کے اطالوی مصوروں کی تصاویر کی تلاش ہے۔ وہ آج کل لندن میں چھٹیاں گزارنے آیا ہوا ہے اور کوئی ایک ہفتے قبل آزل کے پاس آیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُسے چودھویں صدی کی کوئی بھی اطالوی تصویر مل جائے۔ اس نے کہا تھا۔ "میں فوراً خرید لوں گا کیونکہ مجھے امریکہ کے ایک کروڑپتی کو ہر قیمت پر چند ایسی تصویریں مہیا کرنی ہیں۔"

ملیگن کسی اچھی تصویر کے لیے بیس ہزار پونڈ تک دینے کے لیے تیار تھا بشرطیکہ وہ ہر طرح اصلی نظر آتی ہو۔

میں نے سوچا، کمال ہے۔ بیس ہزار پونڈ کسی ایک تصویر کے لیے! لوگ بھی کس کس طرح اپنا شوق پورا کرتے ہیں۔ خصوصاً امریکی سرمایہ دار تو اپنی دولت کی نمائش کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں لیکن بہرحال یہ ایک طرح کی قدردانی ہوتی ہے۔ خود مجھے بھی ایک بار نیویارک کی ایک یونیورسٹی نے چند لیکچر دینے کے لیے بلایا تھا اور دس ہزار ڈالر دینے کی پیش کش کی تھی۔ میں گیا تو نہیں مگر یہ بھی قدردانی کی ایک مثال تھی۔ جب کہ میں چودھویں صدی کی کوئی تصویر نہیں ہوں بلکہ بیسویں صدی کا ایک ادیب ہوں۔

اب ساری بات میری سمجھ میں آچکی تھی۔ شاید آپ نہ سمجھ سکے ہوں کیونکہ ہر شخص کو میری طرح فہم و فراست نہیں نصیب ہوتی۔ ہوا یہ تھا کہ آزل اور اس کے باپ نے واقعی اصلی تصاویر دیکھی تھیں جنھیں اسکائی نقلی کہہ رہا تھا۔ آزل اور اس کے باپ کو خیال ہوا کہ اگر وہ انھیں سستے داموں خرید لیں تو دولت کمانے کا ایک سنہرا موقع مل جائے گا۔ اسی خیال سے انھوں نے مسٹر اور مسز اسکائی کی (اور میری) فیاضانہ دعوتیں کیں۔ مسٹر اسکائی نے ایک سادہ لوح آدمی کا کردار ادا کرنے میں بڑی ہوشیاری دکھائی اور اُن دونوں سے سودا کر لیا لیکن جاتے جاتے بڑی چالاکی سے جعلی تصاویر وہاں لٹکا دیں اور اصلی اپنے ساتھ لے گئے۔

اب آزل اور اس کا باپ اس دھوکے بازی کا حساب ایک اور شخص کو دھوکا دے کر چکا دینا چاہتے تھے۔ اس طرح انھیں اپنی کھوئی ہوئی رقم پر کئی گنا منافع ملتا۔ مسٹر ملیگن کو جعلی تصاویر تھما دی جاتیں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ملیگن کہاں ٹھیرا ہوگا؟ وہ چھٹیاں گزارنے آیا تھا اور ایک ہفتے پہلے آزل سے ملا تھا یعنی آزل مسٹر اسکائی کے ملنے سے پہلے ملیگن سے ملا تھا۔ مجھے فوراً ایک شبہ ہوا۔ میں نے کہا۔ "آزل! یہ ملیگن ٹھیرا کہاں ہے؟ فون کر کے معلوم تو کرو کہ وہ وہاں ہے بھی یا نہیں؟"

فون کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ شخص صرف تھوڑی دیر پہلے ہوائی اڈے پہنچ چکا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اسکائی اور اس کی عفت مآب بیوی اور ملیگن نے ایک ہی طیارے میں سفر کیا ہوگا اور آج کل وہ کسی دوسرے شہر میں کوئی دوسرا شکار پھانسنے کے چکر میں ہوں گے۔

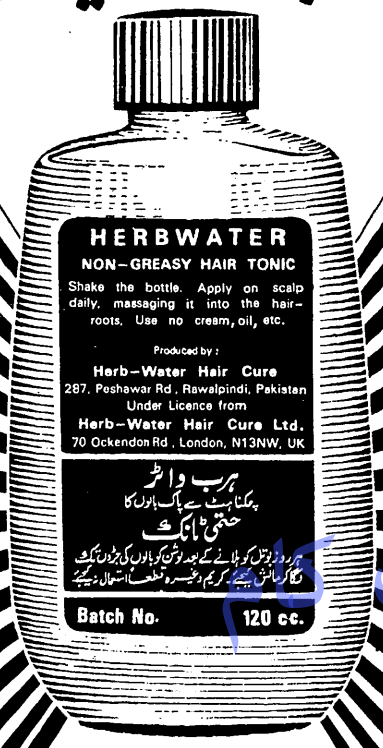

اس سودے میں مجھے بھی ایک نقصان اٹھانا پڑا۔ آزل مجھے وہ تحفہ دینا بھول گیا جس کی مسٹر اسکائی نے سفارش کی تھی۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

ایک بے غیرت شخص کی کہانی جب اسے غیرت آگئی تھی

تیسرا چٹکلا ★ یوسف جمال

ٹیلی پیتھی

ناراض وقت کے لیے مغرب کی ایک تیسری شوخ کہانی

لیوی کا تعلق خوش حال متوسط طبقے سے تھا۔ اُس کے ایک دوست کی سال گرہ ہو رہی تھی۔ لیوی اس تقریب میں تاش کھیل رہا تھا۔ اُس کی تیوریوں پر بل پڑے ہوئے تھے، اچانک اُسے احساس ہوا کہ اُس نے ایک طویل مدت سے بوتل کو منہ نہیں لگایا ہے۔ اُس نے سوچا آج ضرور پینی چاہیے۔ اس تصور ہی نے اُس پر سرور کی کیفیت طاری کر دی۔ وہ جھومتا ہوا اُٹھا اور تقریباً لڑکھڑاتا ہوا ایک ہال کی طرف گیا۔ ہال میں نوجوان جوڑے ایک دوسرے سے گتھے ہوئے رقص کر رہے تھے۔ لیوی ہجوم چیرتا ہوا ایک چھوٹے سے دروازے کے ذریعے ڈائننگ روم میں پہنچ گیا۔ یہاں ایک میز پر کھانے پینے کی بہت سی چیزیں اور آبِ نشاط کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔ اُس کی نظر تلی ہوئی مچھلی پر پڑی۔ اُس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ لیوی نے ایک جام بھرا اور اُسے غٹاغٹ چڑھا گیا۔ پھر اُس نے تیزی سے تلی ہوئی مچھلی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ابھی اُس نے چھری اور کانٹا سنبھالا ہی تھا کہ قریب کی خواب گاہ سے آتی ہوئی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ ”ٹھیک ہے۔“ ایک نسوانی آواز کہہ رہی تھی۔ ”مگر کب ڈارلنگ؟“

”یہ میری بیوی ہے۔“ لیوی نسوانی آواز پہچان کر زیرِ لب بڑبڑایا۔ ”پتہ نہیں کس سے باتیں کر رہی ہے؟“

”جب بھی تم چاہو۔“ ایک گرج دار مردانہ آواز نے سرگوشی میں جواب دیا۔ ”لیکن آج مناسب نہیں ہے اور کل میں سارا دن مصروف رہوں گا۔ تم اتنی بے قرار کیوں ہو؟ میں بھاگ تو نہیں جاؤں گا۔“

”ارے یہ تو جاریف ہے۔“ لیوی نے اپنے دوست کی آواز پہچانتے ہوئے دل میں کہا۔ ”کمینہ کہیں کا..... اِس عورت نے اسے بھی اپنے جال میں پھنسا لیا؟ عجیب عورت ہے۔ کسی ایک جگہ ٹکتی ہی نہیں! ایسی غیر مطمئن عورت ساری زندگی میں میں نے نہیں دیکھی۔ وہ اس قسم کے کھیل تماشوں کے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکتی۔“

”ہاں شہزادی! کل میں بے حد مصروف رہوں گا۔“ مردانہ آواز جاری تھی۔ ”تم مجھے محبت نامہ لکھو گی؟ شوق سے لکھو۔ یقیناً مجھے اس سے بڑی خوشی ہو گی لیکن ہمیں خط و کتابت شروع کرنے کے لیے کوئی مناسب اور محتاط طریقہ اختیار کرنا ہو گا۔ اگر ہم اپنے خطوط ڈاک کے ذریعے بھجوائیں گے تو یہ معاملہ طشت از بام ہو جانے کا خدشہ رہے گا۔ اِس طرح تمہارے چغد شوہر کو بھی ہماری خط و کتابت کا پتہ چل جائے گا اور میری بیوی بھی بے خبر نہیں رہ سکے گی۔ وہ میری غیر موجودگی میں تمہارا خط کھول کر پڑھ سکتی ہے اور.....“

”پھر آخر ہم کیا کریں؟“ لیوی کی بیوی نے پوچھا۔

”کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ ٹھیرو، ابھی سوچ لیتے ہیں..... کسی ملازم کے ذریعے خط بھجوانا بھی حماقت ہو گی کیونکہ تمہارا کیکڑا شوہر ملازموں کی نقل و حرکت پر یقیناً نظر رکھتا ہو گا..... میرا خیال ہے وہ اب تک تاش کے پتوں میں الجھا ہوا ہو گا۔“

”ہاں یقیناً۔ حالانکہ وہ احمق ہمیشہ ہارتا ہے!“

”پھر تو وہ محبت کے معاملے میں بڑا خوش قسمت نکلا۔“ جاریف نے ایک قہقہہ بلند کیا۔ ”اچھا سنو میری شہزادی! میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔ میں کل شام چھ بجے دفتر سے لوٹتے وقت عوامی باغ کے قریب سے گزروں گا۔ تم اس باغ میں گئی تو ہو نا؟“ لیوی کی بیوی نے شاید اثبات میں سر ہلایا ہو گا۔ جاریف نے مسرت کے لہجے میں کہا۔ ”تو پھر ٹھیک ہے۔ باغ کے جنوبی دروازے کے قریب انگور کی بیلوں کے نیچے ایک بڑا گملا ہے۔ تم کل شام چھ بجے سے کچھ دیر قبل اُس گملے میں میرے نام پرچہ لکھ کر ڈال دینا۔ کیا تم نے وہ گملا دیکھا ہے؟“

”ہاں بھئی، میں اس باغ کے چپے چپے سے واقف ہوں۔“

”کیا یہ ایک پُر اسرار اور شاعرانہ عمل نہیں ہو گا؟ اِس طرح تمہارے چغد شوہر کو بھی کچھ پتہ نہیں چلے گا اور میری بے وقوف بیوی بھی اس سے لاعلم رہے گی۔ میرا خیال ہے، یہ پروگرام بے حد مناسب رہے گا؟“

لیوی نے آبِ نشاط کا ایک اور جام چڑھایا پھر تاش کے پتوں کی طرف دوبارہ لوٹ گیا۔ اُس پر حالیہ انکشافات کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا تھا، نہ ہی اُس کے دل میں حسد، رقابت یا غصّے کے جذبات نے سر اُٹھایا تھا۔ اُس کی بیوی شروع سے ایسی ہی تھی۔ اب اُس نے عاجز آ کر اُس کی ان حرکتوں سے چشم پوشی کرنی شروع کر دی تھی اور اُسے پیٹنا یا بُرا بھلا کہنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اُس نے تمام اُمیدیں توڑ لی تھیں۔ بس خاموشی سے اپنی بیوی کے نئے نئے رومان دیکھتا رہتا تھا مگر ان تمام باتوں کے باوجود آج اُسے ایک عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی اور اُس کی توجہ بار بار اپنی بیوی اور جاریف کے مکالموں کی طرف لوٹ رہی تھی۔ شاید اُسے اپنے متعلق اُن کے منہ سے نکلنے والے تمسخر کے خطابات بہت ناگوار گزرے تھے۔

”اُف! یہ شخص کتنا بدکار اور عیّار ہے۔“ اُس نے پتے پھینٹتے ہوئے جاریف کے بارے میں سوچا۔ ”وہ مجھ سے کس قدر خوش اخلاقی اور گرم جوشی سے ملتا ہے۔ مجھے اپنا دوست کہتا ہے لیکن میرے پیٹھ پیچھے وہ کتنی گھناونی حرکت کر رہا ہے۔ کتنی ذلیل باتیں کرتا ہے۔ مجھے کوڑھ مغز، چغد اور کیکڑا تک کہتا ہے؟“ وہ جتنی بازیاں ہارتا رہا اُس کی اُداسی غصّے میں ڈھلتی گئی۔

”ابھی تو اُس کے منہ سے دودھ کی بُو آتی ہے۔ وہ کس شخص کا مقابلہ کر رہا ہے۔“ لیوی نے ایک پتّا پھینکتے ہوئے سوچا۔ ”وہ ذلیل کسی سنپولیے سے کم نہیں ہے، اگر بات معمولی مار کٹائی سے ختم ہونے والی ہوتی تو میں اسے بتاتا کہ میں کتنا کوڑھ مغز ہوں۔“

لیوی کھانے کے دوران میں جاریف سے نظریں نہیں ملا رہا تھا حالانکہ جاریف پوری طرح اُس کی طرف متوجہ تھا اور گویا دانستہ اُس کے سینے پر مونگ دَلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”تم جیتے یا ہارے؟ تم اتنے اداس کیوں ہو؟ خدانخواستہ تمہاری طبیعت تو ناساز نہیں ہے؟“ جاریف سوالات کے نشتر چبھوتا رہا۔ باتوں باتوں میں اُس نے لیوی کی بیوی کو بھی بُرا بھلا کہا کہ وہ اپنے شوہر کی صحت کا خیال نہیں رکھتی۔

لیوی کی بیوی ایک معصوم اور پاک باز عورت کی طرح بے جھجک ہو کر بار بار لیوی سے آنکھیں چار کر رہی تھی۔ وہ اِس قدر مطمئن اور پُرسکون تھی کہ اگر ابلیس بھی ہوتا تو اُس پر بے وفائی کا شبہ نہیں کر سکتا تھا۔

گھر پہنچ کر لیوی کی طبیعت کچھ زیادہ بے چین اور اداس ہو گئی۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس نے دعوت میں سڑی گلی چیزیں کھا لی ہیں۔ وہ یہ تمام واقعات اپنے ذہن سے یکسر بھلا سکتا تھا لیکن اُس کی بیوی کی چہلیں اور اٹکھیلیاں جلتی پر تیل کا کام کر رہی تھیں۔ لیوی نے سوچا۔ ”مجھے بھری محفل میں گھونسا مار کے جاریف کی ناک پچکا دینی چاہیے تھی..... سب کی موجودگی میں۔“

وہ اِس تخیّل میں کھو گیا کہ اگر جاریف کو مقابلے کی دعوت دے کر اُسے گولی کا نشانہ بنائے تو کتنا مزہ آئے؟ اور اگر اُسے ملازمت سے نکلوا دیا جائے تو اور زیادہ اچھا ہو۔ لیوی جاریف سے بدلہ لینے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

کے مختلف طریقے سوچ رہا تھا۔ اچانک اُس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ اُس نے سوچا کہ اگر میں اُس گملے میں پہلے ہی سے کوئی چیز رکھ دوں تو اچھا ہو..... یا پھر اپنی بیوی کا لفافہ نکال کر اُس میں خط کی جگہ کوئی بے ہودہ اور فحش گیت رکھ دوں؟

لیوی دیر تک خواب گاہ میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتا رہا۔ اُس کی بیوی بڑے مزے سے گرم لحاف میں گہری نیند کے مزے لے رہی تھی۔ پھر لیوی نے ایک ترکیب سوچ ہی لی اور خوشی سے بے ساختہ نکلنے والی آواز بڑی مشکل سے قابو میں کی "بہت خوب یہ خیال بہت عمدہ ہے۔"

جاریف ایک بڑی تجارتی کمپنی میں ملازم تھا اور کمپنی کا مالک ڈرلی نوف شہر کے چند معروف دولت مندوں میں سے ایک تھا۔

لیوی نے جلدی سے ایک سادہ کاغذ نکالا اور اپنی تحریر خاصی تبدیل کر کے دانستہ غلط ہجے میں ایک پیغام لکھا "مسٹر ڈرلی نوف! عوامی باغ کے جنوبی دروازے کے قریب انگوروں کی ایک بیل ہے۔ اُس کے نیچے ایک بڑا گملا رکھا ہوا ہے۔ تم بارہ ستمبر کو شام کے چھ بجے تک اُس گملے میں مبلغ تین سو ڈالر نقد رکھ دینا اگر تم نے یہ مطالبہ پورا نہ کیا تو کان کھول کے سُن لو کہ زندہ نہیں بچو گے اور تمہارا بنگلا بم سے اُڑا دیا جائے گا۔"

لیوی نے سوچا ڈرلی نوف یہ تحریر لے کر سیدھا پولیس کے پاس جائے گا پھر مقررہ وقت پر بلکہ صبح سے خفیہ پولیس کے آدمی عوامی باغ میں پھیل جائیں گے تاکہ گملے کی نگرانی کر سکیں اور جب ٹھیک چھ بجے جاریف گملے میں ہاتھ ڈالے گا تو اُسے اچانک اپنی گردن پر کسی سپاہی کا بھاری بھرکم ہاتھ محسوس ہوگا اور اس سے قبل کہ وہ تھانے پہنچ کے کسی اعلا افسر پر حقیقتِ حال واضح کرے، اُس کی حالت غیر ہو چکی ہو گی اور وہ کافی ذلیل و خوار ہو جائے گا نیز ملازمت سے اُسے ہر قیمت پر ہاتھ دھونا پڑے گا۔

لیوی نے لفافے پر ٹکٹ لگایا اور ارجنٹ ڈیلیوری کے ذریعے خط روانہ کر دیا۔ پھر اُسے بہت گہری اور اطمینان بخش نیند آئی۔ ایسی نیند کو وہ ایک مدّت سے ترسا ہوا تھا۔ جب صبح اُس کی آنکھ کھُلی اور اُسے اپنا منصوبہ یاد آیا تو وہ عجیب سی فرحت محسوس کرنے لگا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اتنا خوش کہ اپنی بے وفا بیوی سے چھیڑ خانی پر اُتر آیا۔

بیوی حیران تھی کہ آج لیوی کو کیا ہو گیا ہے؟ مگر شاید اُس نے اسے لیوی کے کسی اچھّے خواب کا ردِّ عمل سمجھ کر زیادہ اہمیت نہیں دی دفتر جاتے وقت اور دفتر میں کام کرتے وقت بھی لیوی کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ کھیلتی رہی۔ جاریف کا خوف زدہ اور پریشان چہرہ بار بار اُس کی نظروں میں گھوم جاتا تھا۔

ابھی پونے چھ بجے تھے مگر وہ بے چین ہو گیا اور تمام کام سمیٹ سماٹ کر جلدی سے باہر آ گیا تاکہ چھُپ کر جاریف کی بے عزتی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اُس نے سوچا شاید اس طرح مجھے کچھ زیادہ سکون میسّر آ جائے۔ اُس کی نظر باغ کے قریب ٹہلتے ہوئے دو سپاہیوں پر پڑی، خوشی سے اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اُسے اپنے منصوبے کی کامیابی قریب نظر آ رہی تھی۔ وہ گملے کے قریب ایک گھنے درخت کی اوٹ میں بنچ پر بیٹھ گیا۔ اُس کی نظریں برابر گملے پر مرکوز تھیں۔

تقریباً چھ بجے اُسے جاریف دُور سے آتا دکھائی دیا۔ وہ بہت خوش گوار موڈ میں تھا اور شاید کسی فلمی نغمے کی دھُن گنگنا رہا تھا۔ لیوی کو ایسا محسوس ہوا جیسے اِس نوجوان کے چہرے پر سارے جہاں کی خوشیاں اُمڈ آئی ہیں۔

"کمینہ، ذلیل انسان...... اب اُسے پتہ چلے گا کہ کیکڑا کون ہے اور کوڑھ مغز کون ــــ؟" لیوی نے سوچا "ٹھیر جا۔ ابھی معلوم ہو جائے گا۔"

جاریف نے گملے کے قریب پہنچ کر اِدھر اُدھر دیکھا اور محتاط ہو کر آہستہ سے اُس میں ہاتھ ڈالا۔ لیوی بے صبری سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اس وقت سر سے پیر تک صرف آنکھ تھا۔ نوجوان جاریف نے گملے میں سے ایک چھوٹا پیکٹ نکالا پھر شانے اُچکا کے اُسے کھول کر دیکھا۔ لیوی نے صاف دیکھا کہ اُس میں ڈالروں کی گڈّی تھی۔ تین سو ڈالروں کی گڈّی۔ تھوڑی دیر تک جاریف حیرت سے نوٹ تکتا رہا پھر اُس نے جلدی سے چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے پیکٹ ایک کونے میں پھینکا اور گڈّی جیب میں ڈال لی "تمہارا بہت بہت شکریہ میری جان!" جاریف نے دوبارہ گملے میں ہاتھ ڈالا اِس بار نیلے رنگ کا ایک خوش نما لفافہ اُس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اُس نے لفافہ چوما اور شانے اُچکاتا ہوا وہاں سے چل دیا۔

لیوی نے جاریف کا جملہ سُن لیا تھا۔ وہ گھر لوٹتے وقت ڈرلی نوف اینڈ کمپنی کے سامنے سے گزرا تو عمارت کی طرف گھونسا تان کر زور سے چلّایا "بزدل انسان..... کوڑھ مغز..... کیکڑے۔"

نئے عہد کے نئے کارٹون

ٹی وِیات

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

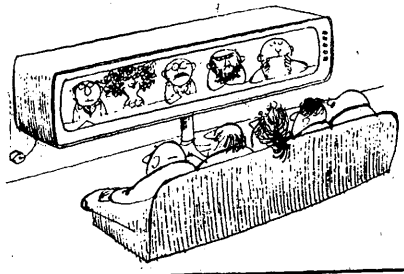

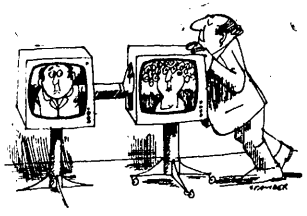

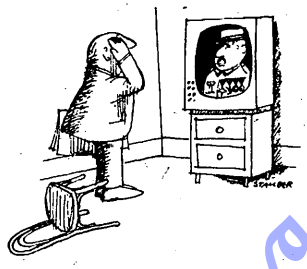

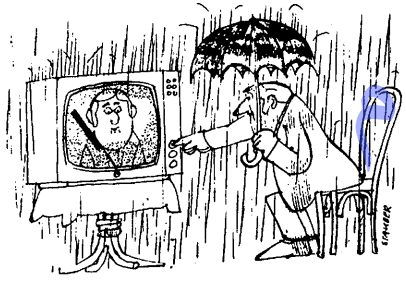

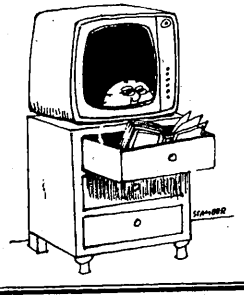

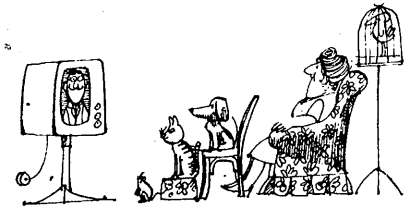

ایک روز مجھے اپنے سر میں غیر معمولی چبھن محسوس ہوئی۔ میں نے کئی بار سر جھٹکا اور بالوں میں اُنگلیاں پھیریں مگر چبھن کم نہ ہوئی۔ ناچار میں نے اپنے سر پر تصوّر کی نگاہ ڈالی تو دنگ رہ گیا۔ ایک خوبصورت نازک اور شوخ لڑکی اطمینان سے میرے سر پر بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ یہ انکا تھی۔ انکا ایک غیر مرئی وجود تھا۔ ناقابلِ یقین طاقتوں کی مالک دیوی تھی۔ کسی بھی شخص کے سر پر جا کر اُسے اپنا آلۂ کار بنا لینا اُس کے لیے ایک کھیل تھا۔ وہ جس شخص کی مطیع ہو جاتی تھی اس کے لیے محیر العقول کارنامے انجام دیتی تھی۔ اسے حاصل کرنے کے لیے ایک خصوصی جاپ کرنا پڑتا تھا مگر میرے سر پر وہ خود بخود چلی آئی تھی کیونکہ اس نے مجھے پسند کر لیا تھا۔ اُس کی آمد نے میری زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ میں ایک قلاش کلرک تھا مگر انکا کی بدولت مجھے دنیا جہان کی نعمتیں حاصل ہو گئیں اور میرے روز و شب شراب و شباب، رنگ رلیوں اور الّلوں تلّلوں میں بسر ہونے لگے لیکن اس زندگی کا دوسرا رُخ انتہائی ہولناک تھا۔ انکا اپنی بقا کے لیے انسانی خون پینے کی محتاج تھی مگر کسی انسان کو خود قتل کرنا اُس کے بس میں نہیں تھا لہٰذا یہ مکروہ اور لرزہ خیز کام مجھے انجام دینا پڑتا تھا۔ انکا کے اشارے پر سب سے پہلے میں نے اپنی محبوبہ نرگس کے منگیتر کو قتل کیا۔ یہ میری زندگی کا پہلا قتل تھا۔ اس کے صلے میں انکا نے بڑے ڈرامائی انداز میں نرگس کو ہمیشہ کے لیے میری رفیق بنا دیا۔ نرگس اپنے ماں باپ سے کُھلم کُھلا باغی ہو کر میرے ساتھ عشق میں آگئی تھی۔ نرگس کی رفاقت میرے سحر کا سب سے بڑا ارمان تھا لیکن اُس کا حصول میرے لیے تسکین دہ نہیں ہو سکا کیونکہ میں انکا کی وجہ سے آئے دن قتل و غارت، مقدمات، گرفتاری اور رہائی کے چکروں میں گھرا رہنے لگا۔ یہ صورتِ حال نرگس کے لیے بھی تشویشناک تھی اس لیے ہم دونوں نے ایک روز تنگ آکر انکا سے چھٹکارا حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کا ہمیں سخت خمیازہ بھگتنا پڑا۔ انکا نے انتقاماً میری کار کا ایکسیڈنٹ کروا دیا۔ اس حادثے میں مجھے اپنے ایک ہاتھ سے محروم ہونا پڑا اور دوسری طرف نرگس اغوا کرلی گئی۔ میں نے اُسے بڑی شرم ناک حالت میں ایک کثیر مرد کی آغوش میں دیکھا۔ یہ سب کچھ معمولی نہیں تھے نتیجتاً مجھے انکا سے مفاہمت کرنی پڑی۔ وہ نہال ہوگئی اور اس نے ایک بار پھر مجھے عیش و عشرت کی جنّت میں پہنچا دیا۔ ابھی دنوں ایک روز انکا نے مجھے یہ وحشت اثر خبر سنائی کہ پونا کے ایک پنڈت ترمبی داس نے اُس کے حصول کا جاپ شروع کر دیا ہے۔ میں پریشان ہوگیا کیونکہ انکا اب میری عادت بن چکی تھی اور اُس کا فراق میرے لیے تباہی اور بربادی کا سامان تھا۔ میں نے اور انکا نے ترمبی داس کے جاپ میں خلل ڈالنے کی بہت کوشش کی لیکن قسمت مہربان نہیں تھی اس لیے وہ اپنے جاپ میں کامیاب ہوگیا اور انکا بادلِ ناخواستہ مجھ سے بچھڑ کر اُس کی تحویل میں چلی گئی۔ ترمبی داس ایک کینہ توز شخص تھا۔ اُس نے مجھ سے گن گن کے بدلے لیے۔ مجھے ظالم بتایا گیا۔ نرگس پھر مجھ سے چھین گئی۔ مجھ سے زبردستی بہیمانہ جرائم کرائے گئے اور آخر میں سڑکوں پر بھیک مانگنے کے لیے بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا۔ قسمت برگشتہ ہو تو موت بھی آدمی کے پاس نہیں پھٹکتی۔ اسی زمانے میں میری حالتِ زار پر ترس کھا کر بدری نرائن نامی ایک پنڈت نے مجھے اس شرط پر رام پور کے مجذوب برکاتی شاہ کا پتہ بتایا کہ اگر برکاتی شاہ کی دست گیری سے انکا مجھے دوبارہ مل گئی تو میں اُسے کچھ روز کے لیے بدری نرائن کے تصرف میں دے دوں گا۔ میں ایک زندہ لاش کی طرح گھسٹتا ہوا افتاں و خیزاں برکاتی شاہ کی خدمت میں پہنچا۔ اُس مردِ قلندر نے مجھے چالیس دن تک چلّہ کھینچوایا اور چند روز بعد انکا واقعی مجھے مل گئی۔ روٹھی ہوئی مسرتوں نے مجھے پھر گلے لگا لیا مگر ساتھ ہی بدری نرائن ہاتھ دھو کے میرے پیچھے پڑ گیا کہ حسبِ وعدہ انکا اُسے مستعار دے دوں لیکن مجھے انکا کی جدائی کا بڑا تلخ تجربہ ہوا تھا اور بدری نرائن قول و فعل کے لحاظ سے ایک مشکوک آدمی تھا اس لیے میں اسے ٹالتا رہا۔ اس کا اصرار بڑھتا چلا گیا۔ آخر ایک روز تنگ آکے میں نے اُس سے صاف انکار کر دیا۔ وہ بھڑک اُٹھا اور اُس نے مختلف طریقوں سے مجھے زچ کرنے کے علاوہ ایک روز اپنے بیروں کے ذریعے میری زندگی کی سب سے قیمتی متاع' میری نرگس کو مجھ سے چھین لیا جو انکا کے دوبارہ آنے کے بعد میرے ساتھ ہی رہنے لگی تھی۔ میں بدری نرائن کی بوٹیاں نوچ لینے کے لیے آندھی اور طوفان کی طرح اُس کے تعاقب میں دوڑا لیکن وہ بزدل کسی نہ کسی طرح کلکتے پہنچ کے کالی کے مندر میں پناہ گزین ہوگیا۔ کالی کی مہان شکتی کے سامنے طاقت ور انکا بھی بے بس تھی پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری اور اشتعال کے عالم میں مندر کے بڑے پجاری کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مجھ پر جنون سوار تھا۔ انکا نے مجھے قابو میں رکھنے کے لیے میرے ہوش و حواس سلب کر لیے۔ میں دیوانوں کی طرح شہر در شہر بھٹکتا پھرا۔ اس دوران میں ایک نوجوان اور موڈرن لڑکی مجھے مل گئی۔ اُس نے کوشش کی کہ میں نرگس کا غم بھول جاؤں۔ گلدیپ پونا کے ایک سیٹھ کی بیٹی تھی مگر میری محبت میں گرفتار ہو کر خاندانی قیود سے آزاد ہوگئی تھی اور میرے ساتھ ہندوستان بھر میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ کالی کے مندر میں بدری نرائن کا قیام طویل ہوگیا تھا اور اُسے کیفرِ کردار کو پہنچانے کے لیے میری کوئی سعی کارگر نہیں ہو رہی تھی چنانچہ میں نے اس سلسلے میں ہندوستان کے ایک بڑے پنڈت پریتم لال سے مدد لینے کا فیصلہ کیا اور انکا اور گلدیپ کے ساتھ میسور کی ویران پہاڑیوں میں جا پہنچا جہاں پریتم لال کا استھان تھا۔ یہاں مجھ سے ایک فاش غلطی سرزد ہوگئی۔ میں پریتم لال کی خوبصورت اور کنواری داسی مالا پر دست درازی کر بیٹھا۔ دھان پان اور گیانی دھیانی پریتم لال نے اس جسارت پر مشتعل ہو کر مجھے مفلوج کر دیا اور انکا کو میرا خون پینے پر مجبور کیا۔ یہ ایک کڑی سزا تھی۔ میں بے بسی سے ایڑیاں رگڑتا رہا اور موت کی تمنا کرتا رہا۔ اسی کسمپرسی میں ایک طویل مدت گزر گئی تا آنکہ پریتم لال کا آخری وقت آ پہنچا۔ نزع کے عالم میں اُس نے گلدیپ کو اپنی داسی بنا لیا اور مجھے معاف کر کے مالا کا ہاتھ ہمیشہ کے لیے میرے ہاتھ میں دے دیا کیونکہ میں وہ پہلا شخص تھا جس نے اس کا پوتر شریر چھوا تھا۔ پریتم لال کی وفات کے چند روز بعد مجھے بادلِ ناخواستہ گلدیپ سے رخصت ہونا پڑا اور میں انکا اور مالا کو ساتھ لے کر پونا آگیا۔ یہاں میں نے ترمبی داس سے اپنی ذلتوں کا بھیانک انتقام لیا۔ میں نے انگلیاں کاٹ کے اُس کی آنکھیں نکال لیں اور اس قدر بے دردی سے اُسے زدوکوب کیا کہ اُس کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے۔ اس مہم کے بعد میں بدری نرائن سے نمٹنے کے لیے کلکتے آگیا۔ وہ شیطان اب تک کالی کی پناہ میں تھا۔ کلکتے آتے ہوئے برسوں بعد میری اپنے سگے چچا سے ملاقات ہوگئی تھی۔ وہ لکھنؤ میں رہتے تھے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ میں گھر چلوں۔ بدری نرائن سے جلد مناقشے کے کوئی آثار نہیں تھے اس لیے میں نے لکھنؤ کا قصد کیا۔ ریل میں مجھے ایک خوبصورت لڑکی تزئین ملی جس میں نرگس کی شباہت دیکھ کر میرا دل خود بخود اُس کی طرف کھنچنے لگا۔ میں نے اُس سے اپنائیت کے ساتھ گفتگو کی اور شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس طرح اُسے بھی میری طرف راغب ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور مجھ پر یہ افسوس ناک انکشاف ہوا کہ اُسے لکھنؤ کی ایک مشہور طوائف اشرفی بیگم نے بچپن میں اغوا کرکے پال لیا تھا اور اب اُس کی دوشیزگی نیلام کر کے اپنا حقِ محنت وصول کرنا چاہتی ہے۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اس معصوم لڑکی کو اس اخلاقی ماحول سے نجات دلائے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ لکھنؤ میں میرے چچازاد بھائی اور بہنوں نے مجھے اور مالا کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ میں مدتوں بعد اپنے خاندان میں پہنچا تھا اس لیے وہاں میں نے مالا کی آغوش میں چند روز بڑے سکون سے گزارے۔

مگر جلد ہی میری زندگی پھر ہنگاموں میں مبتلا ہوگئی۔ میں نے اشرفی بیگم کے بالا خانے پر پہنچ کے انکا کی مدد سے ہلچل مچا دی۔ بکاؤ تزئین کی خریداری کے لیے لکھنؤ کے امراء اور نوابین نے بڑھ چڑھ کر بولیاں لگائیں۔ ایک بڈّھا رئیس نواب بُنّن علی خاں خصوصیت سے اس معاملے میں پیش پیش تھا۔ میں اُس کے راستے کی دیوار بن گیا۔ یہ دخل اندازی اُس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اُس نے مشتعل ہو کے کرائے کے غنڈوں کے ذریعے میری چہیتی بہن رخسانہ کو اغوا کروا لیا لیکن میری ناموس پر ہاتھ ڈالنا اُسے بہت مہنگا پڑا۔ میں نے رخسانہ کو تو اُس کی حویلی سے برآمد کر لیا لیکن بُنّن علی کو نہیں بخشا۔ چنانچہ اُسے انکا کے زیرِ اثر اپنی ایک خوبصورت داشتہ کو قتل کر کے جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ اس کی دو حسین و جمیل نوجوان بہنیں ندرت اور افشاں زیرِ تعلیم تھیں۔ میں نے عہد کیا کہ انھیں کوٹھے کی زینت بنا کے دم لوں گا مگر عشق نامی ایک جِن ان بہنوں کے عشق میں مبتلا ہو کے اُن کا نگراں بن گیا تھا اور اُس نے میرا راستہ مسدود کر دیا تھا اس لیے مجھے عارضی طور پر اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ دوسری طرف اشرفی بیگم نے تزئین کا سودا کسی اور سے طے کر دیا لیکن جس شام وہ بے زبان فروخت ہونے والی تھی اُسے کسی نامعلوم طاقت نے بالا خانے سے غائب کر دیا۔ اشرفی بیگم نے اُس کی گمشدگی کا الزام مجھ پر دھرا اور عیاش افسروں سے ساز باز کر کے مجھے جیل پہنچوا دیا۔ گرفتاری کی اذیت ہی کیا کم تھی کہ مجھ پر دکھ کا ایک اور پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بدری نرائن نے موقع پا کر انکا کے حصول کا جاپ کیا اور اُسے مجھ سے توڑ لیا۔ میری کائنات ایک بار پھر اندھیری ہو گئی اور جب میں جیل سے باہر نکلا تو بدری نرائن کی پے در پے انتقامی کارروائیوں نے مجھے زندہ درگور کر کے رکھ دیا۔ وہ مجھے جان سے مارے بغیر نہ چھوڑتا لیکن ایک اجنبی اور پُراسرار لڑکی کلپنا نے بر وقت نازک موقع پر اچانک نمودار ہو کے مجھے بے بسی کی موت مرنے سے بچا لیا۔ آنجہانی پریتم لال کا ایک دوست سادھو جگ دیو اکثر موقع پر میری پشت پناہی کرتا تھا۔ اُس نے مجھ پر سب سے بڑا احسان یہ کیا کہ خصوصی جاپ کر کے انکا کو بدری نرائن کے پنجے سے نکالا اور بڑی بے نیازی سے میری جھولی میں ڈال دیا۔ میری خزاں رسیدہ زندگی دوبارہ پُر بہار ہو گئی۔ میں نے پہلی فرصت میں بُنّن علی اور اشرفی بیگم کی خبر لینے کا فیصلہ کیا۔ اُن دنوں اشرفی بیگم کی دکان دلِ نشیں نامی ایک نودمیدہ پھول سے سجی ہوئی تھی۔ بُنّن علی بری ہو چکا تھا اور دل نشیں کی خریداری میں زبردست دلچسپی لے رہا تھا۔ میں اُس کے مقابلے پر جا پہنچا اور ایک منصوبے کے تحت بڑی بڑی بولیاں لگانے لگا چنانچہ بُنّن علی نے اپنی ناک بچانے کے لیے وہ سب کچھ داؤ پر لگا دیا جو اُس کے پاس تھا اور میں یک بیک پیچھے ہٹ گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بُنّن علی کو دل نشیں کی چہار روزہ صحبت کے عوض اپنی پائی پائی اشرفی بیگم کے حوالے کرنے کے علاوہ آبائی حویلی بھی اُس کے پاس گروی رکھنی پڑی۔ وہ قلاش ہو کے اشرفی بیگم کے پاس چلمیں بھرنے لگا۔ اُس سے نمٹ کر میں اشرفی بیگم پر ملتفت ہوا۔ اشرفی بیگم کی موت بڑی عبرت ناک ثابت ہوئی۔ اُس کے ایک سازندے بنّے خاں نے انکا کے زیرِ اثر درندوں کی طرح اُس کا خون پیا۔ بالا خانے میں افراتفری پھیل گئی۔ بُنّن علی موقع سے فائدہ اُٹھا کر تجوری سے اپنی حویلی کے کاغذات لے اُڑا۔ میں نے فوراً انکا کو اُس کے تعاقب میں روانہ کر دیا اور حالات کا تنِ تنہا مقابلہ کرنے کے لیے سینہ سپر ہوگیا۔ دیکھتے دیکھتے پولیس پہنچ گئی۔ پولیس کے ساتھ بد خواہ بدری نرائن بھی تھا اور انکا کی غیر موجودگی غنیمت سمجھ کے مجھے مار ڈالنا چاہتا تھا۔ اُس کے اشارے پر اُس کے ناپاک بیروں نے مجھے گھیر لیا لیکن کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے کیونکہ پُراسرار کلپنا نے بر وقت نمودار ہو کر اُن سے خطرناک مقابلہ کیا اور مجھے غنودہ کر کے گلدیپ کے استھان پہنچا دیا۔ یہاں خلافِ توقع تزئین بھی موجود تھی۔ گلدیپ بن باس اور کٹھن تپسیا کی وجہ سے مہان شکتی کی مالک بن چکی تھی اور اُس نے تزئین میں میری خصوصی دلچسپی کے پیشِ نظر اُسے یہیں بلوا لیا تھا۔ یہ جگہ میرا گھر تھی۔ یہاں میں نے بڑے آسودہ دن گزارے۔ گلدیپ اور تزئین نے کمال توجہ سے میری آؤ بھگت کی۔ کچھ روز بعد انکا بھی وہیں پہنچ گئی۔ گلدیپ کی چاہت اب شفقت میں بدل گئی تھی اور مجھے بہت محتاط رہنا پڑتا تھا تاہم ایک روز میں نے جذبات کی شدّت سے بے قرار ہو کر اُسے زبردستی آغوش میں بھر لیا۔ اس لمحاتی غلطی کا نتیجہ انتہائی دہشت ناک نکلا۔ گلدیپ کی وقتی بے خبری سے فائدہ اُٹھا کر بدری نرائن نے لکھنؤ میں مالا کا کام تمام کر دیا۔ یہ دوسری چوٹ تھی جو اُس نے میرے دل کی گہرائیوں میں لگائی تھی۔ میں دیوانہ ہوگیا مگر چونکہ بدری نرائن دو موسموں کے لیے پھر کالی کے تحفظ میں آگیا تھا اس لیے میرا دستِ انتقام اُس کی گردن کا پھندا نہیں بن سکا۔ ہندوستان کی زمین سرِ دست مجھ پر تنگ تھی اس لیے میں نے گلدیپ اور سادھو جگ دیو کے مشورے پر یورپ کی چند روزہ سیاحت کا پروگرام مرتب کیا اور دولت علی کے فرضی نام سے پاسپورٹ بنوا کر بمبئی سے لندن آگیا۔ طیارے میں مجھے لندن کی ایک رئیس زادی سارا ال گری مل گئی تھی۔ انکا کی مدد سے مجھے اُسے شیشے میں اُتارنے میں دیر نہیں لگی۔ لندن میں سارا کے ساتھ میں نے بڑی حسین شامیں گزاریں لیکن اُس غریب کو میری قربت بہت مہنگی پڑی۔ اُس کے ایک نوجوان امیدوار نے جوشِ رقابت میں اُس کے باپ کو قتل کروا دیا اور ایسے حالات پیدا کر دیے کہ قتل کا الزام میرے سر آجائے۔ اس افتاد سے بچنے کے لیے مجھے انکا کے ذریعے باطنی علم اور عملیات کا سہارا لینا پڑا۔ نوجوان سراغ رساں جم میری مخفی صلاحیتیں دیکھ کر دنگ رہ گیا اور اُس نے مجھ سے ایک عجیب کام لیا۔ برلن سے ایک جرمن سائنس داں کو اغوا کر کے لندن لانا تھا۔ یہ مہم کرشمہ کار انکا کے لیے معمولی کھیل تھا لیکن اس کی انجام دہی کا صلہ مجھے غیر معمولی ملا۔ جم کی سراغ رساں ساتھی جین پکے ہوئے پھل کی طرح میری جھولی میں آگری۔ میں نے برلن کے ایک عالی شان ہوٹل میں بند ہو کر چند روز تک اُس کے بانکے بدن کی سیاحت کی اور سرشار ہو کے لندن لوٹ آیا۔ یہاں میں نے بڑا اہم وقت گزارا۔ ایک طرف امرائے لندن کے کلب میں امیر و کبیر دوشیزاؤں کو اپنی قربت سے مالا مال کیا، دوسری طرف ترکی کے دو بھیانک جادوگروں کو برسرِ عام شکست دی اور اُن کی نوجوان ساتھی تارا کا دل اور بدن جیت لیا۔ لندن کا ایک جاگیردار میری دوست سارا کی دولت اور جوانی کا اس حد تک خواہاں تھا کہ اُس نے مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے چند غنڈے میرے پیچھے لگا دیے۔ انکا کو اُن ہٹّے کٹّے سرخ و سپید انگریزوں کا خون پی کر بڑی فرحت حاصل ہوئی اور جاگیردار مذکور کو بڑے ڈرامائی انداز میں خودکشی کرنی پڑی اور میں نے سارا کو جم کے مضبوط بازوؤں میں پہنچا کے ہمیشہ کے لیے کر دیا۔ ان متنوع اور تحیر خیز حالات نے مجھے لندن میں بھی سکون کا سانس نہیں لینے دیا۔ میں اپنے بہی خواہوں کو اشک بار چھوڑ کر طیارے میں سوار ہوگیا لیکن اس سے پہلے کہ میں ہندوستان کی حدود میں داخل ہوتا بدری نرائن کے بیروں نے مجھے بالا ہی بالا ٹھکانے لگانے کے لیے جہاز گھیر لیا۔ اگر انکا چوکنّا نہ ہوتی اور پُراسرار کلپنا مدد کو نہ پہنچ جاتی تو میری اور دوسرے مسافروں کی لاشوں کا بھی پتہ نہ چلتا۔ طیارہ زبردست کشمکش کے بعد تہران کے ہوائی اڈے پر اُتر گیا۔ چند بدھ بھکشو بھی میرے ہم سفر تھے۔ ان کا سربراہ کپالا ایک پہنچا ہوا شخص تھا۔ اُس نے اپنے کشف سے میرے حالات کا سراغ لگا کر مجھ سے ہمدردی کا برتاؤ کیا اور مجھے اپنے ساتھ تبّت چلنے کی دعوت دی مگر بدری نرائن مجھ پر بھوت کی طرح سوار تھا اس لیے میں تہران سے سیدھا ہندوستان پہنچ گیا۔

اس عرصے میں میرا محسن سادھو جگ دیو سورگ باش ہو چکا تھا اور گلدیپ کسی طویل جاپ میں مصروف تھی۔ بدری نرائن نے ہندوستان بھر کے پنڈتوں کو میرے خلاف بھڑکا دیا تھا اور جیتے جیتے پر میرے لیے جال بچھوا دیے تھے۔ خصوصاً گلدیپ کے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

[illegible]

دلی

سے دور اس پراسرار حویلی میں کبھی انسانوں کا قیام ہوگا مگر اب وہ جگہ جنوں کا مسکن تھی۔ عام آدمی حویلی کی سنگینی ہی دیکھ کر وہاں قدم رکھتے ہوئے گھبراتا ہوگا۔ ماحول پر وحشت طاری تھی۔ یہاں اندر کسی کمرے میں میری بیٹی جنوں کے قبضے میں

تھی اور میرے دل پر آریاں سی چل رہی تھیں۔ میں اسے دیکھنے کے لیے بیتاب تھا لیکن اُس تک پہنچنے میں نادیدہ دیواریں حائل تھیں۔ تزئین کے لیے میں سب کچھ لٹا سکتا تھا۔ تزئین میری بچی تھی۔ وہ میری عبرت ناک زندگی کے اندھیرے دنوں کا ایک سویرا تھی۔ وہ میرے جرائم اور میری کثافت و غلاظت کے ڈھیر میں ایک پاک اور لطیف آبگینہ تھی۔ اس کا خیال مجھے سہارا دیتا تھا۔
بدھ گیا میں سکوت کا ایک خاصا بڑا عرصہ گزرنے کے بعد جب مجھے جنوں کی شرانگیزی کی خبر ملی تو مجھ سے ایک پل چین سے نہ بیٹھا گیا۔ میں آناً فاناً دلی پہنچ گیا۔ اب میرا اور اُس کا فاصلہ بہت کم تھا مگر پُراسرار طاقتوں کا فاصلہ مکانی و زمانی فاصلوں سے زیادہ طویل اور شدید ہوتا ہے۔

میری آواز حویلی کے ٹوٹے پھوٹے در و دیوار میں بازگشت کرتی ہوئی گونجی۔ "سنتے ہو، اور اگر یہ صاف بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی ہے تو مجھے دوسرے طریقوں سے سمجھانا بھی آتا ہے۔" میں نے تلخی میں اس بوڑھے جن سے کہا جو حویلی سے برآمد ہوا تھا۔ "تم میری بیٹی تزئین میرے حوالے کردو اور اس حویلی کی تنہائیوں میں ڈوب جاؤ۔ کون تمہارے معاملے میں رخنہ اندازی کرتا ہے۔"

بوڑھا جن اپنی جگہ جما رہا اور استہزائی انداز میں بولا۔ "زندگی چاہتے ہو تو خاموشی سے لوٹ جاؤ ورنہ پھر انھیں روکنا میرے بس میں نہیں رہے گا، وہ تمھارے وجود سے نفرت کرتے ہیں۔ اسی لیے تمہاری بیٹی کو یہاں لے آئے ہیں۔ جاؤ فی الحال اپنی بیٹی کا خیال دل سے نکال دو۔ جب ان کا جی چاہے گا، وہ اسے واپس کردیں گے۔ میں سمجھتا ہوں تمہارے لیے یہ سزا ہی بہت ہے کہ تمہاری آبرو اجنبی بازوؤں کی گرفت میں ہے۔"

بوڑھے جن کا اشتعال انگیز رویہ میری برداشت سے باہر تھا۔ میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "تم دیکھ چکے ہو کہ میں نے تمہارے لاڈلوں کو کہاں کہاں شرمندہ کیا ہے۔ میں کسی برتے ہی پر یہاں آیا ہوں اور اپنی بیٹی کو ساتھ لیے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔ مجھے تمہاری شرافت اور خباثت کا پورا علم ہے۔ تم چاہے تعداد میں کتنے ہی کیوں نہ ہو مگر میں تنہا تم لوگوں کے لیے قہر بن سکتا ہوں۔ شاید تمھیں خبر ہوگئی ہوگی کہ میں لکھنؤ سے گزرتے ہوئے زرافشاں اور درخشاں کو بھی ساتھ لیتا آیا تھا۔ تم سے نمٹنے کے لیے میں کسی زحمت میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میری بیٹی میری زندگی ہے۔ میں اپنی زندگی کے لیے یہاں آیا ہوں۔"

"دفع ہو جاؤ۔" اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"آنند لال کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور الکا میرے سر پر کھیل رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھنے کے بجائے اپنی جگہ سے آواز لگائی۔ "جلد از جلد کوئی فیصلہ کرلو اور تمہیں فیصلے کا اختیار نہ ہو تو جنوں کو بلاؤ۔ میں اس سے دو ٹوک باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں جنوں ہی کی طرف سے تمہارے پاس آیا ہوں۔" بوڑھے جن نے سنجیدگی سے کہا۔ "اور بات کرنا ہی کیا ہے؟ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اُس پر عمل کرو۔ تم ایک تنہا شخص کس کس سے لڑو گے۔ وہ بھڑوں کی طرح تم پر ٹوٹ پڑیں گے۔ تمہارے لیے سانس لینا تک دشوار ہو جائے گا۔ تم نے کتنی بار زک اٹھائی ہے پھر بھی باز نہیں آتے ہو؟ ایک چھوٹی سی عورت پر ناز کرتے ہو؟"

بوڑھے جن کا اشارہ الکا کی طرف تھا۔ میں نے الکا کی طرف دیکھا۔ وہ طیش میں میرے سر پر کھڑی ہوگئی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے بدزبان بوڑھے کا نشانہ لے رہی ہو۔ خود میرا بھی یہی عالم تھا لیکن میں نے بوڑھے کی ہرزہ سرائی کا جواب بڑے تحمل سے دیا۔ میں نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔ "اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میرے ساتھ صرف ایک چھوٹی سی عورت ہے تو یہ تمہاری بڑی نادانی ہے۔ میں اسے تمہارے سر پر بھیج دیتا ہوں۔ تمہیں میرے بارے میں اُس بیوقوف جن نے کچھ تو بتایا ہوگا۔ میں تنہا تھا لیکن بھول گیا کہ میں شدید ترین صدمے اٹھانے کے بعد بھی زندہ ہوں۔ پچھلی دفعہ بھی اس نے مجھے مرنے کا دیا تھا۔ وہ میرا تعاقب کرتا ہوا امر لال کے ہاں پہنچ گیا تھا۔ اب اس نے دیکھ لیا ہوگا کہ میں دوبارہ زندہ ہوگیا ہوں۔ میں نے زین علی کی حویلی میں تمہارے کئی ساتھیوں کی موجودگی کے باوجود زرافشاں اور درخشاں کو حاصل کرلیا ہے۔ تم لوگوں کی اوقات سے میں پوری طرح واقف ہوں۔ تم لوگ بھڑوں کا چھتّا ہو تو میں بھی جوالا مکھی ہوں۔ مجھے ہاتھ لگاؤ گے تو ہاتھ جل جائے گا۔"

"جمیل!" الکا نے سرگوشی کی۔ "میں اندر کی سن گن لینے کی کوشش کرتی ہوں۔ جب تک واپس نہ آجاؤں، آگے بڑھنے کی حماقت نہ کرنا اور اس بوڑھے کو باتوں میں الجھائے رکھنا۔"

"سنا ہے میں نے سوچنے سمجھنے کا بہت وقت دے دیا ہے۔" میں نے دوبارہ بوڑھے کو مخاطب کیا۔

"اتفاقات بار بار رونما نہیں ہوتے جمیل احمد خاں!" اس نے گرج کر کہا۔ "یہاں سے تم کبھی واپس نہیں جاسکو گے۔"

"مجھے میری لڑکی دے دو۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔

"وہ تمہیں واپس نہیں مل سکتی۔"

اس لمحے انکا میرے سر پر واپس آ گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اندر جانے میں ناکام رہی ہے۔ "وہ ہر طرف پوری طرح مستعد بیٹھے ہیں اور انھوں نے کئی دیواریں حائل کر دی ہیں۔ بہر حال اندر تزتین اور بتن علی دونوں موجود ہیں۔ امرلال اور بدری نراتن نظر نہیں آئے، یہی ایک خدشہ تھا۔" میں نے ایک عمل کر کے اپنے آپ کو اور محفوظ کر لیا۔ آنندلال کی زبان بھی مسلسل بدبدا رہی تھی۔ بوڑھے جن کے ساتھ مزید گفت و شنید کا کچھ حاصل نہ تھا، آنندلال نے اشارہ پاتے ہی میرے ساتھ قدم بڑھایا۔ بوڑھا جن برانگیختہ ہو گیا۔ "رک جاؤ۔ آگے بڑھے تو پیچھے نہیں جا سکو گے۔"

"جمیل!" انکا نے تیزی سے کہا۔ "آگے بڑھنے سے پہلے وہ دیواریں ڈھانے کی کوشش کرو جنھیں عبور کیے بغیر تم اندر داخل نہیں ہو سکتے۔ یہ بوڑھا دیوار کے اس پار سے بول رہا ہے۔ درمیان میں ان گنت پردے موجود ہیں، حویلی کے باہر ہر طرف حصار قائم کر لو تاکہ رحیق، زتین اور بتن علی کھلے کر کسی اور طرف نہ نکل جائیں اس کے ساتھی تمھیں الجھائے رکھیں گے، وہ خود یہاں سے نکل جائے گا۔"

انکا کا مشورہ اس جذباتی کشمکش کے باوجود مناسب معلوم ہوتا تھا، میں نے بوڑھے کو بولنے دیا مگر اس کی دھمکیاں سننے کے بجائے اپنے آپ کو مصروف رکھا۔ حویلی کے گرد میری طاقت کی بھی ایک مضبوط دیوار قائم ہو چکی تھی۔ بوڑھے نے اچانک کسمسا کر پہلو بدلنا شروع کر دیا۔ میری دیوار کم از کم بتن علی اور تزتین عبور نہیں کر سکتے تھے، بوڑھے جن نے بوکھلا کر چاروں طرف نظر دوڑائی اور مجھے رکتے دیکھ کر دوبارہ اپنی طاقت کے بارے میں لاف و گزاف کرنے لگا۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا اور آنندلال کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ "کیا تم تیار ہو آنندلال؟" میں نے پوچھا۔

"میں آپ کے ساتھ جہنم میں بھی جا سکتا ہوں۔"

"تو چلو۔ بظاہر راستہ صاف نظر آتا ہے، حوصلہ مت کھونا۔" میں نے نرمی سے کہا اور دفعتہً ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی ہمیں پیچھے کی طرف دھکیل رہا ہو۔ ایک لمحے تو میرے قدم اکھڑ گئے۔ آنندلال نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا، میں کوئی چٹان تھا جس پر کسی طوفانی لہر یا ہوا کے ریلے نے حملہ کر دیا تھا، چٹان پر جس تیزی سے پانی آیا تھا، اسی تیزی سے گزر گیا۔ اور ہوا خس و خاشاک اڑاتی ہوئی چٹان کو برہنہ کر گئی۔ میرے قدم زمین میں گڑ گئے تھے۔ میں نے احتیاط سے انھیں اٹھا کر آگے بڑھایا۔ چند قدم چل کر فاصلہ کسی قدر کم ہو گیا۔ ابھی ہم کچھ ہی دور آگے بڑھے ہوں گے کہ آنندلال بے تحاشا پیر پٹخنے لگا۔ خود میرے قدموں میں جلن ہونے لگی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے ہمارے پیروں پر کھولتا ہوا پانی ڈال دیا ہو۔ اس بار میں نے خود آنندلال کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا اور چند لمحوں کے لیے اسے گھسیٹنے لگا۔ "یہ ایک سراب ہے آنندلال! ایسے چلتروں کا حوصلے سے جواب دیا کرو۔"

"میں جانتا ہوں۔" آنندلال کراہ کر بولا اور ایک دم سیدھا کھڑا ہو گیا۔ "میں نے بہت کچھ کھو دیا ہے۔ آج مجھے اس کا رنج ہو رہا ہے۔"

"تم نے مالا کو حاصل کر لیا ہے۔" میں نے اس کی توجہ منعطف کرنا چاہی۔

"ہاں۔ اور آپ کو بھی۔" آنندلال نے برجستہ کہا۔

"ممکن ہے آگے اس سے کہیں زیادہ رکاوٹیں پیش آئیں، آنندلال اپنی آنکھیں بند مت کرنا۔" میں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ہمارا اور بوڑھے جن کا فاصلہ کم ہو گیا تھا، وہ جھنجھلاہٹ میں پے در پے حملے کر رہا تھا لیکن ہمیں کوئی گزند پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ انکا میرے سر پر کسی بت کی طرح بیٹھی تھی۔ ان رکاوٹوں کی تفصیل بیان کرنا فضول ہے۔ ایسے معرکوں کا تذکرہ میں کئی بار کر چکا ہوں۔ پرنیم لال کے استھان پر کئی بار ہندو پنڈتوں پجاریوں نے میرا راستہ روکا تھا اور بدری نراتن نے ان کی ایک فوج وہاں جمع کر دی تھی۔ میں نے وہ پتھر راستے سے ہٹائے تھے تو یہ جن کیا چیز تھے؟ ویسے بھی ان کا مرتبہ بلند نہیں تھا البتہ ان کی تعداد کے پیش نظر احتیاط ضروری تھی اور پھر میری ایک عزیزہ ہستی ان کے قبضے میں تھی۔ یہ انتہائی اضطراب کا وقت تھا، ہم ابھی تک سدِ راہ کے باہر تھے اور بوڑھا جن ابھی تک سدِ راہ بنا ہوا تھا۔ گو اس کا کھردرا چہرہ اب صاف نظر آ رہا تھا۔ ہم آہستگی سے راستے کی رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے عمارت کے قریب پہنچ رہے تھے کہ بوڑھے جن کی جگہ ہمیں ایک دیو قامت شخص نظر آیا۔ اس شخص کی ہیبت ناک آنکھیں نیچے کی طرف پھیلی ہوئی تھیں، وہ مضحکہ خیز انداز میں بری طرح ہاتھ چلا رہا تھا اور ہمیں پیچھے جانے کا اشارہ کر رہا تھا۔ بوڑھے جن نے مجھے کوئی نوآموز سمجھ لیا تھا۔ مجھ پر اس کی دیو قامتی اور ہیبت ناکی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے آنندلال سے کہا، "دیکھا۔ کیسے سوانگ بھر رہا ہے۔" میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ آنندلال ایک چیخ کے ساتھ میرے جسم سے لپٹ گیا۔ ایک طویل ہاتھ آنندلال کی گردن دبوچنے کے لیے بڑھ رہا تھا۔ ایک کھردرا، سخت اور کانٹوں دار ہاتھ، وہ عظیم الجثہ جن دور کھڑا اپنے بڑے بڑے دانت کچکچا رہا تھا۔ ابھی تک ہم مدافعت کر رہے تھے۔

اچانک انکا نے میرے بازو پر زور ڈالا۔ میں نے آنندلال کو چھوڑ دیا اور نہایت پھرتی سے اس کی کلائی پکڑ لی۔ میرا کلائی پکڑنا تھا کہ بوڑھا جن دوبارہ اصل روپ میں سامنے آ گیا لیکن اس کا طویل ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور آنندلال کی گردن اس کے پنجے میں دبی ہوئی تھی۔ میں نے کلائی اتنی زور سے پکڑی کہ بوڑھا تلملانے لگا اور آنندلال نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن چھڑا لی۔ میں جن کا ہاتھ کھینچنے لگا، آنندلال بھی میری مدد کرنے لگا۔ اس کا ہاتھ طویل ہوتا جا رہا تھا، جیسے وہ ایک لمبی رسی ہو جیسے وہ ایک ربڑ ہو۔ ہمارے درمیان جو فاصلہ تھا، وہ قائم رہا، پھر ہم نے اس کا ہاتھ کھینچنے کے بجائے اس کے سہارے آگے بڑھنا جاری رکھا، بوڑھے نے اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے بہت داؤ پیچ آزمائے لیکن اسے میری گرفت سے آزاد نہیں کرا سکا۔ کاش میرا دوسرا ہاتھ سلامت ہوتا، آنندلال یہ بات جانتا تھا کہ جن کے ہاتھ پر کسی ایک کی گرفت رہنی چاہیے، چنانچہ جب میں اسے چھوڑ کر آگے بڑھتا تو آنندلال کے ہاتھ اس پر قبضہ کیے رہتے اور جب آنندلال ہاتھ ہٹاتا تو میں اسے پکڑ لیتا۔ ہم دونوں یہ مشکل کام بڑی پھرتی سے انجام دیتے ہوئے اس کے بالکل سامنے پہنچ گئے بوڑھے جن کا چہرہ تمتما رہا تھا، وہ اب روپوش بھی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔

"میں تمھیں کیا سزا دوں؟" میں نے اس کی کلائی مروڑتے ہوئے کہا۔ "تم میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرو اور اپنی حماقتوں سے کنارہ کش ہو جاؤ۔" اس نے اپنی آنکھیں میری آنکھوں پر مرکوز کر دیں، پھر اس نے ایک جھرجھری سی لی اور سکون سے کہا۔ "ٹھیرو۔ ذرا ٹھیرو۔ میں اندر جا کر انھیں ہٹاتا ہوں تاکہ وہ تمھاری بیٹی کو چھوڑ دیں۔ میں نے تمھارے اندر جھانک لیا ہے۔"

"اسے ہرگز مت چھوڑنا جمیل! ہو سکے تو اس کا کام تمام کر دو۔" انکا نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

میں نے انکا کی تجویز نظر انداز کرتے ہوئے بوڑھے سے کہا۔ "میں تمھیں چھوڑے دیتا ہوں مگر یاد رکھو اگر تم نے کوئی فریب کیا تو میری یہ آنکھیں تمھیں تہ خانوں میں بھی ڈھونڈ لیں گی۔" اس کے خوف میں بھی ایک وقار تھا۔ "ٹھیک ہے۔ میں اندر جا کر انھیں سمجھاتا ہوں۔" بوڑھے نے گردن ہلا کر مفاہمت کے انداز میں کہا۔

"جاؤ۔" میں نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "اور لڑکی کو لے آؤ۔ دیر نہ کرنا، ورنہ میں آ رہا ہوں۔"

"یہ تم نے کیا کیا؟" انکا نے بے چینی سے کہا۔

"تم خاموش بیٹھی رہو۔"

"میں خاموش بیٹھی رہوں؟" انکا نے چڑ کر کہا۔ "تم پھر کوئی گڑبڑ کرو گے۔ یہ بڑے بدمعاش جن ہیں۔"

"میں چند منٹ انتظار کروں گا۔"

"وہ اندر اپنا حصار مضبوط کر رہے ہوں گے۔" انکا نے غصے میں کہا۔

"میں یہ حویلی جلا دوں گا۔"

"تمھیں اور آتا ہی کیا ہے؟ یہ جلا دوں گا، یہ کر دوں گا، وہ کر دوں گا، میں کہتی ہوں، تمھاری لڑکی اندر ہے اور تم حویلی جلانے کی سوچ رہے ہو۔" انکا نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"چپ رہو انکا!" آنندلال درمیان میں بولا۔ "تم تو لڑ رہی ہو۔"

"اب تم دیکھنا آنندلال!" انکا ہاتھ نچا کر کے بولی۔

چند لمحے گزر گئے، اندر سے کوئی واپس نہیں آیا۔ انکا جھنجھناتی بیٹھی تھی۔ جیسے ہی میں نے عمارت کی دہلیز پر قدم رکھا، ہم دونوں زمین پر کئی فٹ لڑھکتے ہوئے چلے گئے۔ میں نے آنندلال کو اٹھایا۔ سامنے کوئی جن نظر نہیں آ رہا تھا، میں اب تک برداشت کا بہت ثبوت دیتا آیا تھا، اس بار میرا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ میں آنندلال کو لے کر بجلی کی طرح چبوترے کے قریب گیا اور میں نے اسے ایک ٹھوکر ماری، وہ ستون جو چبوترے پر ایستادہ اور اٹکا ہوا تھا اڑا اڑا دھم گر گیا۔ میں اس کے ملبے سے بچتا ہوا آگے بڑھا اور کسی خطرے کی پروا کیے بغیر اوپر چڑھ گیا۔ ایک عمارت میں کتنے فاصلے تھے۔ اوپر چڑھ کر میں نے ایک ثانیے کے لیے آنکھیں بند کیں اور اپنی تمام طاقتیں ایک نقطے پر مجتمع کر لیں۔ وہ ایک نقطہ جس کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔ وہ ایک آسودہ نقطہ، جہاں تک پہنچنا ارتکاز کا کمال ہے، اس ایک لمحے میں، مجھے جسم میں ایک نئی توانائی آتی محسوس ہوئی اور میں نے ستونوں پر ہاتھ رکھ کر انھیں گرانا شروع کر دیا۔ میری انگلیوں میں جیسے کوئی برق تھی اور میری آنکھوں میں جیسے کوئی کاٹ تھی۔ میں راستے کی تمام بندشیں کاٹتا ہوا، اجڑی ہوئی راہداریاں عبور کرتا ہوا اس کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ ان کا حصار میرے ہر قدم پر ٹوٹ رہا تھا۔ جیسے ہی میں ایک جگہ سے گزرا، مجھے ایک شور سنائی دیا۔ متعدد آوازوں کا بے ہنگم شور، حیوانی چیخیں اور دنگا فساد۔

"وہ یہاں نہیں ہیں۔" انکا خاصی دیر بعد مچل کر بولی۔ "یہ شور تمھارے کانوں کے امتحان کے لیے ہے۔"

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

"میں اپنی لڑکی کی خوشبو سونگھ سکتا ہوں۔"
"تم اسے نہیں دیکھ سکتے جمیل! وہ کئی پردوں کے اندر ہے۔ محتاط رہنا جس تیزی سے تم اندر آ گئے ہو، اس آسانی سے واپس نہیں جا سکتے۔"
"وہ حرام زادہ بتن علی کہاں ہے؟"
"تزئین اسی کے پاس ہے، جلدی کرو۔ باتیں نہ بناؤ۔ بائیں طرف کی راہداری عبور کر کے کمرے کے اندر جانے کی کوشش کرو اور جہاں تک جاتے رہو، اپنے حصار سے راستے مسدود کرتے جاؤ تاکہ ان کے فرار کی راہیں بند ہو جائیں اور ان کے دل پر تمہاری دہشت بیٹھی رہے۔"
"میں یہ شور ختم کر دیتا ہوں۔" میں نے بند کمرے کی دیوار پر ایک ضرب لگائی۔
"بے کار ہے۔ میں جو کہتی ہوں۔ وہی تمہارے لیے فائدہ مند ہے۔ بائیں طرف چلو۔" انکا نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ میں نے انکا کے کہنے پر عمل کیا اور بائیں طرف مڑ گیا۔ یہ ایک تاریک راہداری تھی۔ یہاں جگہ جگہ مکڑی کے جالے بنے ہوتے تھے اور پرندوں نے گھونسلے تیار کر رکھے تھے، یہ جن طبعاً گندے تھے۔ انھوں نے اپنی مرغوب جگہ یہ گندگی گوارا کر لی تھی، راہداری کے ایک سرے پر ایک بڑے کمرے کے آثار نظر آ رہے تھے، سامنے لکڑی کا ایک مضبوط دروازہ تھا جو بند تھا۔ اس کے موٹے کنڈوں پر زنگ لگا ہوا تھا۔ انکا نے اشارہ کیا کہ یہی وہ کوٹھری ہے جہاں تزئین موجود ہے، میرا دل دھڑکنے لگا، کلیجے میں عجیب سی ہوک اٹھی۔ میں نے وہیں کھڑے ہو کر اندازہ لگایا۔ دروازے پر یقیناً متعدد جن تعینات ہوں گے جو اتنی آسانی سے اندر جانے کی اجازت نہیں دیں گے، جتنی آسانی سے میں یہاں تک پہنچ گیا ہوں۔ میں چند ثانیوں تک کھڑا ہوا سوچتا رہا۔ ایک ذرا سی لغزش سارا کام بگاڑ سکتی تھی، دروازہ نذرِ آتش کیا جا سکتا تھا مگر اس طرح وہ مشتعل ہو کر تزئین کے ساتھ کوئی زیادتی کر دیتے۔ مجھے ایک معتدل راہ اختیار کرنی تھی اور انھیں اپنے بارے میں بے خبر رکھنا تھا۔ میں پہلے ہی ایک محفوظ فصیل میں تھا لیکن احتیاط کے طور پر میں نے اپنے گرد حفاظت کا ایک اور ہالہ بنا لیا۔ میں نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی اور نہایت نرم کے ساتھ ان سے تزئین کی واپسی کی درخواست کی۔ میں نے ان سے یہ وعدہ بھی کیا کہ میں زرافشاں درخشاں کو ان کے حوالے کر دوں گا، اب میں ہر وعدہ کر سکتا تھا کیونکہ بوڑھے جن نے اپنے عہد کا پاس

نہیں کیا تھا۔ اندر مکمل خاموشی طاری رہی۔ حویلی میں صرف میری ہی آواز کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ میں نے بار بار انھیں متوجہ کیا۔ رحیق اور بوڑھے جن کو آوازیں دیں۔ میں نے عاجزی کے ساتھ ان سے کہا اور آہستہ آہستہ کمرے کی دیواریں چھوتا ہوا واپس دروازے کی طرف آ گیا۔ مجبوراً مجھے ایک ایسا راستہ اختیار کرنا پڑا جس کے لیے میں تیار نہیں تھا۔

میری آنکھیں دروازے پر گڑی ہوتی تھیں اور میں بالکل خاموش کھڑا تھا۔ اندر جنوں کا ایک پرا موجود تھا اور باہر جمیل احمد خاں۔ انھوں نے بھی اپنا سارا زور دروازے پر لگا دیا تھا۔ اور میں نے بھی مگر انھوں نے ارتکاز اور مراقبے میں ڈوب کر اپنی آنکھیں اتنی تیز اور اپنا باطن اتنا توانا نہیں کیا تھا جتنا میں نے کیا تھا۔ آنند لال میری ہدایت کے مطابق دروازے پر نشانات بناتا رہا اور میں کچھ فاصلے پر مبہوت کھڑا رہا۔ آخر وہ لمحہ آ گیا، میں نے آنند لال کو اپنے پیچھے کھڑے ہونے کی ہدایت کی اور انکا کو ہر طرف نظر رکھنے کی تلقین کی۔ میری ایک جنبشِ نگاہ سے دروازہ جلنے لگا۔ میں نے ان کا طلسم توڑ دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ جلتے ہوئے دروازے سے گھبرا کر تیزی سے باہر نکلیں گے میں انھیں کوئی مہلت دینے کی غلطی کا ارتکاب کرنا نہیں چاہتا تھا، صدیوں کی خشک لکڑی تیزی سے بھڑک اٹھی، اس کی لپٹیں ہمارا جسم چھو رہی تھیں لیکن ہمیں دروازے ہی پر تعینات رہنا تھا، میں نے آنند لال کا ہاتھ دبا کر صبر و ضبط کی درخواست کی، جب دروازہ پوری طرح آگ کی لپیٹ میں آ گیا تو میں نے آنند لال کا ہاتھ پکڑا، اُسے آنکھیں بند کرنے کا حکم دیا اور انکا کو اشارہ کیا۔ پھر ہم دونوں نے ایک جست لگائی، ہم چشم زدن میں دروازے کے اس پار کمرے کے اندر تھے۔ اندر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا لیکن یہ ایک بڑا کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ آگ سے سارا کمرہ روشن تھا۔ میں آنکھیں پھاڑے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ دوسری جانب سے مکمل خاموشی تھی، میں نے غصے کی کیفیت میں اپنا ہاتھ اٹھا کر دائرے کی صورت میں گھمایا جنوں نے روپوشی کی چادر اٹھا دی تھی، وہ کمرے میں ہر طرف بکھرے ہوتے تھے۔ ان میں وہ بوڑھا جن بھی نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ آنند لال ان کی کثیر تعداد دیکھ کر گھبرا گیا۔

میں نے تزئین کو دیکھا اور میرا خون جلنے لگا۔ بتن علی کے ناپاک ہاتھ اسے اپنے حلقوں میں لیے ہوتے تھے۔ رحیق ان کی پشت پر کھڑا مجھے شعلہ بار نظروں سے گھور رہا تھا۔ جنوں کے تیور بتا رہے تھے کہ انھوں نے ایک آخری اور فیصلہ کن معرکے کی ٹھان لی ہے

اپنی دیواریں گرتے ہی وہ خوں خوار آواز میں بولا۔ "جمیل احمد خاں! اگر ہم آدم خور ہوتے تو آج یہاں ایک شاندار جشن منایا جاتا، آخر ہم تمھیں اس حویلی میں کھینچ ہی لائے؟ صدیوں سے یہ دستور ہے کہ کوئی انسان اس حویلی سے سلامت واپس نہیں گیا، ہاں جسے ہم نے چاہا، اسے واپس کر دیا۔"
"اگر ایسا ہی تھا تو راستے میں پتھر اور کانٹے بچھانے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "میں سیدھا اسی طرف آ رہا تھا، سنو رحیق! بات بڑھانے کی حماقت نہ کرو۔ لڑکی میرے حوالے کر دو، بات یہیں ختم ہو سکتی ہے۔"
"بات تو تم نے بڑھائی ہے خاں صاحب! جب اپنے اوپر آنچ آئی تو گھبرا گئے۔ درخشاں اور زرافشاں کی عصمتیں ایسی ارزاں نہیں تھیں، تمہاری درندگی کا زخم صرف اسی طرح مندمل ہو سکتا تھا۔"
"زبان قابو میں رکھو!" میں حلق کے بل چلایا۔ "تم درخشاں زرافشاں کی حفاظت نہیں کر سکے لیکن میں اپنی لڑکی کی حفاظت کرنا خوب جانتا ہوں۔"
"تم دیکھ رہے ہو کہ تمہاری لڑکی بتن علی کے ہاتھوں میں ہے۔ بتن علی اسی پری پیکر کے پیچھے تباہ ہوا تھا۔ اب اس کی ایک تشنہ خواہش پوری ہو گئی ہے، تزئین اس کے بازوؤں کے حصار میں ہے اور اس وقت اسے دنیا کا ہوش نہیں ہے۔ دیکھو وہ کیسے مست پڑے ہیں، یہ منظر دیدنی ہے جمیل احمد خاں! اس سے تو تمھیں لطف لینا چاہیے۔" رحیق نے میرے سینے پر نشتر چلایا۔
رحیق کے جملے ایسے شخص کے لیے ناقابلِ برداشت تھے جس کا نام جمیل احمد خاں ہو اور جسے اپنے جسم پر اختیار نہ ہو۔ آنند لال کی موجودگی میں یہ جملے اور گراں گزرے۔ مجھے کمرے کے در و دیوار گھومتے محسوس ہوئے۔ تزئین کے چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی، اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ وہ نڈھال ایک طرف گردن ڈھلکائے بتن علی کی آغوش میں پڑی تھی، خود بتن علی کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ وہ دونوں گم سم مجھے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھنے کی جد و جہد کی لیکن یکلخت رُک گیا۔ مجھے بتن علی کی حویلی کا واقعہ یاد آ گیا جہاں جنوں نے اپنے بچاؤ کے لیے دائرہ بنا رکھا تھا پھر ایک ٹکراؤ کے بعد ہمارے حصار ٹوٹ گئے تھے، وہاں میرے ان دشمنوں کی تعداد کم تھی لیکن یہاں صورتِ حال اس کے برعکس تھی اور حصار ٹوٹ جانے کی صورت میں آنند لال پر کوئی افتاد پڑ جانے کا امکان تھا چنانچہ میں نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے

حالات پر قابو پانے کا فیصلہ کیا۔ انکا نے بھی مجھے ٹھوکا دے کر ٹھہرنے پر مجبور کر دیا تھا، میری کوشش یہ تھی کہ کسی طرح مجھے چند لمحوں کی مہلت مل جاتے اور میں جنوں کے تمام دفاعی دائرے ختم کر دوں۔ میں ان کی پناہ گاہ میں تھا اور مجھے اس بات کا بھی خیال تھا کہ اگر میری جانب سے کوئی اوچھا وار کیا گیا تو کھیل بگڑ جائے گا، دوسری صورت میں یہ بھی ممکن تھا کہ جن زچ ہو کر تزئین کو نشانہ بنا ڈالیں۔ یہی ایک مجبوری تھی جو ہر مرحلے پر میرے پاؤں پکڑ رہی تھی۔
رحیق میرے قدم رُکتے دیکھ کر بکواس کرنے لگا، میں نے اُسے بکواس کرنے کا موقع دیا اور منترا اور کمپالا کے سکھلاتے ہوئے چند آزمودہ عمل پڑھنے شروع کر دیے۔ پھر میرے ہاتھ ہیبت ناک انداز میں اُٹھ گئے اور کمرے میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ "ہٹ جاؤ۔ بھاگ جاؤ کم بختو!" میں بُری طرح دہاڑنے لگا۔ جنوں میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ میں جنون کی حالت میں بڑبڑا رہا تھا۔

وہ میرے قریب آنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ میری انگلیاں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں اور ان میں انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ میں چاہتا یہی تھا کہ وہ کسی طرح وحشت میں میرے دائرے کے قریب آ جائیں اور میں انھیں بتاؤں کہ ان کا واسطہ کس شخص سے ہے؟ میری ہذیانی حالت سے وہ خاصے متاثر معلوم ہوتے تھے۔ میں اُول جلول انداز میں سر پٹختا ہوا زمین پر لیٹ گیا اور میں نے اپنا جسم لٹو کی طرح گھمانا شروع کر دیا۔ آنند لال اچک اچک کر پیچھے راستہ دیتا جاتا تھا۔ میں اسی طرح بڑھتے بڑھتے تزئین اور بتن علی کے قریب پہنچ گیا۔ جب میں ان کے نزدیک ہونے لگا تو انھوں نے ایک غضب ناک چیخ پکار کے ذریعے میری اور آنند لال کی توجہ ہٹانی چاہی۔ ان کی آوازیں جانوروں کی آوازوں سے مشابہ تھیں۔ میں نے کوئی پروا نہیں کی اور اپنا عمل جاری رکھا۔ یہ ایک مشکل ترین اور ہول ناک عمل تھا۔ جب انھیں یقین ہونے لگا کہ میں اسی طرح گھومتے گھومتے اپنے جسم سے دائرہ بڑھاتے بڑھاتے تزئین کے پاس پہنچ جاؤں گا اور ان کا دائرہ میری ہذیانی مشق سے یوں ہی ختم ہو جائے گا تو انھوں نے میرے گرد دائرہ تنگ کر لیا مگر جوشِ غضب میں جو بھی آگے آیا وہ چیختا ہوا دائرے سے باہر اچھلنے لگا۔ دو تین جنوں نے یہ کوشش کی اور وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئے جیسے ان کا جسم ننگے برقی تار سے مس ہو گیا ہو۔ اس ناکامی سے ان میں افراتفری پھیلنے لگی اور وہ ایک دوسرے کی طرف سوال طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔ میں اسی افراتفری میں تزئین کے پاس پہنچ گیا لیکن میں نے اس کا ہاتھ

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

پکڑنے کے بجائے تزئین اور بتن علی کے گرد لیٹے لیٹے گھومنا شروع کر دیا اور بہت پھرتی سے چکر لگا کر کھڑا ہو گیا، میرے سارے کپڑے رگڑ کی وجہ سے پھٹ گئے تھے اور کہنیوں ٹخنوں سے خون بہنے لگا تھا۔ آنند لال بھی ہانپ رہا تھا۔

کچھ جنوں نے پھر سے یلغار کرنے کا ارادہ کیا مگر دوسرے جنوں نے انھیں روک لیا۔ میں بتن علی اور تزئین کی پشت پر کھڑا تھا۔ میں نے اپنا کرتا اتار کر تزئین کے شانوں پر ڈال دیا تاکہ اس کے پھٹے ہوئے لباس میں سے جھانکتے ہوئے حصے میری نظروں سے دُور ہو سکیں۔ پھر میں نے خوش اسلوبی سے مجہول بتن علی کو اٹھایا اور اس کے رخسار پر ڈھیلے ہاتھ کا ایک بھرپور چانٹا رسید کیا۔ وہ ہکا بکا ہو کر دیکھنے لگا۔ پے در پے کئی طمانچے کھانے سے اس کا دہانہ اپنی جگہ چھوڑ بیٹھا۔ منہ سے خون کا فوارہ اُبل پڑا۔ وہ درد و کرب سے تڑپنے لگا۔ "جمیل! اب یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرو۔ بتن علی پر وقت ضائع نہ کرو۔"

انکا نے میرے بال پکڑتے ہوئے کہا۔ "کسی وقت بھی وہ کچھ کر سکتے ہیں۔ میں نے تمھیں درمیان میں بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا، لیکن درخشاں زرافشاں خطرے میں ہیں۔ شبن خاں کا قمار خانہ گھیرا جا چکا ہے اور وہ مجھے آوازیں دے رہا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ تم اب یہاں سے آسانی کے ساتھ نکل سکتے ہو۔ وہ خاموش ہیں۔ اب انھیں زیادہ نہ چھیڑو۔" اِنکا نے مشورہ دیا۔

"میں بتن علی کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے بولاتے ہوئے پوچھا۔

"ایک پاگل شخص زندہ کہاں ہوتا ہے؛ وہ تو جنوں کا آلۂ کار ہے۔ اصل مجرم تو رحیق ہے۔"

"تو پھر میں رحیق کو ٹھکانے لگاتا چلوں ــــ رحیق کہاں ہے؟" میں نے نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ "وہ نظر نہیں آ رہا ہے۔"

"وہ بھاگ چکا ہے۔"

"مگر کس طرح؟"

"اُس روشن دان سے۔" انکا نے اشارہ کیا۔

"رحیق کہاں ہے مردُود؟" میں نے چلّا کر کہا۔ "اسے سامنے لاؤ تاکہ میں اُسے بتا سکوں کہ اُس نے کس شخص کی آبرو پر ہاتھ ڈالا تھا؟"

تمام جن مجھے حیرت سے گھور رہے تھے۔ تزئین اور بتن علی اب میرے قبضے میں تھے۔ میں نے جنوں کے خاموش چہرے گھور کے انھیں دوبارہ مخاطب کیا۔ "رحیق کو پیش کرو۔ انکار کی صورت میں تم میرے قہر سے نہ بچ سکو گے۔"

میری شعلہ گفتاری اور رحیق کے اچانک فرار ہو جانے سے وہ ششدر تھے۔ ان کی نظریں خلا میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ "بولتے کیوں نہیں؟ جواب دو۔ رحیق کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم اپنی بیٹی کو لے جا سکتے ہو۔" بوڑھا جن آگے بڑھ کر بولا۔

"مگر میں رحیق کے بارے میں پوچھ رہا ہوں، اسے تو میں ساتھ لینے ہی آیا تھا۔ میں نے تم سے معاملے کی بات کرنا چاہی تھی۔ اس بدمعاش رحیق نے تم سب کو ذلیل کرایا۔" میں نے للکار کر کہا۔

"ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کہاں چلا گیا؟" بوڑھے جن نے ٹھیراؤ سے کہا۔ "تم ضد کر رہے ہو۔"

"میری ضد کا انجام میرے سامنے ہے۔" میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ "میرے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ میں رحیق کو قید کرنا چاہتا ہوں۔"

بوڑھا جن میرے جواب پر جز بز ہونے لگا۔ اس کے تمام ساتھی اب سمٹ کر یکجا ہو گئے تھے اور مجھ پر حملہ کرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔

"ابھی تک تم لوگوں کا دماغ ٹھکانے نہیں آیا؟" میں نے برہمی سے کہا۔ "آؤ آؤ میرے نزدیک آؤ ــــ ذرا قریب آ کر دیکھو۔"

"تم خواہ مخواہ اُلجھ رہے ہو۔" انکا نے پیچ و تاب کھا کے کہا۔ "اب چلے چلو۔ انھیں اچھا خاصا سبق مل گیا ہے۔"

"انکا ٹھیک کہتی ہے جمیل بھائی! اب چلے چلو۔" آنند لال نے کہا۔

یہ کوئی اچھی واپسی نہیں تھی۔ میں ان سب کو ٹھکانے لگانا چاہتا تھا مگر تزئین کی حالت، شبن خاں کی خبر، رحیق کے فرار اور انکا اور آنند لال کے اصرار کے پیشِ نظر میں نے باہر نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت وہ پوری طرح مغلوب تھے۔ "ٹھیک ہے۔ میں جاتا ہوں۔" میں نے خشونت سے کہا۔ "مگر کان کھول کر سُن لو۔ اگر اب کی تم نے کوئی اوچھا قدم اٹھایا تو میں سب کی تباہی کا سبب بن جاؤں گا۔ یہ ایک آخری تنبیہ ہے۔ اب میرے راستے سے ہٹ جاؤ اور ہمیں خوش دلی سے رخصت کرو۔"

بتن علی پر ایک آخری بھرپور ضرب لگا کے میں نے تزئین کو اپنے کاندھے پر ڈالا۔ بتن علی بلبلا کے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ "اسے سنبھالو مُردارو! اس کا انجام میرے حسبِ منشا نہیں ہوا ہے۔" یہ کہہ کے میں نے آنند لال کو آنکھ کا اشارہ کیا۔ "کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا۔" میں نے بپھرے ہوئے جنوں سے کہا۔

دروازے پر میری روشن کی ہوئی آگ اب کمزور پڑ چکی تھی۔ میں نے وہ آگ عبور کی اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا، پھر سنسان راہداری میں آ گیا جہاں لکڑی چٹخنے کی آواز موت کا سکوت توڑ رہی تھی اور روشنی دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اِنکا اطراف میں کوئی خطرہ محسوس کرنے کے لیے بار بار اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ آنند لال کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ میں پرانی حویلی کے کھنڈروں سے گزرتا ہوا کھلی فضا میں آ گیا۔ حویلی سنسان پڑی تھی۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہاں کتنا زبردست معرکہ برپا ہوا ہے۔ راستے میں ایک جگہ درخت کے نیچے رُک کر میں نے تزئین کو لٹایا۔ اس کے چہرے پر پانی چھڑکا اور اس کا منہ اپنے کُرتے کے دامن سے صاف کیا۔ اس نے آنکھیں پٹ پٹائیں لیکن درندوں نے اس کے ساتھ بڑا ظلم کیا تھا۔ وہ کتا بتن علی اس کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔

"آپ فکر مند کیوں ہوتے ہیں جمیل بھائی! یہ ٹھیک ہو جائیں گی۔" آنند لال میری پشت پر ہاتھ رکھ کے بولا۔

"فکر مند کیسے نہ ہوں آنند لال! اسے اس حال میں دیکھ کر میرا کلیجا پگھل رہا ہے۔" میں نے رقت سے کہا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ دُور چلتے ہیں، پھر کسی گاڑی میں بیٹھ کر شبن خاں کے ٹھکانے پہنچتے ہیں۔ شبن خاں پر نہ معلوم کیا گزر رہی ہو گی؟"

کچھ فاصلے پر جا کے انکا کے ذریعے ہمیں ایک گاڑی فراہم ہو گئی۔ گاڑی میں بیٹھ کر ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب کوئی احتیاطی تدبیر مناسب نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ رحیق اور اس کے ساتھی خاموش ہو گئے ہوں گے۔ رحیق کو اپنے انجام کے ڈر سے فرار ہونے ہی میں مصلحت نظر آئی ہو گی۔ رحیق کو چھوڑنے کا مجھے بے حد صدمہ تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ درخشاں زرافشاں کو شبن خاں کی قیام گاہ سے نکال لینے کے بعد کسی محفوظ مقام پر پہنچا دوں گا مگر بھول ہو گئی۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اتنے بہت سے جنوں میں صرف رحیق پر نظر رکھنا اور خود حصار مضبوط بنانا، دونوں کام بیک وقت کرنے مشکل تھے۔ ہماری گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی شبن خاں کے قمار خانے کی طرف گام زن تھی کہ تزئین کا مضمحل جسم جھرجھریاں لے کر بیدار ہوا۔ میں اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ یکایک میرا ہاتھ ایک شدید جھٹکے سے چھڑا لیا گیا۔ میں نے حیرت سے تزئین کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں چند لمحے پہلے خوابیدہ سی تھیں مگر اب

بڑی سُرخ اور خوں خوار نظر آ رہی تھیں۔

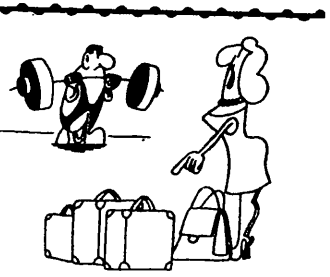

"جمیل احمد خاں!" تزئین نفرت انگیز لہجے میں بولی۔ "اب تم میرے رحم و کرم پر ہو۔"

میرے علاوہ اِنکا اور آنند لال کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ اب دیر ہو چکی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں بمشکل ایک لمحہ صرف ہوا کہ رحیق نے حویلی سے باہر ہمارا حصار ٹوٹتے ہی تزئین کے جسم پر قبضہ کر لیا ہے۔ میں اپنی حماقت پر خود کو کاٹ کھاتا، اگر میں کاٹ سکتا۔

"میں باہر کھڑا تمھارا انتظار کر رہا تھا۔" رحیق تزئین کی زبانی زہرخند سے بولا۔ "اب مجھے اپنی بیٹی کے جسم سے نکالنے کے لیے کوئی منتر پڑھو۔"

"رحیق! تزئین کا جسم چھوڑ دو، ورنہ میں تمھیں کہیں کا نہ رکھوں گا۔ میں تمھیں کھینچ کر باہر نکال لوں گا۔"

"یہ بات اتنی آسان نہیں ہے جمیل احمد خاں!" تزئین نے کہا۔ "تم اپنی لڑکی پر ظلم نہیں کر سکتے اور جب تک تم اس پر ظلم نہیں کر سکتے اس وقت تک میں بڑے آرام سے ہوں ــــ اٹھاؤ ہاتھ اور اس کے نازک بدن پر ضربیں لگاؤ۔"

"تمھارا مقصد کیا ہے؟"

"مجھے تمھاری لڑکی پسند آ گئی ہے۔ بہت دِل کش ہے۔"

"تم بڑے کمینے ہو۔ میں تمھیں...... میں تمھیں......" میرے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔

"تم بھی کچھ کم کمینے نہیں ہو۔ کمینے پن کی ابتدا تمھاری طرف سے ہوئی تھی۔ تم نے زرافشاں درخشاں جیسے پھول روندے تھے۔" تزئین نے ڈھٹائی سے کہا۔

میرا ہاتھ اُٹھتے اُٹھتے اور میرا منہ کھلتے کھلتے رہ گیا۔ میں اپنی بیٹی پر کس طرح ہاتھ اٹھا سکتا تھا؟ میں تزئین کو کس طرح اذیت دے سکتا تھا؟

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

میں نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ گاڑی کا رُخ موڑ دے۔ ڈرائیور کے سر پر اِنکا موجود تھی۔

"کہاں لے چلنے کا ارادہ ہے؟" رحیق نے بے خوفی سے پوچھا۔

"تمھیں جہنّم رسید کرنے ۔۔۔" میں نے جھنجلا کر جواب دیا۔

"اتنی جلدی کیوں ہے خاں صاحب؟ میں بھاگ تو نہیں رہا ہوں۔ مجھے اِس گداز بدن کا لُطف تو لے لینے دو۔"

"جمیل!" ڈرائیور بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کچھ کرتے کیوں نہیں؟"

"اب یہ کیا کریں گے؟" رحیق نے تزئین کی زبانی کہا۔

یہ میرے لیے بڑے صبر آزما لمحے تھے۔ رحیق نے میری شہ رگ دبا رکھی تھی۔ شاید میں پاگل ہو جاتا۔ جمیل احمد خاں بُڈھا گیا میں ایک عرصہ گزارنے کے باوجود بے لبسی محسوس کر رہا تھا حالانکہ اِنکا بھی تھی، آنند لال بھی تھا اور خود میں بھی موجود تھا۔ میں جنوں کے غول میں دیوانہ گھُس گیا تھا۔ میں اس کم بخت کی زندگی حرام کر دیتا۔ آنند لال بھی اس صُورتِ حال سے پریشان تھا۔ رحیق کو نکالنے کے لیے تزئین کے جسم کو اذیت دینی لازمی تھی۔ میں نے اُسے تسخیر کرنے کے لیے مجبوراً خاموشی سے ایک عمل شروع کیا۔ اسی لمحے تزئین کا جسم سر تا پا لرزنے لگا اور اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگے۔ وہ گاڑی میں سر پٹخنے لگی جیسے اس پر مرگی کا دورہ پڑ رہا ہو۔ میں اس صُورت سے گھبرا گیا۔ اسی وقت تزئین قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

"کیا ہو گیا؟"

"جمیل بھائی! سوچ سمجھ کر ۔۔۔" آنند لال درمیان میں بولا۔

"تمھارا دوست صحیح مشورہ دے رہا ہے۔"

کوئی بھی عمل کیا جا سکتا تھا کیونکہ رحیق ایک معمولی اور بد کردار جن تھا۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو میں اُسے آسانی سے بھگا دیتا مگر یہ تو تزئین تھی۔ مجھے تزئین کی ایک چیخ بھی گوارا نہیں تھی۔ رحیق تشدّد پر اُتر آیا تھا۔ گاڑی کا رُخ اب پھر دلّی کی ویران بستیوں کی طرف تھا۔ میں نے گاڑی رُکوا دی اور ہم ایک جگہ اُتر گئے۔ اُترتے ہی میں نے دوبارہ عمل شروع کر دیا۔ تزئین نے اپنے بال اور لباس نوچنا شروع کر دیا۔ ایک بار پھر اس کا وجود شدید جھٹکوں کی لپیٹ میں تھا۔ مجھ میں تاب نہیں تھی۔ میں نے عمل ادھورا چھوڑ دیا۔

"جمیل بھائی! آپ عمل جاری رکھیں۔" آنند لال بولا۔

میں نے بے چارگی سے آنند لال کی طرف دیکھا۔ تزئین کی نظروں میں شیطنت پھر عود کر آئی تھی۔ میں ان نظروں سے سراسیمہ ہو گیا۔ میرے ہونٹ خود بخود ہلنے لگے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور تزئین ایک کربناک چیخ مار کر زمین پر گری اور اس کے جسم میں رعشہ آ گیا۔ میں ایک بار پھر اپنا عمل روک دیتا لیکن میں نے دل پر جبر کر کے اور آنکھیں بند کیے کیے اسے اور تیز کر دیا۔ تزئین کی چیخوں نے کئی بار مجھے منتشر کیا، پھر اچانک جو کچھ ہوا، اُسے دیکھ کے میرا عمل درمیان ہی میں رہ گیا۔ تزئین نے ایک آہ کے ساتھ تڑپنا بند کر دیا۔ میری سانس رُک رہی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ تزئین کا جسم زمین پر ساکت پڑا تھا۔ میں بے تابانہ اس کے جسم سے لپٹنے کو دوڑنا چاہتا تھا کہ ایک کھنکدار آواز سنائی دی۔ یہ کلپنا کی آواز تھی۔ کلپنا تزئین کا جسم حقارت کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کلپنا کو دیکھ کر مجھے ایک ثانیے کے لیے خوشی ہوئی۔ پھر یہ خوشی رنج اور غصّے میں بدل گئی۔ میں سرد آواز میں چلایا۔ "اب کیا لینے آئی ہو؟ سب کچھ لٹا جا رہا ہے۔"

"تم اپنی زبان بند رکھو جمیل احمد خاں!" کلپنا نے بدستور تزئین کے جسم پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ پھر بگڑے ہوئے تیور سے بولی۔ "میں نے تجھے اشاروں اشاروں میں منع کیا تھا، بول اب کیا ارادہ ہے؟"

"تم کون ہو؟" تزئین کے ساکت جسم میں حرکت ہوئی اور اس کی زبان سے بمشکل یہ الفاظ ادا ہوئے۔

"تم نے مجھے بیاکل کیا ہے اور جو مجھے بیاکل کرتا ہے وہ کبھی چین سے نہیں بیٹھتا۔ میں تمھاری موت ہوں۔"

"تم ہمارے درمیان کیوں آ رہی ہو؟ جمیل احمد خاں پاپی ہے۔" تزئین بولی۔ "یہ میرا اور جمیل احمد خاں کا معاملہ ہے۔"

"تو جمیل احمد خاں کا مقابلہ کر سکتا ہے پلید؟ تو نے دوبارہ ٹانگ اڑا کر اب فرار ہونے کا موقع بھی کھو دیا ہے۔" کلپنا نے تیز آواز میں کہا "سُن! اگر تیرے دل میں کوئی حسرت ہے تو جمیل احمد خاں سے دو دو ہاتھ کر لے۔ میں بیچ میں نہیں آؤں گی، پر مُکتی چاہتا ہے تو اس لڑکی کو ترنت چھوڑ دے۔"

"میں انکار کرتا ہوں۔" تزئین نے بے پروائی سے کہا۔

"انکار کرتا ہے؟" کلپنا کا چہرہ دہکتے انگاروں کے مانند سُرخ ہو گیا۔ "پھر سوچ لے مورکھ! ابھی سمے ہے۔"

چند لمحوں تک مکمل سکوت طاری رہا۔ پھر میں نے دیکھا کہ تزئین کا جسم جھٹکے لے رہا ہے۔ میں نے اسے پکڑنا چاہا مگر کلپنا نے مجھے روک دیا۔ "تو نے مہان شکتیوں کے آڑے آنے کی کوشش کی ہے۔" کلپنا غرا کر بولی۔ "اب جب تک تو وچن نہیں دے گا میں تجھے اپنے منڈل سے باہر

این ڈی وی پی کا ماہرِ فن مصروفِ عمل ہے

کھانے پینے کی چیزوں میں غذائیت بڑھانے کے لئے کاشت کے نئے طریقوں کی ترقی و ترویج۔

غذائی تحقیقات کا منصوبہ

NDVP

نیشنل ڈویلپمنٹ

افرادی طاقت میں انقلاب لایئے

والنٹیر پروگرام میں حصّہ لیجئے

این ڈی وی پی سنٹر۔ چھٹی منزل، پی آئی ڈی سی ہاؤس۔ کراچی

ٹیلیفون: ۵۱۱۶۷۷ - ۵۱۱۷۳۷

MNJ

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

آنے کی آگیا نہیں دوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔" تزئین کے منہ سے ایک تھکی ہوئی آواز آئی۔

"یوں نہیں ـــ" پھر کلپنا نے دُوسری جانب کسی جواب کا انتظار کیے بغیر اچانک آگے بڑھ کر تزئین کی بائیں کلائی پر اپنی ایک انگلی رکھ دی۔ تزئین کسی غیر معمولی دُکھ سے اوپر اُچھل گئی اور اس نے اپنی پھٹی پھٹی آنکھیں چاروں طرف پھرانا شروع کردیں۔ نقاہت سے اس کی گردن ٹھیرتی نہیں تھی ـــ میں دیوانہ وار اس کی طرف بڑھا اور میں نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔" تزئین ـــ میری بچی ـــ"

"بابا آپ؟" اُس نے مجھے حیرت سے تکتے ہوئے کہا۔ پھر اطراف کا جائزہ لے کر تیزی سے اُٹھتی ہوئی بولی۔" میں کہاں ہوں؟"

"اپنے ذہن پر زور مت ڈالو میری جان!" میں نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔ معاً میری نگاہ اُس کی بائیں کلائی پر پڑی۔ عین اُس جگہ ایک چھوٹا سا سیاہ داغ نظر آرہا تھا جہاں کلپنا نے انگلی رکھی تھی۔ میں نے کلپنا کی جانب وضاحتی نظروں سے دیکھا۔

"اب کوئی شکتی اسے پریشان نہیں کرسکتی۔" وہ مسرت سے بولی۔

"کیا وہ کم بخت تمھارا منڈل توڑ کر نکل گیا؟" میں نے طنزاً دریافت کیا۔

تزئین کے علاوہ آنند لال بھی چونکے بغیر نہ رہ سکا اور چاروں طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔" کس سے باتیں کررہے ہو جمیل بھائی؟"

تزئین سہم کر میرے سینے سے لپٹ گئی۔ کلپنا شاید میرے سوا کسی کو نظر نہیں آرہی تھی۔ صرف اِلکا نے اُسے دیکھا تھا اس لیے وہ اُسے دیکھ کر میرے پیچھے سرک گئی تھی۔ کلپنا اب بھی میری نظروں کے سامنے تھی۔ کلپنا نے تزئین کو ایک بار اشرفی بیگم کے بالاخانے سے بھی نکالا تھا۔ وہ کئی موقعوں پر میرے کام آئی تھی۔ آج ایک زمانے کے آلام و مصائب کے بعد وہ پھر میرے سامنے تھی۔ وہ یقیناً کلدیپ کی نمائندہ تھی، اس کا عکس تھی۔ کلدیپ کی کوئی دُوسری شکل تھی چونکہ اس کا سلسلہ کلدیپ کے استھان ہی سے ملتا تھا ورنہ مجھ سے مشکل وقتوں میں اور کون ہمدردی کا اظہار کرتا؟ میں نے شکایت بھری نظروں سے اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ وہ اتنی ہی حسین تھی۔ وہی تمکنت۔ وہی شان، دبدبہ، وہی رنگ روپ۔ میرا دل اس سے بہت کچھ کہنے کے لیے بے تاب تھا۔ اسے دیکھ کر سینے میں طوفان اُٹھنے لگے تھے۔ اس نے نمودار ہو کر مجھے صدمہ پہنچایا۔ یہ کیسی ہمدردی تھی کہ کلدیپ نے خود آنے کے بجائے اُسے بھیج دیا؟ یا کلپنا کے وجود میں وہ خود آئی ہے؟ ممکن ہے سید غوث کی درخواست پر اس نے یہ اقدام کیا ہو۔ تزئین پریتم لال کے استھان پر اسی کی نگرانی میں رہی تھی۔ اِلکا نے جنوں کی حویلی میں پہنچنے کے بعد بتایا تھا کہ چاک گریباں سید غوث پریتم لال کے استھان پر چڑھ رہا ہے۔ میں انھی خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ کلپنا ایک شان سے مجھ سے مخاطب ہوئی۔ اس کے لہجے میں بڑا درد تھا اور گہرائی تھی۔" تمھارے من میں دیوی کی طرف سے جو میل آگیا ہے، اُسے دُور کرو۔ وہ نراکش ہے۔ اس نے جو کچھ کیا ہے، کیول تمھارے کارن کیا ہے۔"

"تم اس کی داسی ہو کلپنا!" میں نے اُداسی سے کہا۔" دیوی کے گُن گانا اور اس کی بھگتی کرنا تمھارا دھرم ہے۔ میرا کوئی داس نہیں۔" میری آواز صرف اُسی تک منتقل ہوسکتی تھی۔

"ایسا مت سوچو مہاراج۔" کلپنا جذبات زدہ عالم میں مخاطب ہوئی۔ "دیوی نے اپنا تن من سب کچھ تیاگ دیا ہے۔"

"اُسے اب بھی لگتا ہے کہ اسے میرا خیال آجاتا ہے؟" میں نے طنزاً کہا۔" آہ اس سے کہنا، جمیل احمد خاں مرچکا ہے، اب کس کا خیال؟" میں نے خاموش زبان سے کلپنا کو اپنا پیغام دیا اور تزئین کو ساتھ لے کر آگے بڑھ گیا۔ میں کلپنا سے زیادہ دیر تک نظریں نہیں ملا سکتا تھا ورنہ جذبات کے نہ جانے کتنے سیلاب بہہ جاتے۔ ہم دونوں کی آنکھیں نم ناک تھیں۔ یہی بہتر تھا کہ ہم جُدا ہوجائیں۔

کلپنا کے جُدا ہونے کے بعد اِلکا میرے سر آگئی۔ اس نے کچھ پوچھنا چاہا مگر جواب دینے کا موڈ نہیں تھا۔ میں خاموش ہی رہا۔ اِلکا تزئین کے سر پڑ گئی۔ اس کے جانے سے تزئین کی نقاہت بڑی حد تک کم ہوگئی اور وہ سب کچھ بھول کر اِلکا سے باتیں کرنے لگی۔ وہ حالات کی سنگینی تو اپنی ابتر حالت، میری اور آنند لال کی موجودگی اور محلِ وقوع کی تبدیلی سے صورتِ حال سمجھ چکی تھی، وہ بڑی ذہین لڑکی تھی۔ اِلکا نے اشارتاً بھی اسے بتایا، وہ سید غوث کے لیے بے چین ہونے لگی۔ آنند لال میرے ساتھ گم سُم چل رہا تھا۔ شبن خاں کے مکان پر نہ جانے کیا قیامت آگئی ہو۔ میں تزئین کو جلد سے جلد بمبئی بھجوا دینا چاہتا تھا۔ میں نے آنند لال سے بمبئی جانے کو کہا وہ ہچر مچر کرنے لگا مگر میرے اصرار پر اسے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اِلکا نے دِلّی کی آبادی کے قریب ہی تزئین کے لیے دو چار جوڑی کپڑے فراہم کردیے۔ اِلکا کے لیے یہ ایک آسان کام تھا۔ تزئین نے ایک اجنبی مکان میں آرام سے غسل کیا۔ لباس پہنا۔ مجھے اسٹیشن جانے کی فرصت نہیں تھی۔ میں نے اِلکا کو تزئین کے سر پر ہی رہنے دیا۔ اور اپنی بیٹی کو گلے لگا کر اور جلد آنے کا وعدہ کرکے رخصت کردیا۔

جب میں واپس شبن خاں کے اڈّے پر پہنچا تو وہاں پورا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ باہر پولیس کے آدمی ٹہل رہے تھے اور سڑک پر تماشائیوں کا میلا لگا ہوا تھا۔ میرا لباس یوں بھی پھٹا ہوا تھا اور جگہ جگہ خون کے دھبّے لگے ہوئے تھے، میں نے دور کھڑے رہ کر معاملے کی نوعیت سمجھنا چاہی اور مجھے معلوم ہوا کہ شبن خاں اس وقت سخت پریشانی میں ہے۔ اس کا اڈا گھیرے میں لیا جاچکا ہے۔ میرا وہاں پہنچنا ضروری تھا۔ میں بھیڑ میں راستہ بناتا ہوا اندر داخل ہونے لگا تو ایک پولیس والے نے مجھے روک لیا۔

"کدھر جاتے ہو بابا؟ وہاں اب بھنگ چرس کچھ نہیں ملے گی۔" سپاہی نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔" اب کوئی اور ٹھکانا ڈھونڈو۔" میں نے اسے ایک نظر گھور کر دیکھا۔ دروازے پر کھڑے ہوئے تماشائیوں نے میرا مذاق اُڑانا شروع کردیا۔ سپاہی میری آنکھوں کی مقناطیسی کشش کی تاب نہ لاسکا۔" اندر پولیس ہے بابا!" وہ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بولا۔

"اسے میری ضرورت ہے۔" میں نے دبنگ آواز میں کہا "مجھے جانے دے۔ سمجھا ہے مجھے جانے دے۔" اس نے بے چارگی سے کاندھے اچکائے، میں نے بے نیازی سے اس کا ہاتھ پکڑا، اس کی لاٹھی ہٹائی اور اندر داخل ہوگیا وہ میری صورت دیکھتا رہ گیا اور باہر شور مچتا رہا۔

میں سیدھا نچلے حصّے میں گیا۔ کانسٹیبل اور افسران بکھرے ہوئے تھے، شبن خاں درمیان میں مجہول سا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد اس کے تمام ساتھی مغموم کھڑے تھے۔

"کیا ہے؟" میں نے جاتے ہی پکارا۔

سب میری طرف متوجہ ہوگئے۔ شبن خاں کی آنکھوں میں روشنی کا ایک شعلہ لپکا۔ وہ اپنی نشست سے اُٹھ گیا۔" استاد! تم واپس آگئے؟ کہو خیریت ہے؟"

"اپنی طرف تو سب خیریت ہے۔ پر یہ کیا دنگا ہو رہا ہے؟" میں نے پولیس والوں کو دیکھ کر کہا۔

"یہ اب تک موجود ہیں۔ ان کا خیال ہے لڑکیاں اس مکان میں ہیں۔ میں نے انھیں لاکھ سمجھایا، پر یہ مانتے ہی نہیں۔ اب اور کچھ نہیں تو انھوں نے شراب چرس اور بھنگ پر ہی ہاتھ صاف کرنا شروع کردیا۔" شبن خاں کے لیے یہ کھیل تماشے پرانے ہیں۔ تین چار راز دار حجرے اوپر کے کمرے میں دشمنوں سے نپٹنے کے لیے رکھے تھے، انھوں نے وہ بھی قبضے میں کرلیے۔ اس کے باوجود ان

پیغمبری

کا دعوےٰ دار مامون رشید کے دربار میں پیش کیا گیا۔ گردن تنی ہوئی، سینہ پھولا ہوا۔ اُس نے نہایت حقارت سے مامون رشید کو گھورا۔ مامون نے اپنے حاجب سے کہا۔" اس شخص سے کہو کہ اگر یہ واقعی پیغمبر ہے تو کوئی معجزہ دکھلائے!"

پیغمبری کے مدعی نے اپنی جیب سے چند پتھر نکال کر پانی میں ڈال دیے، جو ذرا سی دیر میں گھل کر پانی میں حل ہوگئے۔

مامون رشید نے کہا۔" ضرور اس میں کوئی عیاری ہے، اگر تم واقعی پیغمبر ہو تو میں خود پتھر دیتا ہوں اُسے پگھلا کے دکھاؤ!"

جھوٹے پیغمبر نے غصّے میں جواب دیا۔" جناب یہ وقت وقت کی بات ہے۔ ورنہ جب حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے دربار میں لاٹھی کو سانپ بنا دیا تھا تو کسی نے بھی یہ نہیں کہا تھا کہ موسیٰؑ! لاٹھی میں دیتا ہوں، اُسے سانپ بنا کے دکھاؤ۔ پس جناب یہ ثابت ہے کہ آپ فرعون سے بڑے نہیں اور میں موسیٰؑ سے بڑا نہیں۔"

کی ہٹ ہے کہ لڑکیاں یہیں موجود ہیں۔ اب انھیں کون سمجھائے۔ یہ وقت ضائع کررہے ہیں، صرف دیواریں اور زمینیں کھودنا باقی رہ گیا ہے۔ یہ بھی کردیکھیں۔" شبن خاں پولیس کے نرغے میں تھا مگر بڑی روانی سے بول رہا تھا۔

میں کشمکش میں پڑ گیا۔ شبن خاں نے لڑکیاں کہاں چھپائی ہوں گی؟ کسی حرام زادے نے مخبری کردی ہوگی کہ شبن خاں کے اڈے میں دو نوجوان لڑکیاں موجود ہیں۔ میرا ذہن کام نہیں کررہا تھا۔ اِلکا بھی موجود نہیں تھی۔ پولیس سے مڈبھیڑ کا سوال نہیں تھا کیونکہ باہر تماش بینوں کا ٹھٹ لگا ہوا تھا۔

"تم میری فکر چھوڑو استاد! میری ان کی یاری پرانی ہے۔ اپنی سناؤ۔ نگینے خیریت سے پہنچ گئے؟" شبن خاں نے آنکھ مار کر پوچھا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا پوچھ رہا ہے؟ کون سے نگینوں کے بارے میں کہہ رہا ہے؟ میں نے تشویش سے کہا۔" شبن خاں! ذرا ادھر تو آؤ۔"

ایک پولیس افسر ہماری باتیں سُن رہا تھا۔ اس نے کہا۔" یہ کون ہے؟"

"اپنا استاد۔ اپنا یار۔" شبن خاں اُٹھتے ہوئے بولا۔" اس کے ہاتھوں میں بجلی بھری ہوئی ہے۔"

"یہ اپنے علاقے کا تو نہیں ہے؟" پولیس افسر نے پوچھا۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

"ارے انسپکٹر صاحب! اس سے تمھارا واسطہ نہیں پڑا۔ ذرا دُور دور رہیے۔ شبّن خاں جب کسی کو استاد کہتا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی کہتا ہے۔" شبّن خاں نے میری طرف آتے ہوتے کہا۔ "ہاں اُستاد! کیا بات ہے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

میں اسے لے کر ایک کونے میں ہو گیا۔ پولیس افسر نے ہمارے قریب آنا چاہا مگر وہ میری آنکھوں کی سُرخی سے مرعوب ہو گیا۔ میں نے اسے شدید غصّے سے دیکھا۔ "دُور ہٹو۔ بات کرنے دو۔"

"اطمینان سے بات کرو۔" پولیس افسر جھینپ کر بولا۔ "آج شبّن خاں بچ نہیں سکتا۔"

"کیا معاملہ ہے شبّن خاں! لڑکیاں کہاں چھپا رکھی ہیں؟" میں نے اس سے رازداری سے پوچھا۔ شبّن خاں دنگ رہ گیا۔

"کیا مطلب استاد؟ یہ بھی خوب رہی ایسے وقت میں تمھیں مذاق سوجھ رہا ہے؟" شبّن خاں ہنستے ہوتے بولا۔

"شبّن خاں!" میں نے ڈپٹ کر کہا۔ "لڑکیاں کہاں ہیں؟"

"ہائیں؟ یعنی خوب۔" شبّن خاں سٹ پٹا گیا۔ "تم نے بھنگ چڑھا رکھی ہے استاد؟"

"میں ہوش و حواس میں ہوں کیا۔ کیا۔" میں کہتے کہتے رک گیا۔

"ہاں کیا کہنا چاہتے ہو۔ تُم۔ تم۔" شبّن خاں بھی کچھ نہ بول سکا۔

"جلدی بتاؤ کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے؟"

"شبّن خاں کی آنکھیں دھوکا کھا گئیں۔ خدا کی قسم استاد! میں کیسے یقین کروں کہ وہ تم نہیں تھے۔ تمھی تو انھیں لے گئے ہو۔" شبن خاں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ "سچ سچ بتاؤ شبّن خاں۔"

"میں اپنی ماں کی قسم کھاتا ہوں کہ سچ کہہ رہا ہوں۔ لڑکیاں۔۔"

میں نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ "اوہ، وہ پھر باز نہیں آیا۔"

"کون؟ وہ تمھارا ہم شکل تھا۔ اس کا ہاتھ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ میں نے پوری تسلّی کر لی تھی۔"

"کب۔؟ وہ کب آیا تھا؟"

"ابھی کچھ دیر پہلے۔ میں نے پہلے تو نیچے ہی روکے رکھا۔ پولیس اُوپر جاتی تو لڑکیاں اسے نظر آجاتیں۔ پھر مجھے خبر دی گئی کہ تم اوپر موجود ہو۔ پولیس کو جل دے کر اوپر گیا اور میں نے اوپر جا کر دیکھا تو تم دروازہ کھول رہے تھے۔ میں نے تہہ خانے کا راستہ دکھایا اور وہاں سے باہر نکلنے کا خفیہ راستہ بھی۔ جب تم چلے گئے تو میں انھیں اوپر لے آیا۔ وہ تہہ خانے تک پہنچ گئے۔ وہاں سے انھیں کچھ نہیں ملا۔ مجھے بتاؤ استاد، یہ کیسا لفڑا ہے؟"

"کچھ نہیں شبّن خاں۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "مجھے معاف کر دو۔ تم اُن کے ساتھ تھانے چلے جاؤ۔ تمھیں کچھ دن یقیناً جیل میں رہنا پڑے گا لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمھیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں تمھیں جلد ہی چھڑا کر لے آؤں گا۔"

"میری بات چھوڑو۔ جیل تو اپنا دوسرا گھر ہے۔ اِدھر نہ رہے اُدھر رہ لیے۔ جیل میں اپنے ٹھاٹ رہتے ہیں۔ کاروبار چلتا رہے گا۔ سب دھندا اپنی اسی طرح چلتا ہے بابا! پولیس والوں کو خانہ پُری کرنے دو۔ ان کی روزی بھی ہمارے دم سے ہے۔"

"نہیں شبّن خاں! میں تمھارے پاس جلد واپس آؤں گا۔"

"جیل میں؟" شبّن خاں نے ہنستے ہوتے کہا۔

"اب مجھے جانا ہوگا۔" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "مجھے لڑکیوں کی تلاش میں جانا ہے۔"

"جانے سے پہلے کچھ تسلی تو کرتے جاؤ کہ یہ کیا گورکھ دھندا ہے؟" شبّن خاں نے میرا ہاتھ پکڑ کے کہا۔

"یہ وقت کچھ بتانے کا نہیں ہے شبّن خاں! اس وقت مجھے جانے دو۔" میں نے اپنا ہاتھ چھڑا کے اضطراب میں کہا۔

"میں تمھارا انتظار کروں گا استاد! قسمت یاوری نہیں کر رہی ہے ورنہ شبّن خاں تمھارے ساتھ ہی چلتا۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے شبّن خاں!" میں تیپ چھپاتا ہوا پولیس کے درمیان چھوڑ کے باہر آگیا۔ پولیس والوں نے مجھے روکنا چاہا لیکن روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ شبّن خاں کی وجہ سے پولیس کی آنکھ میں کچھ مروّت باقی تھی۔ انھوں نے مجھے زیادہ پریشان نہیں کیا۔ میں پھر دلّی کی گنجان سڑکوں پر آگیا۔

بدھ گیا سے چلنے کے بعد یہ چند روز سفر یا مصیبتوں ہی میں گزرے تھے۔ زرافشاں درخشاں کو پھر رحیق لے گیا تھا۔ میں چاہتا تو ان کا تعاقب چھوڑ دیتا لیکن زرافشاں درخشاں سے اس طرح دست بردار ہونے میں ذلت محسوس ہوتی تھی۔ اُن سے دوران سفر میں ایک طرح کی وابستگی ہو چلی تھی اور ابھی جب انھوں نے میری ذات پر اعتماد کرنا شروع ہی کیا تھا کہ انھیں رحیق لے گیا۔ بتّن علی نیم پاگل تھا۔

سب رنگ

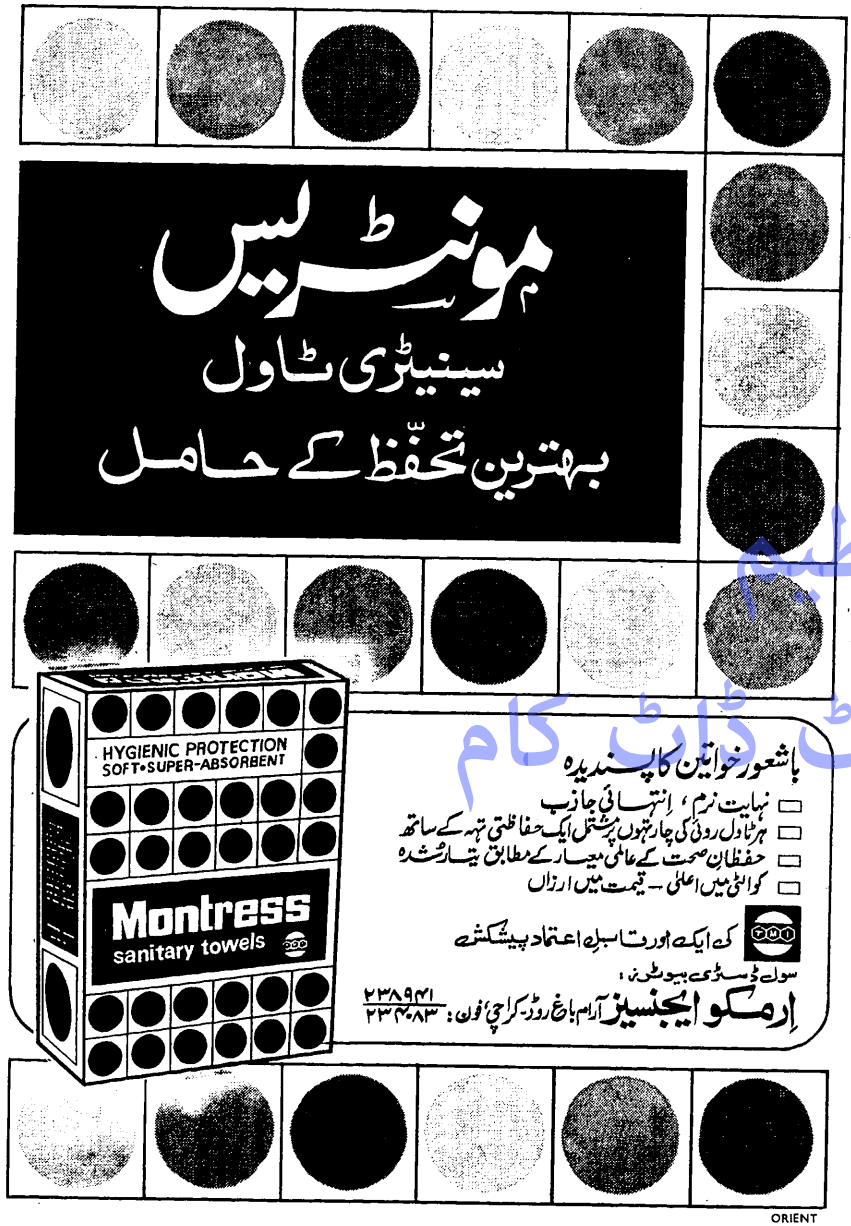

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

ان کی حویلی راکھ ہو گئی تھی۔ اب ان کے پاس کچھ نہیں رہا تھا۔ ہر چند کہ ان کی تباہی کا سب سے بڑا سبب میں تھا لیکن انھی سے مجھے ہمدردی تھی۔ رحیق نے پھر میرے جسم و جاں میں آگ پھونک دی تھی۔ میں شاہن خاں کے اڈے سے نزدیک ایک قبرستان میں بیٹھ گیا۔ یہی ایک جگہ تنہائی اور سکون کی تھی، لوگ قبروں کے پاس آتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ انھیں پتہ نہیں کہ مرنے والے اس بات سے کتنے خوش ہوتے ہوں گے۔ قبرستان کے ایک کنوئیں سے پانی نکال کر میں نے اپنا چہرہ صاف کیا اور ایک قبر کے سرہانے ارتکاز میں ڈوب گیا۔ میری نظریں درخشاں زرافشاں کو ڈھونڈ رہی تھیں، وہ بھی تزئین کے مانند معصوم اور مظلوم لڑکیاں تھیں۔ رحیق انھیں دلی کی سڑکوں پر آسانی سے نہیں گھما پھرا سکتا تھا۔ وہ انھیں شکستہ حویلی میں بھی نہیں لے جا سکتا تھا۔ لکھنؤ میں ہاشم علی کی حویلی کے کھنڈر بھی باقی نہیں رہے تھے۔ میرا ہر دم بھر کے وہ درخشاں زرافشاں کو زیادہ دیر تک لوگوں کے سامنے بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ دلی ہی میں ہے۔ اُسے گئے ابھی زیادہ وقت بھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے اپنے باطن کے دروازے کھولے اور وہ باطنی آئینہ جس پر ریاضت کی مشقت کے بعد جلا آتی ہے، میرے استغراق سے چمکنے لگا۔ یہ آئینہ انھی لوگوں کو نظر آتا ہے جو اسے دیکھنے کے خواہاں ہیں یا جنھیں قسمت بخش دیتی ہے۔ میں دونوں طرح اس آسودگی سے بہرہ ور ہوا۔ مجھے ندا نے بہت کچھ دیا تھا اور میں نے خود بھی بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ میرے انہماک نے مجھے راستہ دکھایا اور میں نے جب اچھی طرح اپنا ذہن مطمئن کر لیا تو قبر پر الوداعی نظر ڈالی۔ نہ جانے کون خوش نصیب اس قبر میں سو رہا ہو گا؟ وہ مسلسل استغراق میں ہے، ایسا مراقبہ جس میں باہر کی ہوا ذہن کثیف نہ کر سکے۔ موت مجھ سے ناراض تھی اور زندگی بھی خوش نہیں تھی۔ میں نہ زندگی کے پیچھے بھاگتا تھا اور نہ اس میں شامل تھا مگر زندگی میرے پیچھے رواں تھی۔ قبریں دیکھ کر مجھے رشک آیا۔ یہاں میرے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں اپنی تیرہ نصیبیوں پر روتے روتے اٹھا اور چلتے چلتے لال قلعے کے اُس پار جمنا کے کنارے تک پہنچ گیا۔

جمنا کا پانی پُرسکون تھا۔ سکون و سکوت کا ایسا نظارہ دیکھ کر آنکھوں کی صحت پر شبہ ہوتا تھا۔

رحیق دونوں لڑکیوں کو دلی کے نواح میں لے گیا تھا۔ وہ سادہ لوح دیہاتیوں کے سامنے ہی انھیں اپنے ساتھ رکھنے کا جواز پیش کر سکتا تھا، انکا ہوتی تو وہ لمحوں میں کسی ایک لڑکی کے سر پر پہنچ جاتی اور انھیں حقیقتِ حال سے آگاہ کر دیتی۔ میں انکا کو بلا سکتا تھا مگر جب تک تزئین اور آنند لال خیریت سے بمبئی نہ پہنچ جاتے اُسے بلاتے ہوئے جھجک ہوتی تھی، میں خود ہی چل پڑا۔ جب میں گاؤں میں داخل ہوا تو پرندوں نے آسمان خالی کر دیا تھا اور رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا، دن بھر عجیب و غریب ہنگاموں میں گزر گیا تھا، پاؤں بوجھل ہو رہے تھے پھر بھی میرے تیز قدم آبادی کی جانب اٹھ رہے تھے اور میں نے رحیق سے آخری بار نمٹنے کے لیے کچھ فیصلے کر لیے تھے۔ میں اس چھوٹے سے گاؤں کی چار پانچ گلیوں سے گزرنے کے بعد اس مکان پر پہنچ گیا جہاں میرے اندازے کے مطابق لکھنؤ کے معزز گھرانے کی حسین لڑکیاں زرافشاں درخشاں موجود تھیں۔ میں نے اندھیرے میں آہستہ سے دروازے پر دستک دی اور اطمینان کر لیا کہ میرے ہاتھ صحیح جگہ پڑے ہیں۔ پہلی دستک کے بعد میں خود خاموش ہو گیا کہ مجھے رحیق کا محاصرہ کرنے کے لیے ذرا سی مہلت کی ضرورت تھی۔ دروازے سے ہٹ کر میں دیوار کی آڑ میں کھڑا ہو گیا اور دیواریں ٹھونکتا ہوا دوبارہ دروازے پر آ گیا۔ چند ثانیوں کے توقف کے بعد جب میں نے دوبارہ دستک دی تو اندر سے "کون کون" کی آواز کے ساتھ کھانستی ہوئی ایک بوڑھی عورت نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں چراغ تھا۔ مجھے دیکھتے ہی چراغ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کی سسکاری نکل گئی "تم۔ تم تو ابھی۔۔۔۔ اندر تھے" وہ گھگیا کر بولی۔

"ہاں۔ میں" میں نے کچھ سمجھ کر کہا "میں تم سے کہے بغیر باہر چلا گیا تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ کسی نے اندر سے دروازہ بند کر دیا ہے۔"

"مگر۔ مگر" بوڑھی عورت کانپنے لگی۔

"ارے تم تو ڈر گئیں؟" میں نے ہنس کر کہا "مجھے اندر تو آنے دو۔ گاؤں والے شہر والوں کی پھرتی دیکھ کر ڈر جاتے ہیں" میں اسے ہٹاتا ہوا اس چھوٹے سے مٹی کے مکان میں داخل ہو گیا اور تیزی سے سامنے والی کوٹھری کی طرف بڑھا۔ وہاں چراغ کی مدھم لو میں صرف درخشاں اور زرافشاں بیٹھی تھیں۔

"آپ یہاں سے اچانک کہاں چلے گئے تھے؟" زرافشاں غم زدہ لہجے میں بولی۔

"یوں ہی" میں نے کوٹھری میں چاروں طرف جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"بوڑھی بے چاری تو حیران تھی۔ آپ بیٹھے بیٹھے کہاں غائب ہو

گئے تھے" درخشاں نے کہا "ہماری تو خیر کوئی بات نہیں، اس بے چاری نے ایسے دو تین واقعات اور دیکھ لیے تو اس کا دم نکل جائے گا۔"

"میں کتنی دیر پہلے گیا تھا؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"کیا؟ کیا آپ کو خود علم نہیں ہے؟" زرافشاں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں ڈوب گیا تھا۔ ایسی صورت میں وقت کا کوئی پتہ نہیں رہتا۔"

"آپ ابھی ابھی غائب ہوتے تھے۔"

"اوہ" میری آواز بیٹھنے لگی اور میرے منہ سے نکل گیا "وہ بھاگ گیا۔"

"کون؟ کون بھاگ گیا؟" زرافشاں نے اضطراب سے پوچھا۔

"کوئی نہیں۔ کوئی نہیں۔ تم آرام کرو، ہمیں علی الصباح یہاں سے چلنا ہو گا" میں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ ہمیں کچھ دن یہاں رہنا ہو گا پھر ہم۔۔۔۔ پھر ہم۔"

"نہیں۔ اب ہم صبح سویرے یہاں سے چل پڑیں گے۔ تم اطمینان سے سو جاؤ۔" میں نے مزید کوئی بات کرنے میں دقت محسوس کی۔ حواس باختہ بوڑھی عورت دزدیدہ نظروں سے دیکھتی اور کھانستی ہوئی کوٹھری میں واپس آئی تو میں نے اسے کوئی اور سوال کرنے کی مہلت نہیں دی۔ اسے چپ سی لگ گئی اور تھوڑی ہی دیر میں وہ غافل ہو گئی۔ میں نے اس کے صندوق ٹٹولنے شروع کر دیے۔ صندوق میں کسی سپاہی کی دھلی ہوئی وردی اور سادہ کپڑے رکھے تھے۔ میں نے سادہ لباس میں سے ایک جوڑا اپنے لیے منتخب کیا اور اس کے عوض زرافشاں کے ہاتھ سے سونے کی ایک چوڑی اتار کر اس میں ڈال دی۔ پھر میں نے غسل کیا۔ خون کے تمام دھبے صاف کیے۔ بوڑھی عورت کی کنگھی سے بالوں میں کنگھی کی۔ زرافشاں درخشاں ایک ہی چارپائی پر سمٹی ہوئی تھیں۔ میں کوٹھری سے باہر چھوٹے سے صحن میں آ گیا اور مٹی کے ایک چبوترے پر بیٹھ کر خود کو گم کر دیا۔ میرا جسم چبوترے پر موجود رہا لیکن جسم کا جوہر۔ وہ جوہر جس کی شناخت لوگ نہیں کر پاتے۔ میں نے اس صفتِ اعلا کو محوِ پرواز کر دیا۔ اس سے بہتر نیند اور کیا ہوتی؟ رات بیت گئی۔ سورج نکلنے اور بوڑھی عورت کے بیدار ہونے سے پہلے میں نے زرافشاں درخشاں کو اٹھایا اور صبح ہوتے ہوتے ہم پیدل ہی گاؤں سے دُور نکل گئے۔ درخشاں زرافشاں نے میری ایما پر بوسیدہ چادروں سے اپنے بدن ڈھانپ لیے تھے اب ان کا لباس چھپ گیا تھا۔ میری حالت بھی ابتر نہیں رہی تھی۔ شہر میں زندگی کی چہل پہل شروع ہونے کو تھی۔ سورج چڑھنے تک ہم اسٹیشن پہنچ گئے۔

میں نے اس بار فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں جنوب کی طرف جانے والی گاڑی کا انتظار کیا۔ یہ بات ہم جیسے سادہ اور معمولی لباس والوں کی اوقات سے بڑھ کر تھی اس لیے کئی چہرے اٹھے اور دلچسپی سے ہمیں دیکھنے لگے۔ زرافشاں درخشاں بات کرنے کے لیے مضطرب تھیں، وہ مجھ سے پوچھنا چاہتی ہوں گی کہ اب میرے ارادے کیا ہیں؟ میری بیٹی تزئین کا کیا حشر ہوا؟ میں نے اچانک ارادہ کیوں بدل دیا؟ میں انھیں دیہات سے کیوں لے آیا؟ ان کے چہروں پر سوال رقم تھے اور میرے لبوں پر سکوت تھا۔ میری گہری خاموشی سے انھیں کچھ پوچھنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ انھوں نے حالات کی ستم ظریفی کے سامنے سپر ڈال دی۔ گاڑی کے لیے زیادہ طویل انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پہلے میرا ارادہ انھیں بمبئی لے جانے کا تھا مگر پھر گلبرگہ کا خیال آ گیا۔ رکن الدین ایسے کئی موقعوں پر میرے کام آ چکا تھا۔ اس محفوظ ٹھکانے میں ان لڑکیوں کے سامنے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

میں پوری طرح شرمندہ ہو سکتا تھا اور ان کے زخموں کے اندمال کی کوشش کر سکتا تھا۔ میری جیب میں کوئی پیسہ نہیں تھا، انکا اور آنند لال کی وجہ سے پیسوں کی اب تک ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی میں فرسٹ کلاس کے ڈبے میں بیٹھ گیا اور بیٹھنے کے بعد میں نے کھڑکیاں بند کر لیں۔ گاڑی دلّی اسٹیشن سے چلی تو میں نے پاؤں پھیلا دیے اور لڑکیوں کو بھی آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

"کہاں کا ارادہ ہے؟ کیا ہم پوچھ سکتے ہیں؟" زرافشاں نے بے چارگی سے پوچھا۔

"ہاں آں۔ کیوں نہیں۔" میں نے ندامت سے کہا "کیوں نہیں۔ میں تو تم سے خوب باتیں کرنا چاہتا ہوں مگر سوچتا ہوں کس منہ سے تم سے باتیں کروں۔"

"نہیں۔ آپ کچھ کہیے تو سہی۔ اس تنہائی اور خاموشی سے ہم اُکتا گئے ہیں۔ اب آپ ہمیں کہاں لے چل رہے ہیں؟" درخشاں نے جرأت سے پوچھا۔

میں نے سرسری طور پر انھیں تزئین کی بازیابی کا قصہ سنایا، پھر شبّن خاں کا واقعہ سنایا۔ میں نے جب یہ بتایا کہ انھیں شبّن خاں کی حویلی سے لے جانے والا شخص میں نہیں تھا، رحیق تھا تو اُن کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ "پھر ہوا یہ۔" میں نے انھیں تفصیل بتاتے ہوئے کہا "مجھے رحیق کا پیچھا کرنا پڑا کیونکہ وہ تمھیں بدنام کر رہا تھا جب کہ شاید میرے پاس تمھارے لیے کوئی اچھا منصوبہ ہو۔"

"یہ بڑی عجیب اور خوف ناک رُوداد ہے۔" زرافشاں دانتوں میں انگلیاں دیتی ہوئی بولی۔

"مگر ہم اب بھی کس طرح یقین کریں کہ آپ رحیق نہیں ہیں؟" درخشاں معصومیت سے بولی۔

"ہاں یہ دلچسپ سوال ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں جمیل احمد خاں ہی ہوں کیوں کہ تمھیں میرے چہرے پر جو ندامت نظر آتی ہے وہ رحیق کے جمیل احمد خاں میں نہیں ہو گی۔"

"آپ ندامت کا بار بار ذکر کر کے ہمیں دُکھ دیتے ہیں اور شرمندہ بھی کرتے ہیں۔"

"میں تمھارا گناہ گار ہوں۔"

"للّٰہ یہ ذکر بند کیجیے، کوئی اور بات کیجیے۔"

"کاش میں اس کا تدارک کر سکتا۔"

"خدا کو یہی منظور تھا، ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا کہ ہم اسی طرح دربدر ہوتے۔" وہ دونوں کرب سے بولیں۔

"آہ زری! رخشی! میں تمھیں اپنا دل چیر کر دکھاؤں؟ اس میں زخم ہی زخم ہیں۔" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "تم مجھے معاف کر دو۔ تم مجھے معاف کر دو۔" میں نے گڑگڑا کر کہا۔

زرافشاں درخشاں بھی میرے ساتھ رونے لگیں۔ پھر آنسوؤں کی یہ جھڑی تھمنے نہ تھمی۔ کتنے غم تھے جو بہنے لگے۔ وہ خوب روئیں۔ میں بھی خوب رویا۔ جب آنسو بھی باقی نہ رہے تو میں نے اُن سے کہا "زری رخشی، مجھے یہ اعتماد بخشو کہ تم مجھ پر اعتبار کرتی ہو اور مجھے موقع دو کہ میں تمھاری بگڑی ہوئی دُنیا سنوار سکوں۔"

"پہلے آپ یہ وعدہ کیجیے کہ دوبارہ کوئی پرانا ذکر نہیں کریں گے۔" درخشاں بولی۔

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔"

"پھر آپ خود سوچیے کہ ہمارا کون رہ گیا ہے؟ اب تو جو بھی ہمیں قریب سمجھنے کی عزّت بخشے گا، وہی ہمارے لیے سب کچھ ہو گا۔ آپ ہی نے...." وہ کہتے کہتے رُک گئی "چھوڑیے پھر پرانی بات یاد آ جائے گی۔ آپ کے سوا اس زمین پر کوئی شناسا چہرہ نظر نہیں آتا۔"

"میں تمھارے اعتماد پر پُورا اُتروں گا۔ میں تمھارے لیے زندہ رہوں گا۔" میں نے جوش سے کہا "سنو زری، رخشی، قریب آ جاؤ۔ میرے غم سنو، میرے آنسو سنو، سنو میں کون ہوں۔ میں کیا تھا اور کیا سے کیا بن گیا۔ شاید تمھیں یقین نہ آئے مگر میں تمھیں سب کچھ بتا دینا چاہتا ہوں۔"

وہ میری برابر آ گئیں اور میں نے آنکھیں موند لیں۔ "اپنا ہاتھ لاؤ۔" انھوں نے اپنے ہاتھ آگے کر دیے تو میں نے انھیں اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ "میرے دل میں تمھارے لیے صرف محبتیں ہیں۔ میں تمھیں کچھ سنانا چاہتا ہوں، شاید تم میرے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکو۔" وہ ہمہ تن گوش ہو گئیں اور میں نے شروع سے آخر تک اپنی عجیب و غریب سرگزشت انھیں سنانی شروع کی۔ ان کی دلچسپی اور انہماک کا یہ عالم تھا کہ دوپٹے ان کے سروں سے ڈھلک گئے تھے۔ انھیں کچھ خبر نہیں تھی۔ وہ سراپا استعجاب، مجسم حیرت بنی ہوئی تھیں۔

بہت سے واقعات میرے ذہن سے محو ہو گئے تھے، بہت سے میں ان کے سامنے بیان کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ سناتے سناتے میرا حلق خشک ہو گیا، سنتے سنتے ان پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی! اور آخر میں نے اُن سے کہا۔ "اب تمھی بتاؤ کہ جو کچھ ہوتا رہا، کیا وہ ردِ عمل کے سوا کچھ اور تھا؟"

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

وہ بت بنی میری صورت دیکھ رہی تھیں۔ "کیا تم مجھ سے خوف زدہ ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ نہیں۔" وہ چونک کر بولیں۔ "ہم بھول گئے تھے کہ ہم یہاں ہیں۔ کیا اس دنیا میں ایسا بھی ممکن ہے؟"

"میں تمھارے سامنے ہوں۔"

"عجیب ہے۔" وہ ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگیں۔ ان کے منہ سے کچھ اور نہیں نکلا۔

"قسمت بھی عجب مذاق کرتی ہے۔" زرافشاں بہت دیر بعد خوابیدہ لہجے میں بولی۔ "خدا آپ کی زندگی کو سکون بخشے۔"

گاڑی رتلام کے اسٹیشن پر رکی تو ایک ٹکٹ چیکر آ گیا۔ اب کے درخشاں، زرافشاں ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہوئیں۔ ٹکٹ چیکر جس طرح آیا تھا، اسی طرح واپس چلا گیا۔ اسے کچھ پوچھنے کا حوصلہ ہی نہ ہوا۔ سفر میں انھیں بھوک بھی لگی۔ میں تو ان باتوں کا عادی تھا۔ مشکل یہ تھی کہ ہم تینوں میں سے کسی کے پاس دھیلا تک نہیں تھا۔ اتنی لمبی سرگزشت سنانے کے بعد یہ عجیب سا معلوم ہوتا تھا کہ میں کسی اسٹیشن پر ان کے لیے کھانے کی فراہمی کا بندوبست بھی اٹھائی گیروں اور اچکوں کے انداز میں کروں۔ مجبوراً میں نے زری سے اس کے ہاتھ کی دوسری چوڑی مانگی۔ زری نے کسی تامل کے بغیر اسے میرے حوالے کر دیا۔ ایک اسٹیشن پر ہم نے کھانا منگوایا اور میں نے چپکے سے بیرے کے ہاتھ میں چوڑی تھما دی۔ وہ کوئی بھلا آدمی تھا۔ انکار کرنے لگا۔ میں نے اسے ڈپٹ دیا۔ اس نے خاموشی سے چوڑی جیب میں رکھ لی، بعد میں وہ ایسا ہمدرد ہو گیا کہ ہر اسٹیشن پر خیریت معلوم کرنے آنے لگا۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں کیسی دلچسپ ہیں؟ میں نے بہت کم ان کا تذکرہ کیا ہے مگر جب گفتگو چھڑتی ہے تو تمام تفصیل خود بخود یاد آنے لگتی ہے۔ گلبرگہ تک زرافشاں، درخشاں کھل کر باتیں کرنے لگی تھیں۔ اور اب ان کا رویّہ اور لہجہ بالکل بدل گیا تھا۔ ان کے چہروں کی زردی رخصت ہونے لگی تھی۔ مسکراتے وقت ان کے خوبصورت دانت نظر آنے لگے تھے۔ ایک رات اور دو دن کے اس سفر میں ہم بالکل نہیں سوئے، باتیں ہی ہوتی رہیں، وہ لڑکیاں اتنی شائستہ، اتنی دلچسپ اور اتنی خوش گوار گفتگو کرتی تھیں کہ سفر محسوس ہی نہیں ہوا۔ وہ اپنے بچپن اور اپنے اعزا کے بارے میں بتاتی رہیں کہ انھوں نے ان کے بگڑتے حالات دیکھ کر کیسا منہ موڑ لیا۔

میں جب گلبرگہ اترا تو میرا سینہ مسرت کے جذبے سے معمور تھا

اس بار مجھے گلبرگہ جانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ رکن الدین سے ایک مدت بعد ملاقات ہو رہی تھی۔ جیسی مجھے توقع تھی، اپنی پیرانہ سالی کے باوجود رکن الدین اور اس کے مختصر خاندان نے میری آمد پر آنکھیں بچھا دیں۔ میں نے رکن الدین سے کہا۔ "تمھارے لیے دو بیٹیاں۔"

اس نے خوش دلی سے جواب دیا۔ "یہ میرے لیے سعادت ہے۔"

زرافشاں درخشاں کو ناہید کی چھوٹی بہن طلعت نے عمدہ لباس دیا اور وہ سب ایسی گھل مل گئیں جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتی ہوں۔ میرے لیے اوپر کا کمرہ مخصوص تھا۔ بدھ گیا کے حضر سے ہنگامی سفر کے بعد تک اب کہیں سکون ملا تھا۔ میں اپنے کمرے میں چلا گیا اور ماہ و سال میری نگاہوں میں گردش کرنے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ چھت کے نقش و نگار گھوم رہے ہیں اور ہر شے گھوم رہی ہے ہر چیز حرکت کر رہی ہے۔ مجھے اس حرکت سے چڑ ہونے لگی اور میرے دل میں حرکت سے بغاوت کا جذبہ ابھرا۔ میں پلنگ سے اٹھ گیا اور فرش پر آ گیا پھر میں نے اپنی دونوں ٹانگیں ایک دوسرے پر پھیلا دیں اور نگاہیں ساکت کر لیں اور اس طرح حرکت پر فتح حاصل کر لی۔ میں نے زندگی کے دوران میں زندگی کو شکست دے دی۔ میرے کان سماعت سے محروم ہو گئے اور میری آنکھیں میرے اندر کھلنے لگیں۔

●

گلبرگہ میں چند روز قیام کے بعد میرا ارادہ یہ تھا کہ میں شبّن خاں کی مدد کے لیے دوبارہ دلی جاؤں، شبّن خاں جیل جانے کا عادی تو تھا ہی مگر خصوصاً اس بار اس پر یہ افتاد میری وجہ سے پڑی تھی پھر بھی زری اور رخشی کی خاطر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ تین چار روز بعد انکا میرے سر پر سوار ہو گئی اور اس نے تزئین کی صحت مندی اور سید غوث کی واپسی کا مژدہ سنایا۔ آنند لال انکا کو واپس بھیجنا نہیں چاہتا تھا۔ انکا اس سے ایک مختصر وقفے کی مہلت لے کر میرے پاس آ گئی تھی۔ انکا نے مجھے بتایا کہ تزئین کی گم شدگی سے مالا، سہراب، پریم سبھی پریشان تھے اور کسی معجزے کے منتظر تھے۔ جب آنند لال تزئین کو لے کر گھر پہنچا تو انھوں نے ایک ساتھ جشن منایا اور اب تک ساتھ ہی رہ رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ سب بے حد خوش ہیں۔ میں نے جو پودے لگائے تھے وہ بہار دے رہے ہیں۔ رحیق جن نے درمیان میں آ کے اُن کی پرسکون زندگی میں ہلچل مچا دی تھی۔ وہی کم بخت مجھے بدھ گیا کے بے نیاز ماحول سے نکال کر دوبارہ زندگی کی کثافتوں میں لے آیا تھا۔ انکا کہتی تھی کہ سید غوث اگر تزئین کو جلد ہی نہ ملتی تو وہ خودکشی کر لیتا۔ انکا نے

کچھ اس انداز سے ان سبھوں کا تذکرہ کیا کہ مجھے اپنا وہ لہلہاتا گلزار دیکھنے کی تڑپ ہونے لگی لیکن میں سر دست زری رخشی کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

انکا کی آمد کے بعد میں نے اپنی صداقت کے مدلّل اظہار کے لیے ایک دن رخشی اور زری کو اپنے کمرے میں بلایا اور انکا کو باری باری ان کے سروں پر بھیج دیا۔ "یہ انکا ہے۔ تزئین کے پاس سے واپس آئی ہے، کہتی ہے وہ سب بے حد خوش ہیں۔ کسی دن تمھیں بھی تزئین سے ملواؤں گا۔"

انکا یکے بعد دیگرے زری اور رخشی کے سروں پر گئی۔ وہ اُچھل اُچھل پڑیں۔ "ارے واقعی! یہ تو ایک چھوٹی سی پیاری سی حسین لڑکی ہے۔" اُن کی آنکھوں میں حیرت و استعجاب کی جھلکیاں نمایاں ہو گئیں۔

"ہاں یہی ہے وہ۔" میں نے خفت سے کہا۔ "یہی ہے وہ۔ یہ کسی کی دوست بن جائے تو بھی مشکل ہے اور دشمن بن جائے تو بھی مشکل۔ اس چھوٹی سی لڑکی میں حیرت انگیز طاقتیں ہیں۔ میری داستان میں انکا کے بغیر کچھ نہیں ہے۔"

"انکا۔" انھوں نے حیرت سے زیرِ لب دہرایا۔ "واقعی یہ کتنی عجیب بات ہے۔" وہ آنکھیں پٹ پٹانے لگیں۔ "یہ بولتی بھی ہے؟"

"بولتی ہے! یہ بڑی قطامہ ہے، اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے، دل اس کا کوئلے کی طرح سیاہ ہے۔ آنکھیں اس کی طوطے کی طرح بے مروّت ہیں۔" میں نے انکا کے اوصاف بتاتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔ تو ہم سے بھی بات کرائیے نا۔"

"بولو انکا! زری اور رخشی سے باتیں کرو۔ بہت دلکش باتیں۔" میں نے انکا کو اشارہ کیا۔ وہ رخشی کے سر پہ بیٹھی تھی۔

"اب کیا بولوں؟ تم نے پہلے ہی میری تعریفوں کے پُل باندھ دیے ہیں۔" انکا نے چنک کر کہا۔ "میں تمھاری نظروں میں گر گئی ہوں۔" زری اور رخشی کا حیرت سے بُرا حال تھا۔ "آپ انکا ہیں؟" زری نے ادب سے کہا۔

"ہاں جی میرا نام انکا ہے۔" انکا نے ٹھنک کے جواب دیا۔

"آپ ایسی کیسے ہیں؟ آپ کسی کو نظر بھی نہیں آتیں؟"

"بس زری! ایسی باتیں نہ پوچھو۔" انکا نے شوخی سے کہا۔ "جو تمھاری راتوں کی نیند اُڑا دیں۔ نہ جانے میں ایسی کیوں ہوں؟ سچ پوچھو تو مجھے خود نہیں معلوم۔"

"ہم تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے۔" رخشی ابھی تک مبہوت تھی۔

مقریزی

سے ایک مصیبت زدہ اور پریشان حال شخص نے اپنے بُرے حالات کا رونا رونا شروع کر دیا "روزی مجھ سے دور بھاگتی ہے، نیک ساعتیں گریزاں اور مواقع راہِ فرار اختیار کرتے ہیں، ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"

مقریزی نے جواب دیا۔ "ان کا تعاقب جاری رکھو یہاں تک کہ آخرکار تم اُن کو پالو گے!"

مصیبت زدہ نے تھکے ہارے لہجے میں کہا۔ "آخر کب تک؟ اب تو میں تھک چلا ہوں۔"

مقریزی نے بے نیازی اور عالمانہ شان سے جواب دیا۔ "پھر تو مجبوری ہے۔ افسوس کہ تم اس نکتے سے بے خبر ہو کہ مصائب سے مرد پیدا ہوتے ہیں اور عیش سے جانور!"

"انھوں نے مجھے بڑا بدنام کیا ہے۔" انکا نے ٹھمک کے میری طرف اشارہ کیا اور زری کے سر میں پنجے چبھونے لگی۔

"ارے ارے آپ نے تو ہمارا سر دکھا دیا۔" زری خوف زدہ آواز میں بولی۔ "کیا آپ ہم سے ناراض ہو گئیں؟"

انکا کو میں نے اس ابتدائی تعارف کے بعد زری اور رخشی ہی کے پاس چھوڑ دیا۔ مجھے بس ان کی خوشی عزیز تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کسی طرح اپنا غم بھول جائیں اور خود کو اس گھر میں شامل سمجھیں میرے مزید قیام کی یہی وجہ تھی۔ میری موجودگی میں وہ بہتر طریقے سے مفاہمت کر سکتی تھیں۔ رکن الدین نے حسبِ سابق ان کے لیے عمدہ ملبوسات سلوائے اور زیوروں سے ان کا جسم لاد دیا، ان ملبوسات اور زیورات میں وہ دلھنیں لگتی تھیں۔ زمانے کے حوادث نے ان کے چہروں سے جو شادابی چھین لی تھی وہ رفتہ رفتہ واپس آنے لگی تھی۔ طلعت انھیں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں چھوڑتی تھی۔ انکا بھی دلچسپ حرکتیں کر کر کے ان کا دل بہلانے میں مصروف رہتی، خود زری اور رخشی اتنی شائستہ اور خوش اطوار تھیں کہ اپنی شُستہ اور دلکش باتوں سے جلد ہی متاثر کر لیتی تھیں۔ ان کا رنگ نکھرنے لگا تھا اور اُداسی کی پرچھائیاں دور ہونے لگی تھیں۔ میں نے انھیں رکن الدین کے گھر میں شہزادیوں کی طرح جگمگاتے دیکھا۔ رکن الدین نسب اور خاندانی عزّ و جاہ میں بڑا یقین رکھتا تھا

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

میں نے اُس سے ہین علی کا ذکر نہیں کیا تھا مگر مختلف موقعوں پر اسے جتا دیا تھا کہ اب وہی ان لڑکیوں کا مالک ہے۔ میں نے کہا تھا یہ لڑکیاں اودھ کے ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ انھیں خوش دیکھ کے میرا غبار کم ہو جاتا تھا، میں سمجھتا تھا کہ میں ہلکا ہو رہا ہوں اور میرے گناہ دُھل رہے ہیں۔ ان کی کھنکتی ہنسی میرے دل و دماغ کو فرحت بخشتی تھی اور میرے کانوں میں موسیقی سی بجنے لگتی تھی۔

گلبرگہ میں سید مجذوب کی تلاش بے سود تھی، میں نے اس کی تلاش میں کبھی کامیابی حاصل نہیں کی تھی، وہ مجھے خود ہی کہیں نظر آجاتا تھا۔ بمبئی میں، حیدر آباد میں، جہاں وہ چاہتا، میرے سامنے آدھمکتا اور چند پند گرہ بند کہہ کے غائب ہو جاتا۔ بدھ گیا سے واپسی کے بعد میرا ذہن اتنا مطمئن تھا کہ مجھے سیّد کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوئی، اب میں ایک بے خیال شخص تھا۔ کوئی آسودگی میرے دماغ میں نہیں تھی۔ ہاں زندگی کے ہنگامے دیکھ کے جی اکتا جاتا تھا۔ زندگی کو سامنے دیکھ کے کبھی کبھی پرانے زخم یاد آجاتے تھے۔

رات کے درمیانی حصّے میں کئی بار گھبرا کے میں خاموشی سے رکن الدین کے مکان سے نکل کر اُس طرف جاتا تھا جہاں حضرت گیسو درازؒ کا مزار تھا۔ وہاں کے قلندر اور فقرا مجھے بڑے بھلے لگتے تھے۔ میں نے کئی بار اندر جانے کا ارادہ کیا مگر قدم رک گئے اس لیے اندر نہیں جا سکا، پھر مجھے اختلاج سا ہونے لگا اور میں غیر شعوری طور پر گلبرگہ کی گلیوں کے کونے کھدروں میں کوئی مانوس چہرہ تلاش کرنے لگا۔ وہ سیّد کا چہرہ تھا مگر سیّد تو اپنی مرضی کا مالک تھا۔ وہ نہ ملتا تو میری حالت ناگفتہ بہ ہو جاتی، میں تیز تیز قدموں سے واپس رکن الدین کے مکان میں لوٹتا اور اپنے کمرے میں جا کے سکونِ قلب کے لیے مراقبے میں ڈوب جاتا۔

گلبرگہ میں دو تین ہفتے اسی کیفیت کی نذر ہو گئے۔ رکن الدین میرا مزاج آشنا تھا، وہ صرف خوش رکھنا اور خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ میری خاطر تواضع وہ عبادت کے طور پر کرتا تھا۔ جب مجھے زری اور رخشی کے اس گھر میں پوری طرح ضم ہونے کا یقین ہو گیا تو میں نے گلبرگہ سے نکلنے کا قصد کیا۔ زری اور رخشی جانے کی اجازت آسانی سے کیسے دیتیں؟ مگر دو چار دن مزید ان کی خاطر رہ کے اور جلد آنے کا دلاسا دے کے میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔ انکا بھی میرے ساتھ تھی۔

رکن الدین کے مکان سے کھلے آسمان کے نیچے آنے کے بعد میرا ذہن تذبذب کا شکار ہو گیا۔ میرے سامنے کئی راستے تھے، ایک طرف تزئین کا گھر تھا، جہاں سیّد غوث جیسے شریف اور غیرت مند نوجوان کو میں نے مڑ کر نہیں پوچھا تھا، دوسری طرف شبّن خاں کو جیل سے چھڑانے کا مسئلہ درپیش تھا، جو میری خاطر ایک بڑے نقصان سے دوچار ہوا تھا، تیسری طرف جانے کو طبیعت اس لیے چاہتی تھی کہ کلپنا نے تزئین کے معاملے میں دلی آکر پھر سے میرے دل میں ایک کسک ایک چبھن پیدا کر دی تھی، یوں ہی، صرف کلدیپ کی ایک جھلک دیکھنے میں کیا حرج ہے؟ کلدیپ کی طرف جانے کو میرا شعور قطعاً آمادہ نہیں تھا، اس نے تزئین کو رخصت کرتے وقت میرے ساتھ آنے سے انکار کر دیا تھا اور جب میں معذور و مفلوج حالت میں اس کے استھان پر پہنچا تھا تو وہ نیچے تک نہیں اتری تھی۔ ذہن خود ہی گمان تراشتا تھا، خود ہی منحرف ہو جاتا تھا، یہ آمادگی بھی کیا چیز ہے، یہ دل، یہ جذبہ بھی کیا شے ہے؟ کلدیپ گزشتہ دنوں مجھے بہت یاد آتی رہی تھی، اس کی مجبوریاں میرے علم میں تھیں، اس بار میں اس سے کچھ کہنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا، صرف ایک نظر دیکھ کے واپس آجاتا۔ ندامت کی وجہ سے میں نے انکا سے اپنے اس ارادے کا ذکر نہیں کیا۔ کلدیپ، وہ تنہا، اداس عورت، میرے سامنے ایک راستہ یہ بھی تھا کہ میں اپنے دوست ناگر کے پاس بدھ گیا چلا جاؤں اور سب کچھ بھلا دوں۔ بدھ گیا میں میں اپنے آخری دن سکون سے گزار لوں گا لیکن بدھ گیا کی طرف واپس جانے کا مطلب سب سے قطعِ تعلق تھا یعنی تزئین اور دوسرے تمام متعلقین سے کنارہ کشی، زری اور رخشی کے فرض سے غفلت، یہ خود غرضی تھی، میں نے اپنا تجزیہ کیا کہ میری زندگی کا بیشتر حصّہ خود غرضی میں گزرا ہے، میں بڑا کمینہ شخص ہوں صرف اپنے بارے میں سوچتا ہوں، خود میں نے زندگی کے حقوق ادا نہیں کیے۔ انکا بھی میرے تذبذب سے آگاہ ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے بمبئی جانے والی گاڑی میں بٹھا دیا۔ تزئین اور سیّد غوث، مالا اور آنندلال، پریم اور سہراب نے جب اچانک مجھے بمبئی میں اپنے ساتھ دیکھا تو وہ سب جوش کے ساتھ مجھ سے لپٹ گئے، ان سب کے چہرے آنسوؤں سے تر بتر ہو گئے۔ میں اپنے اس گھر سے دُور تھا، یہاں آکے مجھے احساس ہوا کہ تنہائی کے تمام احساسات خود ساختہ ہیں۔ یہ میری تزئین ہے، یہ غوث ہے، یہ مالا ہے جو میرے بازو سے چپکی ہوئی ہے، یہ آنندلال ہے جو میرے حکم کا منتظر ہے۔ یہ سہراب ہے جو صرف اشارے پر ایثار کے لیے تیار رہتا ہے اور یہ پریم ہے جو مینا کی طرح بول رہی ہے۔ یہ سب میرے چہرے ہیں۔ یہ سب میرا جسم ہیں، میں ان سب سے دُور رہا۔ آنندلال نے اسی وجہ سے گیان دھیان ترک کر دیا تھا کہ اسے ایسا دلکش ماحول مل گیا تھا۔ ان سب میں آپس میں اتنی محبت تھی کہ مجھے رشک آتا تھا، میرے آنے پر وہ سب پریم کے میکے میں منتقل ہو گئے اور پھر وہاں انھوں نے خوب دھما چوکڑی مچائی۔ خوب پکوان پکوائے۔ زری اور رخشی بہت یاد آئیں۔ کاش میں انھیں ساتھ لے آتا۔ انکا مختلف سروں پر پھدکتی رہتی تھی رحیق جن کی کمینگی کے اثرات تزئین پر ابھی تک قائم تھے، کبھی کبھی وہ گم ہو جایا کرتی تھی۔ ان مسرتوں میں کلدیپ کا چہرہ مجھے بار بار ستانے لگتا، آخر میں نے فیصلہ کر لیا۔ مجھے کسی کو بتائے بغیر کلدیپ کے استھان پر آخری بار ضرور جانا چاہیے۔

بمبئی سے نکلنا محال تھا، کوئی نکلنے ہی نہیں دیتا تھا۔ میرے اصرار پر انکا نے میری سفارش کی اور میں میسور میں کلدیپ کے استھان ہوتا ہوا دلی پہنچنے اور شبّن خان کو رہائی دلانے کے بعد ناگر اسے معذرت کرنے کے ارادے سے طویل سفر کے لیے روانہ ہو گیا۔ ابھی میں کلدیپ کے استھان پر جانے کے لیے گاڑی میں سوار ہوا ہی تھا اور ابھی گاڑی چند ہی اسٹیشن آگے آئی تھی کہ انکا نے مجھے ایک ایسی خبر سنائی جو میں سننا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔ ”جمیل! تمھارے راستے کا کانٹا کچھ دن کے لیے صاف ہو گیا ہے۔“

”کون؟“ میں نے بے خیالی میں پوچھا۔

”امرلال۔“ انکا نے جذباتی انداز میں کہا۔ ”امرلال وندھیاچل کی برف پوش پہاڑیوں پر بیٹھا کالی کا جاپ کر رہا ہے۔ بدری نرائن آج کل بے یار و مددگار ہے اور کلکتے میں ایک پنڈت کے گھر چھپا بیٹھا ہے تم اس سنہرے موقع سے فائدہ اُٹھا سکتے ہو۔“

”ختم کرو انکا!“ میں نے جھنجلا کر کہا۔ ”اب مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ کیوں پرانے زخم کریدتی ہو؟“

”میں تمھیں کبھی کوئی غلط مشورہ دے سکتی ہوں؟“ انکا نے ناراضی سے کہا۔

”تم مجھے پھر پریشان کر رہی ہو۔ مجھے خاموشی سے زندہ رہنے دو۔“

”کیا تم ڈر رہے ہو؟ میں کہہ رہی ہوں بدری نرائن تنہا ہے میری بات غور سے سنو۔ میں کیا کہہ رہی ہوں۔“

”تم بڑی حرافہ ہو۔“

”میں صرف تمھیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں، بدری نرائن کی زندگی میں تم کبھی خوش نہیں رہ سکتے۔“

”میں اب اس کا ذکر بھی سننا نہیں چاہتا۔“

”تم بوڑھے ہو گئے ہو۔“ وہ تلخی سے بولی اور پھر خوشامد کے انداز میں کہنے لگی۔ ”میری بات مان لو۔“

گاڑی میں راستے بھر وہ یہی کہتی رہی اور میں اسے سرزنش کرتا رہا، وہ میرے تمام زخموں سے آگاہ تھی۔ اس نے میری دُکھتی رگوں پر ہاتھ رکھ دیا اور ایسی باتیں یاد دلا دیں جنھیں برداشت کرنا میرے بس سے باہر تھا۔ ”کہاں ہے وہ؟“ میں نے غصّے میں پوچھا۔

”وہ کلکتے میں ہے۔“ انکا کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔

”ٹھیرو۔“ میں نے آنکھیں میچ لیں اور میرے اندر ان گنت دریچے کھل گئے۔

جب میں نے آنکھیں کھولیں تو سینے میں جلن ہو رہی تھی۔

”گاڑی اب کب رکے گی؟“ میں نے اضطراب سے پوچھا۔

”چھوٹے اسٹیشنوں پر یہ گاڑی نہیں رکتی اور بڑا اسٹیشن خاصی دیر بعد آئے گا، بہرحال ایسی جلدی بھی کیا ہے؟“

”تم نے ذکر ہی ایسا کر دیا، اب یہاں بیٹھا نہیں جاتا۔ کسی قریبی اسٹیشن پر گاڑی رک جانی چاہیے۔“ میں نے حکماً کہا۔

زنجیر کھینچنے میں خواہ مخواہ طوالت ہوتی۔ میں ڈبے میں تنہا بھی نہیں تھا، میں نے انکا کو حکم دیا کہ وہ انجن ڈرائیور کے سر پر چلی جائے۔ انکا کسی چون و چرا کے بغیر اتر گئی۔

تھوڑی دیر میں ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی کے فولادی پہیوں نے چیخنا شروع کر دیا اور ایک جھٹکے کے ساتھ گاڑی رک گئی۔ میں نے دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا، اسٹیشن کی عمارت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں خاموشی سے اتر گیا اور ایک لمحے بعد ہی گاڑی کے پہیے حرکت میں آگئے۔

دوسرے لمحے انکا میرے سر پر آگئی تھی۔ میں اسٹیشن پر اُتر گیا جہاں گاڑی ٹھیری تھی۔

جمیل احمد خاں اور انکا کی پُراسرار سرگزشت کے آخری باب کا مختصر حصّہ باقی رہ گیا ہے جو دو یا تین قسطوں پر مشتمل ہے،

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

بتول فاطمہ

★

خوش ذوق قارئین کے لیے

خاص کہانی کے صفحات جب آپ کے سامنے آیا کریں تو ازراہِ کرم اپنا ذہن آمادہ کر لیا کریں کہ آپ موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے کوئی منفرد، کوئی علیحدہ چیز پڑھ رہے ہیں۔

زیرِ نظر کہانی انگریزی کے مشہور ادیب ولیم برنیٹ نے لکھی ہے، دیکھیے انھوں نے ایک بے حد نازک معاملہ کس خوبی سے پیش کیا ہے۔

اگر ایسی کوئی صورت خود ہمارے ساتھ پیش آجائے تو ہم کیا کریں گے کہ ہم جنگلوں میں تو نہیں رہتے؟

پڑھ کر بتائیے کہ واقعی آپ کیا کر سکتے ہیں؟

اُس معزز اور نامور خاندان کی کہانی
جس سے ہمارا بھی تعلق ہے

اس ماہ کی خاص کہانی

بلند اور مضبوط چہار دیواری کا دروازہ مقفل تھا۔ احاطے میں چند بھاری بھرکم اور مضبوط محافظ بغلوں میں اسٹین گنیں دابے اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ ان کے کان ہر آہٹ پر محتاط ہو جاتے تھے۔
چہار دیواری کے وسط میں قدیم طرز کی ایک عمارت تھی جو سُرخ اینٹوں سے بنی ہوئی تھی۔ اس عمارت میں گیبرو خاندان کی ایک نہایت اہم گفت و شنید ہو رہی تھی۔ گیبرو خاندان کُل چار افراد پر مشتمل تھا۔ ایک ماں اور تین بیٹے۔
ایک لمبی میز کے وسط میں پیٹر گیبرو بیٹھا تھا۔ یہ ایک وجیہہ نوجوان تھا۔ اس کی عمر تیس بتیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ خاندان کے قانونی امور اسی کے سپرد تھے اور وہ کاروباری معاملات کے قانونی پہلوؤں پر گہری نظر رکھتا تھا۔ اس کے عین سامنے مائیکل بیٹھا تھا۔ یہ گٹھے ہوئے کسرتی جسم کا ایک جوان تھا اور اپنی ذمے داریاں پوری کرنے کے لیے اُس وقت آگے بڑھتا تھا جب تمام قانونی طریقے جواب دے جاتے تھے۔ میز کے سرے پر ایک نہایت دُبلی پتلی سفیدی مائل بالوں والی عورت کیتھرائن بیٹھی تھی کیتھرائن گیبرو۔ دو ہٹے کٹے نوجوانوں کی موجودگی میں وہ کچھ اور مختصر دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ان دونوں کی ماں تھی۔ اپنے شوہر آرتھر کے انتقال کے بعد خاندان کے انتظامات کی باگ ڈور اس نے اپنے نحیف و نزار ہاتھوں میں لے لی تھی اور بڑی نفاست و مہارت سے اپنے فرائض انجام دے رہی تھی۔ اس نے آج تک کسی اجنبی شخص کو خاندان کے امور میں بے جا مداخلت کی اجازت نہیں دی تھی۔

گزشتہ بیس سال سے اس دولت مند خاندان نے شہر بھر پر دھاک بٹھا رکھی تھی۔ یہ لوگ اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لیے دولت، تشدد، آتش گیر مادہ اور قتل و غارت بھی بروئے کار لانے سے نہیں چوکتے تھے۔ سارے شہر کی دولت اِن کی تجوریوں کی جانب بہتی ہوئی چلی آتی تھی۔ شہر کے حالات میں کسی بھی تبدیلی کی ضرورت پیش آتی تو اسے گیبرو خاندان کی منظوری کے لیے ضرور پیش کیا جاتا تھا۔
میونسپلٹی کے ملازمین کی ہڑتال ہو یا کسی سیاسی جلسے کا انعقاد ہر معاملے میں گیبرو خاندان کی رضامندی لازمی سمجھی جاتی تھی۔
کیتھرائن بے حد دُبلی پتلی اور کمزور عورت تھی۔ دیکھنے والا یقین نہیں کر سکتا تھا کہ گیبرو خاندان کا سارا انتظام یہ چوہیا چلاتی ہے لیکن اس کی آنکھیں دیکھ کر اس کی صلاحیتوں پر ایمان لانا پڑتا تھا۔ سرد اور نیلی آنکھیں جن میں ایک عجیب چمک تھی۔ ایک ویرانی تھی۔ جیسے وہ کھدی ہوئی خالی قبریں ہوں۔
"سپریم کورٹ نے فیصلہ کیا ہے کہ آیندہ کسی شخص کو سزائے موت نہیں دی جائے گی۔" کیتھرائن کی آواز نے کمرے کا سکوت توڑا۔ "اس کے باوجود چند دنوں بعد تمھارے بھائی نِک کو پھانسی دی جانے والی ہے، پیٹر! کیا میں نے تمھیں اسی دن کے لیے قانون کی تعلیم دلوائی تھی؟"
"ممی!" پیٹر نے سلجھے ہوئے انداز میں کہا۔ "سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ چھ سال قبل کیا تھا لیکن سینیٹ نے اس کی منظوری حال ہی میں دی ہے۔ سزائے موت کے قوانین کالعدم قرار دینے کے موضوع پر زبردست بحث ہوئی تھی۔ پھر اس کی حمایت میں صرف چھ فی صد ووٹ آئے تھے۔ باقی چار فی صد ووٹ مخالفت میں گئے تھے۔"
"ہاں مگر وہ سزا بہرحال کالعدم قرار دے دی گئی ہے کیا اس کے باوجود میرے بیٹے کو مرنا ہو گا؟"
"ممی! دو منصفوں نے سزائے موت منسوخ کرنے کے حق میں ووٹ دیا تھا مگر ان کی رائے بھی سزائے موت کے یکسر خلاف نہیں تھی بلکہ انھوں نے صرف یہ جواز پیش کیا تھا کہ یہ قانون صحیح طریقے پر لاگو نہیں ہوا ہے۔ دولت مند اس کی گرفت سے بچ نکلتے ہیں۔ غریب بے چارا مارا جاتا ہے۔ بہت سے وکیلوں نے یہ جواز بھی دیا تھا کہ جو سزا بالکل صحیح دی جا رہی ہو اس کا برقرار رہنا ضروری ہے۔ ان کا اشارہ سزائے موت ہی کی طرف تھا۔"
"گویا تمھارا مطلب یہ ہے کہ جب تک کو سزائے موت دینے کا فیصلہ ہو گیا تو حکومت نے قانون تبدیل کر دیا تاکہ محض گیبرو خاندان کا ایک رکن موت کے گھاٹ اُتارا جا سکے؟"
"ممی! خدا کے لیے۔" پیٹر یہ کہتے کہتے رُک گیا کہ ممی آپ غلطی پر ہیں۔ اسے فوراً اپنی حماقت کا احساس ہو گیا اور اس نے جملہ تبدیل کر دیا۔ "یہ قانون اُس وقت منظور ہوا تھا جب پیٹر سے وہ بیوقوفی..... میرا مطلب ہے کہ وہ حرکت سرزد نہیں ہوئی تھی۔ اس قانون کی رو سے ہر وہ شخص سزائے موت کا مستحق ہے جس نے کسی پولیس والے کو قتل کیا ہو اور بدقسمتی سے نِک سے یہی جرم سرزد ہوا ہے، اس لیے جج کے پاس اسے موت کی سزا دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ نیز جب نِک کا کیس سامنے آیا تھا، اُس وقت نئے قوانین نافذ نہیں ہوئے تھے۔"
"لیکن صرف اُسی کو کیوں نشانہ بنایا جا رہا ہے؟ کیا محض اس لیے کہ اس کا نام نِک گیبرو ہے؟" کیتھرائن نے میز پر ہاتھ مارا۔
"ممی! یہ وقت وقت کی بات ہے اور کچھ بھی نہیں۔ 1970ء

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

میں جو سیاسی حادثات رونما ہوئے تھے، ان کے بعد سے مسلسل قانون کے سخت اطلاق کا زبردست مطالبہ ہو رہا ہے۔ اس صورتِ حال کے نتیجے میں سپریم کورٹ کے دو ججوں نے استعفے دے دیے تھے۔ وہ ان تین وکیلوں میں سے تھے جنھوں نے اصولوں کی بنیاد پر سزائے موت کے خلاف ووٹ دیا تھا مگر ان دونوں کی جگہ جو لوگ آئے ہیں، وہ قانون کو زیادہ سختی سے استعمال کرنے کے حق میں ہیں۔"

"نک تھا بھی نِرا احمق!" مائیکل نے کنکھیوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مقتول سپاہی نے اس کا بازو صرف یہ سمجھ کر جھنجوڑا تھا کہ نک نے نشے میں دُھت ہو کر اسٹیرنگ پہ سر ٹکا رکھا ہے۔ میرے بیوقوف بھائی نے سپاہی کی کوئی بات نہیں سُنی اور ایک دم خوف زدہ ہو گیا۔ اس کی گھگھی بندھ گئی اور اس نے اچانک چاقو نکال کے سپاہی پر کم از کم بارہ وار کر ڈالے ممّی! اگر اس پر شراب پی کر کار چلانے کا الزام عائد ہو بھی جاتا تو کیا تھا؟ وہ زیادہ سے زیادہ دو سو ڈالر دے کر اپنی جان چھڑا سکتا تھا۔"

"اور یہ بات بھی نہ بھولیے ممّی!" پیٹر نے کہا۔ "کہ مقتول سپاہی کی ایک نوجوان بیوی تھی اور چار چھوٹے چھوٹے معصوم بچّے تھے۔ اس واردات کی خبریں شہ سرخیوں کے ساتھ ملک بھر کے اخبارات میں شائع ہوئی تھیں، لہٰذا خالص سیاسی نقطۂ نگاہ سے بھی نک کو سزائے موت دینا بے حد ضروری تھا کیونکہ قانون یہی کہتا ہے۔ اگر سرکاری وکیل سزائے موت کے سوا کسی اور سزا کی سفارش کرتا تو لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے سولی پر چڑھا دیتے۔ اس فیصلے کے خلاف اپیل بھی کی گئی تھی لیکن ججوں کی فہرست میں نئے نام شامل ہو گئے تھے اس لیے سزا میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔"

"مائیکل! تم کبھی کبھی بڑی صحیح بات کہہ جاتے ہو۔" کیتھرائن نے کہا۔ "نک واقعی احمق تھا اگر اُسے کسی اور وجہ سے نہیں تو حماقت کی وجہ سے ضرور موت کی سزا ملنی چاہیے۔ اگر اسے پھانسی نہ دی جائے اور وہ کسی طرح فوری طور پہ ہلاک ہو جائے تو معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

دونوں بیٹے حیران ہو کر سوالیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھنے لگے۔ "میں.... ممّی! میں سمجھا نہیں؟" پیٹر نے کہا۔ "اگر آپ اُس کی موت پر راضی ہیں تو پھر ہماری یہ ملاقات...."

"تم دونوں میرے بیٹے ہو۔" کیتھرائن نے ایک آہ کے ساتھ کہا۔ "تم لوگ دلیر اور طاقت ور ہو۔ اگر نک کی جگہ تم میں سے کوئی ہوتا تو وہ سپاہی کو قتل کرنے کی غلطی ہرگز نہ کرتا۔ نک کے برعکس تم دونوں ایسے ہو کہ میں کسی مشکل وقت میں تمھارا سہارا لے سکتی ہوں۔"

ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کیتھرائن اندر سے ٹوٹ گئی ہے، وہ اپنی بڑی کرسی پر کچھ اور چھوٹی دکھائی دینے لگی تھی۔ "اگر تم لوگ پیپل کے درخت ہو۔" اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "تو نک صرف ایک نازک اور کمزور پودا ہے۔ جب بچپن میں تم لوگ ایک دوسرے سے لڑا کرتے تھے تو نک روتا ہوا میرے پاس آکر کسی بیمار پلّے کی طرح چیختا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے بے حد شرمندگی ہوتی تھی۔ وہ جہاں بھی جاتا تھا خوف اس کے سر پر مسلّط رہتا تھا۔ تمھارے ابّا نے اور میں نے اسے بزدلی کی اس دلدل سے نکالنے کے لیے بہت کوششیں کی تھیں، وہ اپنا کوئی کام خود نہیں کر پاتا تھا حالانکہ اس کے نام کے ساتھ گیبرڈو لگا ہوا تھا۔ سپاہی کا قتل بہر حال ایک سنگین جُرم ہے اور ایک ایسی حماقت ہے جسے معاف نہیں کیا جا سکتا.... نک اب میرا بیٹا نہیں ہے۔"

"تو پھر اسے بے نیازی سے جلّاد کے رحم و کرم پر کیوں نہ چھوڑ دیا جائے؟" مائیکل نے بے صبری سے پوچھا۔

"کیا اُس کی پھانسی کے وقت اخباری نمائندے بھی موجود ہوں گے؟" کیتھرائن نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں میرا خیال ہے چند ایک نمائندے ضرور موجود ہوں گے اور وہ تمام خبر رساں ایجنسیوں کو پھانسی کی روداد بھیجیں گے۔ ایک طویل مدّت بعد کسی مجرم کو سزائے موت دی جا رہی ہے۔ یہ سنسنی خیز خبر اخبارات میں نمایاں جگہ پائے گی۔"

"یہی تو مسئلہ ہے۔" کیتھرائن نے تشویش سے کہا۔ "نک پھانسی کے پھندے تک کسی مرد کی طرح نہیں جائے گا۔ وہ بُری طرح منّتیں کرتا اور گڑگڑاتا ہوا جائے گا۔ چاہے اسے اعصاب پر قابو پانے کی کتنی ہی گولیاں کھلا دی جائیں، وہ بار بار رحم کی بھیک مانگے گا اور اخبارات میں اس واقعے کی روداد اس طرح شائع ہو گی کہ گیبرڈو خاندان کا ایک فرد کسی دہشت زدہ چوہے کی طرح پھانسی کے تختے پر پہنچا۔ کیا تمھیں اندازہ ہے کہ اس بات کا ہمارے خاندانی وقار پہ کتنا بُرا اثر پڑے گا؟ ہماری ساری عزّت خاک میں مل جائے گی۔ ہم آبرو باختہ ہو جائیں گے۔ حاسدین اور دشمن ہماری بزدلی پر کتنا ہنسیں گے؟"

کیتھرائن کے چہرے پر تفکرات کی جھریاں نمایاں تھیں، وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکی اور بلند آواز میں تقریباً چیختی ہوئی بولی۔ "میرا بیٹا رحم کی بھیک مانگتے اور گڑگڑاتے ہوئے نہیں مر سکتا! میرے مرحوم شوہر کی عزّت اور نیک نامی کی خاطر ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ اُسے ایک مرد کی طرح مرنا ہو گا۔" پھر وہ اچانک سنبھل کر سیدھی ہو گئی اور فوراً اپنے تاثرات تبدیل کر کے بولی۔ "معاف کرنا۔" اس نے بلا کے اطمینان سے کہا۔ "ہمیں جذباتیت کا شکار نہیں ہونا چاہیے بلکہ کوئی ایسا طریقہ سوچنا چاہیے کہ یہ مسئلہ خوش اسلوبی سے حل ہو جائے۔ تم لوگوں کے پاس کیا تجاویز ہیں؟"

چند لمحوں کے لیے سکوت طاری ہو گیا۔ تینوں گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے، آخر پیٹر نے زبان کھولی۔ "اس سلسلے میں اثر و رسوخ استعمال کرنا بے سود ہو گا۔ تعلقات سے بھی کام نہیں نکالا جا سکتا کیونکہ ہمارے متعلقین میں سے کوئی بھی جیل کے قریب پھٹکنا پسند نہیں کرے گا اور اگر کوئی پہنچ بھی گیا تو اس کی سمجھ میں یہ نہیں آئے گا کہ اب وہ کیا کرے؟"

"بہتر یہی ہے کہ یہ ذمّے داری کسی معتبر شخص کو سونپی جائے۔" کیتھرائن نے کہا۔ "کسی ایسے شخص کو جو یہ معاملہ ایک نئے اور مختلف زاویے سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو تاکہ یہ کام خوش اسلوبی سے تکمیل پا جائے۔"

پیٹر نے پہلے اپنی ممّی کی طرف دیکھا۔ پھر مائیکل کی طرف دیکھا اور سرگوشی میں ایک نام لیا۔ "تسینڈی۔"

"وہ باؤلا؟" مائیکل نے ناگواری سے کہا۔

"ہاں، اپنے زمانے میں اُس نے بعض ایسے کام کیے ہیں جو کوئی ذہین آدمی ہی کر سکتا ہے۔"

"مگر اب تو وہ اتنا بوڑھا ہو چکا ہے کہ میرا خیال ہے کوئی بھی سنسنی خیز خبر اس کے دل کی دھڑکن بند کر سکتی ہے اور پھر مجھے اس شخص پہ اعتبار بھی نہیں ہے۔" مائیکل نے کہا۔

"تمھیں اس پہ اعتبار ہو یا نہ ہو، حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگوں کو بہت جلد اعتماد میں لے لیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا اور کامیاب بہروپیا کہلاتا تھا۔ مجھے نہ جانے کیوں یقین ہے کہ اگر کوئی شخص نک کی مشکل حل کر سکتا ہے تو وہ تسینڈی ہی ہے۔"

"ایک قباحت اور ہے۔" مائیکل نے کہا۔ "وہ ہمارا پانچ ہزار ڈالر کا مقروض بھی ہے۔ اور میں آج کل اُس پر قرض کی واپسی کے لیے بہت دباؤ ڈال رہا ہوں۔ میرے اور اس کے تعلقات کشیدہ ہیں، اس لیے شاید وہ ہماری مدد کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔"

"تم فکر نہ کرو مائیکل! اُسے تیار کرنا میرا کام ہے۔ تم بس اُس سے قرض کی واپسی کا مطالبہ کرنا چھوڑ دو۔" کیتھرائن نے کہا۔ "اگر ہماری مشکل کا واحد حل تسینڈی ہے تو آج سے تم اور تسینڈی اچھے دوست ہو، کیا سمجھے؟"

شہر کے ایک گنجان اور قدرے گندے علاقے کے ایک فلیٹ میں ایک دُبلا پتلا عمر رسیدہ شخص کھڑکی کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنے گھر کے باہر ایک لمبی سی شاندار سیاہ کار رُکتے دیکھی، کار سے پہلے پیٹر اور مائیکل نکلے، پھر کیتھرائن نکلی اور ان دونوں کے درمیان چلنے لگی۔ اطلاعی گھنٹی بجی، بوڑھے نے جا کے دروازہ کھولا اور رسمی اور سرسری انداز میں ان کا استقبال کر کے انھیں کمرے میں لے آیا۔ ابھی وہ تینوں ناک بھوں سکیڑتے ہوئے اس کے بے ترتیب ڈرائنگ روم کا جائزہ ہی لے رہے تھے کہ بوڑھا بڑے اطمینان سے کمرے کی سب سے آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا اور ان کے چہرے تکنے لگا۔ وہ تینوں کسی پیش کش اور دعوت کے منتظر تھے۔

مائیکل گیبرڈو نے بوڑھے کو گریبان سے پکڑ کے کھڑا کر دیا۔ "اُٹھو تسینڈی! جب میری ماں کھڑی ہے تو تم نے بیٹھنے کی ہمت کیسے کی؟"

"او ہو معاف کیجیے گا، مسز گیبرڈو!" بوڑھے تسینڈی نے اپنے کھچڑی بال درست کرتے ہوئے کیتھرائن کو مخاطب کیا۔ "میں کچھ بے پروا ہو گیا ہوں مگر آپ کا بیٹا اکثر مجھے اس امر کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ جب آخری بار اس نے مجھے یاد دلایا تھا تو میں تقریباً ایک ہفتے تک بستر سے اُٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔"

"براہِ کرم آپ تشریف رکھیے مسٹر تسینڈی!" کیتھرائن گیبرڈو نے آہستگی سے کہا۔ "ہم یہاں اپنی رقم کا مطالبہ کرنے نہیں آئے ہیں بلکہ یوں سمجھ لیجیے کہ آپ کو ایک ایسا طریقہ بتلانے آئے ہیں جس سے آپ کا سارا قرض معاف ہو سکتا ہے۔"

"اچھا۔" تسینڈی مسکرایا۔ "یقیناً، آپ یہ چاہتی ہوں گی کہ میں آپ کا کوئی کام کر دوں؟"

"تمھیں کیسے پتہ چلا؟" مائیکل بڑبڑایا۔

"اے معزز خاتون!" تسینڈی، مائیکل کو نظر انداز کر کے کیتھرائن سے مخاطب ہوا جیسے یہ سوال مائیکل نے نہیں بلکہ کیتھرائن نے کیا ہو۔ "مجھے گیبرڈو خاندان کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے اس ٹھگ بیٹے نے مجھے اب تک بخشا ہوا ہے ورنہ یہ کبھی کا پہلے میرا کام تمام کر چکا ہوتا۔"

مائیکل زیرِ لب کچھ بڑبڑایا۔ وہ آگے بڑھ کر تسینڈی کو مزا چکھانا چاہتا تھا لیکن کیتھرائن نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے پیچھے ہٹا دیا۔ تسینڈی نے کیتھرائن سے کہا۔ "آپ مجھ سے اس لیے ملنے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

ہیں کہ میں کوئی ایسا طریقہ نکالوں جس سے آپ کا بیٹا مرتے وقت آپ کے خاندان کی عزت اور وقار خاک میں نہ ملا سکے یہی بات ہے نا؟"

کیتھرائن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا: "اور یہ کام تم ہی کر سکتے ہو؟"

"ہاں شاید۔ کیا اس سلسلے میں آپ لوگوں کے ذہن میں کوئی منصوبہ موجود ہے؟ یا مجھے اپنی مرضی سے کام کرنے کی اجازت ہے؟"

کیتھرائن نے چند لمحوں تک غور کرنے کے بعد جواب دیا: "اگر وہ کسی طرح پھانسی دیے جانے سے پہلے ہی ہلاک کر....."

"اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مادام! جیلر اور اس کا عملہ بیوقوف نہیں ہے نک کی کڑی نگرانی کی جا رہی ہے اس کا کھانا خصوصی طور پر تیار کیا جاتا ہے اور جو لوگ اُس سے ملنے جاتے ہیں ان کی زبردست تلاشی لی جاتی ہے اس کا تو آپ کو بھی اندازہ ہوگا۔ اِن حالات میں اسے قتل کرنا تقریباً ناممکن ہے ایسا کرنے والے کو خود اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے اور..... مجھے افسوس ہے کہ میں..... میں اس انتہا تک نہیں جا سکوں گا۔"

"کیا اُسے کسی طریقے سے فرار کروایا جا سکتا ہے؟" پیٹر نے پوچھا۔

"مشکل ہے لیکن اسے ہلاک کرنے کی طرح ناممکن نہیں ہے" تسینڈی نے کہا: "کیا آپ نے ایسے کسی منصوبے کے بارے میں سوچا ہے؟"

"نہیں مگر ہم اسی لیے آپ کے پاس آئے ہیں" کیتھرائن بولی "مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ناممکنات کو ممکن بنانے کے ماہر ہیں۔"

"آپ کا اعتماد بے جا نہیں ہے مادام! بہت ممکن ہے کہ میں آپ کو اور آپ کے خاندان کو اس متوقع بے عزتی سے بچا سکوں۔"

"ٹھیک ہے تو پھر....."

"ایک منٹ ٹھہریے مسز گیبرڈ! میں نے صرف یہ کہا ہے کہ بہت ممکن ہے میں یہ کام کر سکوں۔ اب سوال یہ ہے کہ میں یہ کام کروں گا یا نہیں؟ یہ میری مرضی پر منحصر ہے بہرحال یہ حقیقت آپ پر واضح ہونی چاہیے کہ آپ کا بیٹا مائیکل میرے ساتھ کبھی عزت سے پیش نہیں آیا۔ حالانکہ میں آپ کے خاندان کے لیے کس قدر اہمیت کا حامل ہو سکتا ہوں؟ اس نے بسا اوقات مجھے گالیوں سے نوازا ہے اور مارا تک ہے۔ میں آپ کا مقروض....."

"آپ کا قرض معاف کیا جاتا ہے مسٹر تسینڈی!" کیتھرائن نے جلدی سے کہا: "اب آپ اس سلسلے میں دوبارہ مائیکل کی شکل نہیں دیکھیں گے۔"

"یہ ہوئی نا بات" تسینڈی نے خوشی سے تالی بجائی۔

کیتھرائن نے کہا: "میرا خیال ہے جیل سے فرار کا منصوبہ بنانے میں خاصا پیسہ خرچ ہوتا ہے مگر آپ فکر نہ کیجیے۔ ہم تمام اخراجات کا ذمہ لیتے ہیں اور یقیناً کچھ فاضل رقم آپ کو بھی پیش کی جائے گی۔"

"بہت بہتر" تسینڈی نے کہا: "اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ فرار کا منصوبہ کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر آپ نک کا کیا کریں گی؟ اُسے کہاں چھپائیں گی؟ ریاست کی پولیس کا ایک ایک سپاہی اس کی تلاش میں لگا ہوگا؟"

"جہاں تک میرا سوال ہے مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے میں اس کی شکل تک دیکھنا نہیں چاہتی تم چاہے اسے کسی دریا میں دھکیل دو، میں اُف نہ کروں گی، وہ پانی سے بہت ڈرتا ہے تیرنا نہیں جانتا۔ مجھے تو صرف یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ جب اُسے پھانسی کے پھندے کی طرف لے جانے کی نوبت آئے گی تو وہ کسی بزدل اور کمزور شخص کی طرح روئے گا۔ گڑگڑائے گا اور اس طرح گیبرڈ خاندان کی بدنامی کا باعث بنے گا۔ ایسی اطلاعات جب اخباروں میں شائع ہوں گی تو گیبرڈ خاندان کا وقار خاک میں مل کے رہ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ بات پکی سمجھیے لیکن یہ فرمائیے کہ مجھے اس کام کے عوض کیا.....؟" تسینڈی نے مسکراتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

کیتھرائن نے اپنے پرس سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر تسینڈی کی طرف اُچھال دیں: "یہ دس ہزار ڈالر ہیں۔ اگر اور ضرورت پڑے تو بتا دیجیے گا۔ مجھے صرف نتیجہ چاہیے۔"

"میں صرف ایک چیز اور چاہتا ہوں مادام!"

"وہ کیا؟" کیتھرائن کو غصہ آ گیا مگر اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا: "آپ کا قرض معاف کیا جا چکا ہے آپ کو پیسے دے دیے گئے ہیں اب آپ اور کیا چاہتے ہیں؟"

تسینڈی نے شعلہ بار نظروں سے مائیکل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس سے پہلے کہ میں آپ کے خاندان کے وقار کی خاطر یہ کام کروں چاہتا ہوں کہ آپ کا بیٹا مجھ سے براہِ مہربانی کہہ کے یہ کام کرنے کی درخواست کرے۔"

مائیکل کے منہ سے جھاگ نکلنے لگے۔ "مائیکل! جیسا یہ کہے کرو" کیتھرائن نے بیٹے کو حکم دیا۔

مائیکل نے پہلے اپنی ماں کو پھر تسینڈی کو دیکھا اور آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ کیتھرائن کی مٹھیاں بھنچ گئیں، وہ چلائی: "میں نے تم سے کچھ کہا ہے مائیکل؟"

مائیکل نے کچھ کہنے کے لیے دوبارہ منہ کھولا مگر آواز نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ بہرحال اس کی تیسری کوشش کامیاب رہی "براہِ مہربانی!" مائیکل نے اتنا کہا اور پلٹ کے تیزی سے باہر نکل گیا۔

"میں اس قسم کی عاجزانہ درخواست رد نہیں کر سکتا" تسینڈی نے خوش ہو کے زور سے کہا: "آپ جو چاہتی ہیں، وہی ہوگا مسز گیبرڈ!"

نک کی پھانسی سے چار روز قبل ایک چھوٹے سے قد کا دُبلا پتلا پادری سپاہیوں سے درخواست کر رہا تھا کہ اسے جیلر سے ملوا دیا جائے۔

"میں پادری ونچل ہوں" بوڑھے پادری نے جیلر سے کہا: "میں گیبرڈ خاندان کا دوست ہوں، مسز گیبرڈ کو جب یہ اطلاع ملی کہ میں اس طرف سے گزروں گا تو انھوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اُن کے بیٹے سے بھی ملتا جاؤں تاکہ آخری ایام میں اسے کچھ رُوحانی تسکین پہنچا سکوں۔"

"لیکن جناب! یہ امر اتنا آسان نہیں ہے" جیلر نے کہا: "وہ آج کل خصوصی محافظوں کی نگرانی میں رہتا ہے اور اس سے ملنے والے ہر شخص کی جامہ تلاشی لی جاتی ہے۔"

"کیوں نہیں ضرور۔ دیکھیے میرے پاس مسز گیبرڈ کا یہ خط بھی ہے جس میں انھوں نے مجھے اپنے بیٹے سے ملنے کی اجازت دی ہے اور یہ شناختی خط میرے بشپ کا ہے۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو آپ شوق سے ان چیزوں پر ایک نظر ڈال سکتے ہیں اگر اس کے بعد بھی آپ کو کوئی اعتراض ہو تو ٹھیک ہے میں یوں ہی چلا جاتا ہوں۔"

جیلر نے سوچا کہ اس ملاقات سے نقصان ہی کیا ہے؟ مانا کہ یہ کام قاعدے کے خلاف ہوگا لیکن کم از کم یہ پادری اُس بزدل کی کچھ ڈھارس تو بندھائے گا۔ اُس ذلیل نے تو چیخ چیخ کے آسمان سر پہ اُٹھا لیا ہے..... اگر میں اپنے طور پر بعض چھوٹے چھوٹے فیصلے کرنے کا مجاز بھی نہیں ہوں تو مجھے خواہ مخواہ جیلر کس لیے بنایا گیا ہے؟ "ایک منٹ رُکیے جناب!" اس نے پادری سے کہا: "یہ خط بشپ کوحرین کا ہوگا؟"

"جی ہاں کیا آپ انھیں جانتے ہیں؟"

"ہاں، ہم دونوں ایک ساتھ اسکول جایا کرتے تھے، ذرا مجھے خط تو دکھائیے۔"

"اس میں محض میری شناخت کی گئی ہے" بوڑھے پادری نے وہ خط بے خوف و خطر جیلر کے حوالے کر دیا۔ لیٹر ہیڈ چوری کا تھا اور دستخط ایک بہترین نقال کے تھے جس نے اس کام کا خاصا بڑا معاوضہ وصول کیا تھا۔

"بشپ کوحرین کیسے ہیں؟ ان کا کیا حال ہے مجھے اُن سے ملے ہوئے بہت دن ہو گئے۔"

"ٹھیک ہیں مگر آج کل ان کے ٹخنے میں تکلیف ہے اس لیے

اسپتال میں زیرِ علاج ہیں" بوڑھے نے سوچا کہ اس طرح جیلر کم از کم فوراً چرچ میں ٹیلی فون تو نہیں کرے گا۔

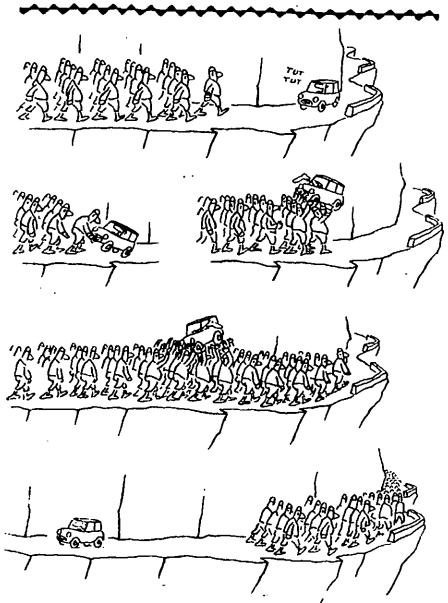

پندرہ منٹ کی رسمی بات چیت کے بعد تسینڈی کو ایک کوٹھری میں پہنچا دیا گیا جہاں نک بیٹھا ہوا تھا اور انگلیوں کی مدد سے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا اس کا کنگھا تک اس سے لے لیا گیا تھا جو جیلر کے کمرے میں محفوظ تھا: "میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ میرے گردے بھی نکال کر محفوظ کر لیں گے" نک نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تسینڈی نے کنکھیوں سے باہر کی طرف دیکھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ پہرے دار دروازہ بند کر کے خاصی دُور جا کے کھڑا ہو گیا ہے تو اس نے آہستہ سے کہا: "غور سے دیکھو میں تسینڈی ہوں میں تمھارے لیے دعا مانگنے نہیں آیا ہوں بلکہ تمھیں یہاں سے باہر نکالنے کے لیے آیا ہوں" نک نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر تسینڈی نے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا: "تم باہر کی طرف بھی نظر رکھنا۔ جیسے ہی پہرے دار اس طرف آئے یہ ظاہر کرنا جیسے میں تمھارے خاندان کے متعلق باتیں کر رہا ہوں" نک نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تسینڈی نے طنزیہ لہجے میں کہا: "فی الوقت تمھارے خاندان والوں کے نزدیک تمھاری کوئی وقعت تو نہیں ہے لیکن بہرحال وہ تمھیں مرنے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

نہیں دیں گے۔"

"اگر تم نے فرار کا کوئی منصوبہ بنایا ہے تو خدا کے لیے مجھے جلدی یہاں سے لے چلو، میں یہاں ایک منٹ بھی رُکنا نہیں چاہتا۔"

"تو گویا تم گردن اکڑا کے باقاعدہ مین گیٹ سے باہر نکلنا چاہتے ہو؟ صبر سے کام لو، ابھی تو مکمل منصوبہ بتانا ہے۔ تمھیں ٹھیک اُس دن فرار ہونا ہے جس دن تمھیں پھانسی دی جانے والی ہے۔"

"منصوبہ کیا ہے؟ جلدی بتاؤ۔"

"غور سے سنو کیونکہ میں کوئی بات دُہراؤں گا نہیں۔ جمعے کی رات کو تقریباً گیارہ بجے جیلر، پادری اور چند پہرے دار تمھارے پاس آئیں گے۔ پادری تم سے تمھاری آخری درخواست، خواہش یا فرمائش کے بارے میں پوچھے گا۔ پھر وہ تمھارے حق میں دُعائے مغفرت کرے گا۔ اس اثنا میں پہرے دار تمھاری مشکیں کس دیں گے تاکہ جب تمھیں پھانسی دی جائے تو تم ہڑبڑا کے پھندا نہ پکڑ لو۔ جب یہاں کا کام پورا ہو جائے گا تو تمھیں ایک کار میں بٹھا کر اس عمارت کے دوسری طرف لے جایا جائے گا جہاں پھانسی دی جاتی ہے۔"

نِک گیٹرڈ کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ تسینڈی نے بے پروائی سے اپنی بات جاری رکھی۔ "وہاں تمھیں سُولی کے پاس لے جایا جائے گا۔ سولی ایک آٹھ فٹ اونچے تختے پر بنی ہوگی۔ تختے کے دونوں طرف سیاہ چادریں ہوں گی۔ دائیں جانب چند کرسیاں رکھی ہوں گی۔ وہاں سرکاری گواہ، جیل کا ڈاکٹر، اور اگر اجازت ملی تو چند اخباری نمائندے بیٹھیں گے۔ عمارت اور تختے کے اردگرد تقریباً دس مسلح پہرے دار موجود ہوں گے۔ تمھارے گلے میں پھندا ڈالنے اور تمھارے پیروں تلے کا تختہ کھسکانے والے ہینڈل کے پاس جلّاد تیار کھڑا ہوگا۔"

"ختم کرو یہ بھیانک کہانی۔" نِک نے سرگوشی کی۔ "فرار کا منصوبہ بتاؤ۔ میں اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں کس طرح فرار ہو سکوں گا؟"

"وہ بھی بتاتا ہوں۔ جیلر جج کا فیصلہ پڑھ کر سُنائے گا۔ پھر تمھیں پھندے کے نیچے کھڑا کر دیا جائے گا۔ جلّاد تمھارے سر پر ایک بڑی سیاہ نقاب چڑھائے گا۔ اس موقع پر جذبات قابو میں رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے کیونکہ اُس وقت عام طور پر دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ جب یہ غلاف چڑھا دیا جائے گا تو جلّاد تمھارے گلے میں پھندا ڈال کر اسے تنگ کرے گا اور جیلر کے اشارے کا انتظار کرے گا۔ جیسے ہی اسے اشارہ ملے گا، وہ ایک ہینڈل کھینچے گا اور پیروں تلے بنی ہوئی کھڑکی جھٹ سے کھل جائے گی۔"

"اور میں مر جاؤں گا۔" نِک کو اپنی آواز حلق میں اٹکتی محسوس ہو رہی تھی۔ "بہت خوب! اس سے اچھا منصوبہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ نکل جاؤ یہاں سے! میں تمھاری باتیں برداشت نہیں کر سکتا۔"

"مجھے تمھاری حالت پر افسوس ہے۔" تسینڈی نے کہا۔ "لیکن یہ حقیقت ہے کہ تمھیں ان تمام باتوں کے لیے خود کو تیار کرنا ہوگا۔ تمھیں اپنے اعصاب پر قابو رکھنا ہوگا۔ سب یہی کرتے ہیں..... فرق صرف اتنا ہوگا کہ تم مرو گے نہیں!"

"نہیں مروں گا؟" نِک پاگلوں کی طرح تسینڈی کا منہ تک رہا تھا۔ "وہ کیسے؟"

"صرف اٹھارہ انچ رسّی کا ٹکڑا۔"

"خدا کے لیے تسینڈی! پہیلیاں مت بجھواؤ!"

"دراصل پھانسی بڑے سائنسی طریقے سے دی جاتی ہے۔ رسّے کی لمبائی کا تعین بھی خاصی جانچ پڑتال اور ناپ تول کے بعد کیا جاتا ہے۔ اس میں مجرم کے قد، قامت، وزن اور جسمانی ساخت کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ تم ایک بلند قامت شخص ہو لیکن بہت ہلکے پھلکے اور دبلے ہو۔ دوسری طرف تمھارے پٹھے بہت مضبوط ہیں، خاص طور پر گردن اور سینے کے پٹھے۔ اگر تمھیں بالکل صحیح طریقے سے پھانسی دی جائے تو میرے حساب سے پھانسی کے بعد تمھارے پیر اصل فرش سے چھ انچ اونچے رہ جائیں گے۔"

"لیکن یہ چھ انچ میرے لیے میلوں کے برابر ہیں۔"

"ہاں مجھے احساس ہے کہ یہ چھ انچ بہت اہم ہیں۔ مگر یہ بتاؤ کہ اگر ہم رسّے کی لمبائی اٹھارہ انچ زیادہ کر دیں تو تمھارے پیر کہاں ہوں گے؟"

"پھر..... پھر تو میں سیدھا فرش سے ٹکرا جاؤں گا۔"

"بالکل ٹھیک۔"

"لیکن یہ کام تو صرف جلّاد کر سکتا ہے اور....." نِک تسینڈی کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر چپ ہو گیا۔

"اب تم معاملے کی تہہ تک پہنچتے جا رہے ہو۔" تسینڈی نے کہا۔ "یہ جلّاد بڑا تجربہ کار ہے اور اپنے کام میں ماہر ہے۔ خوش قسمتی سے ہم اس کی ایمان داری خریدنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ وہ عنقریب ریٹائر ہونے والا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ وہ زندگی کے باقی دن یورپ کے کسی خوب صورت شہر میں ساحلی علاقے کے ایک آرام دہ فلیٹ میں گزارے۔ اس کی ملازمت نے اس خواہش کا گلا گھونٹ دیا تھا لیکن محض اٹھارہ انچ فاضل رسّی نے اس کا مستقبل سنوار دیا۔ بہرحال اس کا کام سستے میں نمٹ گیا۔ البتہ ڈاکٹر بہت ضدی تھا۔"

"کون؟ جیل کا ڈاکٹر؟"

"ہاں، اس سے ذرا زیادہ احتیاط سے بات کی گئی کیونکہ یہ لوگ کچھ زیادہ ہی بااصول بنتے ہیں۔ ہماری ٹیم نے بہت جلد اُس کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر لیں۔ چند سال قبل اسے ایک اسپتال سے مشکوک حالات میں برطرف کیا گیا تھا۔ یہ نکتہ ہمارے بڑے کام کا تھا چنانچہ بلیک میلنگ کی دھمکی اور کسی دوسرے شہر میں ایک الگ کلینک کھولنے کے لیے سرمائے کی پیش کش نے اس کے اصول بھی پامال کر دیے۔ بہرحال اب اِن دونوں انسانیت کے ہمدردوں کی وجہ سے تم جمعے کے دن پھانسی لگنے کے باوجود زندہ رہو گے۔ اب تم بقیہ تفصیل بھی سُن لو۔ جب تمھارے پیروں تلے کی کھڑکی کھُلے گی تو تم رسّے سے لٹک جاؤ گے بلکہ نیچے گر جاؤ گے۔ جب تمھارے پیر فرش سے ٹکرائیں گے تو تم غالباً داہنی جانب لڑھک گے۔ ممکن ہے تمھیں وقتی طور پر اپنا سانس اٹکتا ہوا محسوس ہو کیونکہ پھندا بہرحال گلے گا اور شاید رسّے کی وجہ سے کچھ جلن بھی محسوس ہو لیکن تم رسّے پر کم از کم اتنا زور ضرور دینا کہ اس میں کوئی خم نہ پڑے اور باہر بیٹھے ہوئے چشم دید گواہ تمھارے مرنے کی تصدیق کر دیں۔ اندر صرف ڈاکٹر آئے گا..... مزے کی بات یہ ہے کہ تمھاری زندہ لاش جیل سے باہر پہنچانے کی ذمے داری بھی اسی کے سپرد ہوگی اور اس کی مدد جلّاد کرے گا۔"

"مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا ہے۔"

تسینڈی نے اپنی بات جاری رکھی۔ "البتہ تھوڑی دیر کے لیے تمھیں مرنے یا سانس روکنے کی مشق کرنی پڑے گی تاکہ جب ڈاکٹر اور جلّاد تمھیں وہاں سے پہرے دار کی موجودگی میں باہر لے جائیں تو کسی کو شک نہ ہو۔ جیل سے باہر کچھ فاصلے پر ایک کار تمھاری منتظر ہوگی۔ جعلی پاسپورٹ اور نقد روپیہ تمھیں تیار ملے گا۔ تم سیدھے ہوائی اڈّے جاؤ گے اور فوراً سے بیشتر ملک سے باہر نکل جاؤ گے۔ میری نصیحت یاد رکھنا۔ دوبارہ کبھی کسی حال میں یہاں واپس آنے کی غلطی نہ کرنا۔ پولیس تو تمھاری تلاش میں ہوگی ہی لیکن تمھاری ماں نے بھی اپنے آدمیوں کو حکم دے دیا ہے کہ جہاں تمھاری شکل دکھائی دے تمھیں فوراً گولی مار دی جائے۔"

جمعے کی رات موسم کچھ خشک تھا۔ گیارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ جیلر، پادری اور پہرے دار نِک کے پاس پہنچے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ نوجوان فرار کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ "نِک! چلو! وقت ہو گیا ہے۔" جیلر نے کہا۔ "اگر تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو میں ڈاکٹر کو بُلوا لیتا ہوں تاکہ وہ تمھیں انجکشن وغیرہ دے دے۔"

"نہیں جناب!" نِک نے حقارت سے کہا۔ "میرا خیال ہے میں اس مبارک موقع کا ہمیشہ سے منتظر تھا۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے سوچا کمینے! اگر موقع ملا تو تجھے ضرور مزا چکھاؤں گا۔

رسمی کارروائیوں کے بعد نِک کو پھانسی کے پھندے کے عین نیچے کھڑا کر دیا گیا۔ لوگوں نے حیرت سے دیکھا تھا کہ وہ سینہ تانے ہنستا ہوا تختۂ دار تک پہنچا مگر اب وہ کوشش کے باوجود اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو نہیں پا رہا تھا۔ دائیں جانب تین چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں کی سنجیدگی اور اُداسی دیکھ کر ایک لمحے کے لیے نِک بھی کہیں کھو گیا لیکن فوراً تسینڈی کا پُراعتماد چہرہ اُس کے تصوّر میں اُبھرا اور اُس نے مسکرا کر جلّاد کی طرف دیکھا۔ جلّاد بھی مسکرا دیا مگر اس کی آنکھوں میں ایک مایوس سی چمک تھی۔ سرکاری ڈاکٹر کی آنکھوں میں بھی ہمدردی کے جذبات موجزن تھے۔ نِک کا اعتماد لوٹ آیا۔

جلّاد نے گھڑی دیکھی اور اُس کے سر پر سیاہ غلاف چڑھا دیا۔

دھک، دھک، دھک۔ نِک پہلے پہل سمجھ نہیں سکا کہ یہ آواز کس کی ہے؟ جیسے وحشی لوگ دور جنگل میں آگ کے گرد رقص کرنے میں مصروف ہوں اور اُسے اُن کے درمیان میں ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا ہو۔ پھر دوسرے ہی لمحے اُسے احساس ہوا کہ یہ اس کے دل کی دھڑکن ہے۔ اس کی آنکھوں کے

Pakistanipoint Waqar Azeem
وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

امنے اندھیرا تھا اور فضا میں ایک پُراسرار خاموشی تھی۔ جلاد کے ہلنے جلنے کی
سرسراہٹ، جیلر اور دوسرے لوگوں کے اِدھر اُدھر چلنے کی آہٹیں اور انسانی سرگوشیاں
ل کر عجیب سی محسوس ہو رہی تھیں۔ نک کو احساس تھا کہ یہ ڈراما سخت تکلیف دہ
ہوگا لیکن اسے یہ بھی احساس تھا کہ یہ عارضی تکلیف برداشت کر لینا ہمیشہ کے لیے
رہ جانے سے کہیں بہتر ہے۔ اُس کی ہمت بندھ گئی۔

جیلر نے جج کا فیصلہ پڑھ کر سنانا شروع کیا: ”نِک گیرڈ وانھیں
تل عمد کا مرتکب پایا گیا ہے......“ نِک کی سمجھ میں ایک لفظ بھی نہیں
رہا تھا۔ جب جلاد نے اس کی گردن کے گرد پھندا ڈالا تو اسے ہوش آیا۔
ل نے خوش گوار اطمینان کے ساتھ محسوس کیا کہ پھندا قدرے ڈھیلا ہے۔

”نک! میں ایک بار پھر تم سے پوچھتا ہوں کہ اگر تمھاری کوئی آخری
واہش ہو تو بتاؤ۔“

”میری کوئی خواہش نہیں ہے۔“ نک نے جواب دیا۔ ”بس مجھے
ھانسی دے دو!“

دھک دھک... اس کے دل کی دھڑکنیں بہت تیز
ہو گئی تھیں۔ نک اپنی گھبراہٹ پر خود ہی مسکرا دیا لیکن غلاف کی وجہ سے
س کی مسکراہٹ اُسی تک محدود رہی۔ اچانک ایک جھٹکے سے اس کے
یروں تلے کی کھڑکی کھلی... نک نے خود کو ایک لمحے کے لیے فضا میں معلق
ایا جیسے اس نے کسی اُونچی جگہ سے چھلانگ لگا دی ہو اور پھر دوسرے ہی لمحے
ہ اپنے قدم فرش پر ٹکنے کا انتظار کرنے لگا... رتا ختم ہو گیا اور اس کی
رہ اسے اپنی ٹھوڑی سے ٹکراتی محسوس ہوئی۔ اس کی گردن کو زبردست جھٹکا
گا... اس بالکل آخری لمحے میں اُس پر یہ خوفناک حقیقت آشکار ہوئی کہ
ینڈی نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ اُس نے چیخنے کی کوشش کی مگر موت
نے مہلت نہیں دی۔ اس کی گردن کسی خشک ٹہنی کی طرح چٹخ گئی۔

تقریباً دو منٹ بعد سرکاری ڈاکٹر نے اندر آ کر اس کی نبض ٹٹولی
اور اسٹیتھسکوپ سینے سے لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی۔ جب کچھ سنائی
نہیں دیا تو اس نے مجرم کی موت کا اعلان کر دیا۔ جلاد نے رسّا کاٹنے میں
ڈاکٹر کی مدد کی۔ پھر لاش محافظوں کی مدد سے سرکاری گاڑی میں ڈال دی گئی
جو سیدھی قبرستان جانے والی تھی!

دوسرے دن صبح ایک ملازم تھینڈی کو لے کر ڈرائنگ روم میں
داخل ہوا۔ کیتھرائن نے اس سے کہا: ”تم نے اپنا کام خوب انجام دیا ہے۔
کم از کم مرتے وقت میرے بیٹے نے ایسا کام کر دکھایا کہ مجھے اس پر ناز
ہونے لگا۔“

تھینڈی نے محسوس کیا کہ اس نے مسز گیرڈ کی توقع سے بڑھ کر
اچھا کام کیا ہے۔ اس کا قرض معاف ہو چکا تھا اور تمام ضروری اخراجات
کے بعد بھی اس کے پاس نو ہزار ڈالر بچ گئے تھے۔ اس نے اخبار اُٹھا کر
دیکھا۔ ایک سُرخی تھی: ”قاتل کو سزائے موت دے دی گئی۔“ تھینڈی خاموشی
سے خبر پڑھنے لگا۔ ”جو لوگ نک گیرڈ سے واقف تھے، ان کا کہنا ہے
کہ وہ زندگی بھر کسی بزدل اور ڈرپوک آدمی کی طرح زندہ رہا لیکن جس
وقت اسے پھانسی کے لیے لے جایا جا رہا تھا..... نہ جانے کہاں سے
اچانک اُس کے پاس بے مثال ہمت اور بہادری آ گئی تھی۔“

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام